وَهُدُوْٓا اِلَى الطَّيِّبِ مِنَ الْقَوْلِ ۚ وَهُدُوْٓا اِلٰى صِرَاطِ الْحَمِيْدِ (۲۴)

# قولِ طیّب

یعنی

ملفوظات مرشدی و مولائی حضرت الحاج سید صلاح الدین محمد الیاس صاحب صدیقی

ام۔ اے، ایل ایل بی (علیگ) چشتی قادری فاروقی رحمۃ اللہ علیہ حیدرآباد دکن

مؤلفہ


الحاج محمد عبد الحلیم الیاسی چشتی قادری نقشبندی

ام اے۔ ڈپ ایڈ (عثمانیہ) مسجد پیر پاشاہ۔ دبیر پورہ حیدرآباد۔ انڈیا



باہتمام مولوی سید محمد صاحب پرنسپل

مطبوعہ اعجاز پرنٹنگ پریس چھتہ بازار حیدرآباد دکن ۲

بار اول ایک ہزار

قیمت چار روپے علاوہ محصول ڈاک

# فہرستِ مضامین

## فصول ثلٰثۃ عشرۃ کاملۃ (۲/۸)

## فصل اوّل

### مقدّمہ

## فصل سوم
## توحیدِ افعالی۔ ربوبیت

# فصلِ دوم

## توحید و رسالت

## فصل چہارم

## تعبد - تعظیم شعائر اللہ - تکریم مقربین

## فصلِ پنجم

## قرآن۔ بیعت وارشاد۔ سلوکِ علمی۔ سلوکِ ذکری

عنوانات (۱تا ۱۶۔ ۱۷تا ۲۸ ۔ ۲۹ تا ۳۹)

# فصلِ ہشتم

## اصلاحِ معاشرت

# فصلِ ہفتم

## کشف وکرامات ۔ جنات وشیاطین

عنوانات ( ۱ تا ۱۸ ) ( ۱۹ تا ۳۲ )

# فصلِ نہم

## حضرت کی خصوصیات

# فصل نہم

## حضرت کے تعلقات

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط
وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ الْکَرِیْمِ ط

# فصلِ اوّل

## مقدمہ

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لیے

**(۱) حضرتؒ کا حلیہ** مرشدی و مولائی الحاج مولانا محمد الیاس برنی چشتی قادری نقشبندی فاروقی رحمۃ اللہ علیہ سے مجھے ۱۳۴۲ھ میں نیاز حاصل ہوا۔ میں اس زمانے میں میٹرک کامیاب کر کے نیا نیا عثمانیہ یونیورسٹی کالج میں شریک ہوا تھا۔ حضرت اس زمانے میں شعبۂ معاشیات کے صدر تھے۔ گو آپ کی ظاہری حیثیت علم معاشیات کے ماہر اور یونیورسٹی میں عمرانی علوم کے پروفیسر کی تھی۔ لیکن آپ کی دوسری حیثیت بھی تھی۔ شعبۂ معاشیات ہو یا کوئی دوسرا شعبہ۔ کیا طلبہ، کیا پروفیسر، سب پر آپ کا اخلاقی اثر تھا۔ میں نے ذکر سنا تو کشش محسوس ہوئی چہرۂ مبارک دیکھا تو قلب نے گواہی دی کہ یہ ایک صدیق کا چہرہ ہو سکتا ہے۔ قامت بلند و بالا۔ سڈول ورزشی جسم گورا نورانی رنگ۔ کتابی چہرہ۔ بال گھنے۔ آنکھوں میں ذہانت کی چمک دندانِ مبارک باریک اور پیوستہ۔ چہرہ پر متانت کے ساتھ بشاشت۔ چال ایسی کہ
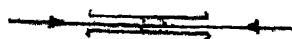
شعبۂ معاشیات کی تالیفات و تراجم کا اہم کام آپ کے سپرد ہوا۔ کئی کتابیں تالیف ہوئیں۔ دو سال بعد یونیورسٹی کالج میں آپ پروفیسر معاشیات بنائے گئے۔ اور پھر صدرِ شعبۂ معاشیات۔ اس کے بعد آپ ناظم دارالترجمہ مقرر ہوئے۔ اور پھر یونیورسٹی میں رجسٹرار ہو گئے۔ بعد میں ناظم دائرۃ المعارف اور اسپیشل افسر بنے۔

اس کل زمانے میں حضرت کی تصنیف و تالیف کا مشغلہ جاری رہا۔ حضرت نے مختلف فنون پر پچاس کتابیں اردو، فارسی، عربی، انگریزی زبانوں میں تصنیف فرمائیں۔ آپ نے شعبۂ اسلامیات میں ۱۴، شعبۂ قادیانیات میں [illegible]، شعبۂ ادبیات میں سولہ، شعبۂ معاشیات میں چھ، شعبۂ ذاتیات میں دو اور شعبۂ اردو و ہندی سنسکرت میں دو کتابیں تحریر فرمائی ہیں۔ [illegible]

**(۴) ظاہری کمالات**

اس علمی اور دینی ذوق کے ساتھ ساتھ حضرت کی طبیعت نہایت شگفتہ اور ظریفانہ تھی۔ لیکن ظرافت کا معیار بہت بلند۔ بذلہ سنجی کا یہ عالم کہ سننے والے کے دل کی کلی کھل جائے۔ دوسروں کی بذلہ سنجی سے بھی خوب لطف اندوز ہوتے تھے۔ بے اختیار ہنس پڑتے اور خوب دل کھول کر داد دیتے۔ آپ کی گفتگو اور تقریر کا خاص انداز تھا۔ جس سے پتہ چلتا کہ نفسیاتِ انسانی پر کیسی باریک اور گہری نظر ہے۔ بعض ممتاز یوروپین مثلاً ڈاکٹر سیاڈلر صدر یونیورسٹی کمیشن تک نے متاثر ہو کر آپ کی گفتگو کے نوٹس لیے۔ مثال دینے میں تو کمال حاصل تھا۔ آپ کی خوبیٔ تقریر کا یہ عالم کہ سامعین مسحور ہو جاتے اور محسوس کرتے (حاضر جوابی میں لاجواب تھے)

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

شاعری اور موسیقی سے بہت دلچسپی تھی۔ اور بڑی ناقدانہ نظر تھی۔ اشعار میں اچھے

معلوم ہوتا اوپر سے نیچے کو اتر رہے ہیں۔ غرض مردانہ حسن کا بہترین نمونہ تھے
مجھے تو عجب کشش محسوس ہوئی۔ کالج میں میرا پہلا سال تھا [illegible] حاصل ہو
تو اشتیاق اور بڑھ جاتا۔ بالآخر سال اول کے آخری زمانے میں بذریعہ
ڈاکٹر غلام دستگیر رشید کے ساتھ حضرت کے دولت خانے پر شرف باریابی حاصل
ہوا۔ اس کے بعد سے حاضری کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ طالب علمی کے زمانے
میں ابتداً ہفتہ میں ایک دو مرتبہ حاضری ہوتی اور کبھی کبھی [illegible]
بعد میں زیادہ آمد و رفت رہنے لگی۔ سرکاری ملازمت میں داخل ہونے کے بعد
بھی جب کبھی موقع ملتا حاضر ہوتا۔ بعض وقت مسلسل کئی کئی [illegible] رات
خدمت میں حضوری کا شرف حاصل رہتا۔

(۴) تصانیف تالیفات | یوں تو حضرت کو طالب علمی کے زمانے [illegible] تصنیف
[illegible] تالیف کا شوق [illegible]

اپنے حسن انتخاب سے اردو اشعار [illegible]
معارف نکات جذبات فطرت اور مناظر قدرت کی شکل میں [illegible]
اور ملک میں خوب مقبول ہوا۔ یہ اردو زبان کی گولڈن ٹریژری [illegible]
جب آپ علی گڑھ میں ایم۔ اے کے طالب علم تھے تو بی۔ اے [illegible] کو معاشیات
پڑھاتے تھے۔ اسی زمانے میں بابائے اردو مولوی عبد الحق مرحوم کی فرمائش
بلکہ تاکید پر علم المعیشت تصنیف فرمائی۔ جس کے متعلق ڈاکٹر اقبال جو خود بھی
عالم معاشیات تھے، فرماتے ہیں۔ "آپ کی علم المعیشت اردو زبان پر ایک
احسان عظیم ہے۔ لیکن [illegible] اردو میں یہ پہلی کتاب ہے اور ہر لحاظ سے مکمل
جب ۱۹۱۷ء میں عثمانیہ یونیورسٹی کے سلسلے میں دار الترجمہ کا قیام عمل میں
تو آپ کو علی گڑھ سے بطور خاص تار دے کر حیدرآباد گورنمنٹ نے بلایا۔

کا مقام، اور اس کا حال وقال۔ اور یہ سب فیضان نتیجہ تھا حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت سیدنا غوث الاعظم رضی اللہ عنہ سے شیفتگی و وابستگی اور عشق و محبت کا۔ جس کی مستی ہر لحظہ حضرت پر طاری رہتی تھی۔ فرماتے ہیں ؎

برتی اُن کا عـــلام کیا کہنا
کیسی مستی ہے دل ہی جانے ہے

**(۵) قادری تعلیم** سیف آباد حیدرآباد کا مشہور محلہ ہے۔ وہیں بیت السّلام حضرت کا آستانۂ معلّیٰ ہے۔ جہاں حال حال تک یہاں قرآن کریم کے حقایق و معارف شب و روز بیان ہوتے تھے۔ قادری فیضان کا دریا موجزن رہتا تھا۔ فرماتے۔ قادری سلوک تمام تر قرآن ہی قرآن ہے جس کا خلاصہ ایمان و اعتصام ہے۔ عبدیت اس کا مقام ہے کہ علم و عمل تصرّفِ نفسانی سے آزاد ہوکر رسالت سے وابستہ ہوجائیں۔ امرِ الٰہی کے تابع ہوجائیں کہ رسالت ہی میں امرِ الٰہی مندرج ہے۔ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ (۳/۱۳) مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ (۵/۸)

**(۶) قرآنِ ناطق کی شان** آپ پر قرآن کا انفتاح ایسا تھا کہ گویا کُلٌّ فِیْ کِتَابٍ مُّبِیْنٍ (۶/۷) کھلا ہوا ہے۔ قرب و احسان کے مسائل کے سوا معاشیات، سیاسیات، عمرانیات بلکہ روزمرّہ کی زندگی کے اکثر مسائل کو قرآنی علم کی روشنی میں ایسا واضح فرمادیتے کہ معلوم ہوتا کہ آپ قرآنِ ناطق کا ایک زندہ نمونہ اور قرآن مبین کی ایک خاص تجلی ہیں۔ گو آپ حافظ نہ تھے۔ لیکن تحریر و تقریر میں ہر محل کے مناسب و موزوں قرآنی آیتوں کا حوالہ اس کثرت و خوبی سے پیش فرماتے کہ گویا جزوِ کلام ہے۔

**(۷) اہلِ علم کے تین گروہ** اکثر فرماتے کہ حقیقت کی تلاش کے تعلق سے اہلِ علم

نکات بیان فرماتے کہ شعر کا لطف دوبالا ہو جاتا۔ طبیعت بے حد لطافت پسند اور کسی حد تک نازک تھی۔ مزاج میں سادگی کے ساتھ بے حد نفاست پسندی اور پاکیزگی تھی۔ عطریات کا خاص شوق تھا بہت اہتمام تھا۔ آپ حلم وضبط وحیا کی غیر معمولی مثال تھے۔ آپ کے ہر کام سے نظم وضبط نمایاں تھا۔ جسمانی ورزشوں کے شوق کا یہ عالم کہ بانک، بنوٹ، خنجر، تلوار، نشانہ بازی، کشتی، باکسنگ، پیراکی، اسپ سواری، موٹر رانی۔ ہر ایک میں استادانہ مہارت حاصل تھی۔ طالب علمی سے فٹ بال، ہاکی، کرکٹ وغیرہ مردانہ کھیلوں میں ہمیشہ پیش پیش رہے۔

یوں تو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے امارت کے لوازم، شاندار کوٹھی، موٹر، ملازمین وغیرہ سبھی عطا فرمائے تھے۔ لیکن اس امیری میں فقیری کی شان نظر آتی تھی۔ آپ کی اہلیہ محترمہ کا بھی یہی حال تھا کہ ان کو حضرت سیدہ زینبؓ کی توجہات حاصل تھیں۔ غرض سارے گھر پر یہ فضا چھائی ہوئی تھی۔ ذاتی کمال وفضیلت کے سوا خاندانی شرافت ووجاہت بھی اللہ کا فضل ہے۔ آپ کے خاندان کی شانِ فاروقی اور تاریخی، علمی، دینی، سیاسی خدمات غازی شہاب الدین غوری فاتح ہندوستان کے عہد ۵۸۶ھ سے تاریخ میں محفوظ ہیں، اور اب تک جاری ہیں۔

**(۴) باطنی کمالات** | یہ تو حضرت کا ظاہر تھا جس کا ایک ایک پہلو حسن وجمال سے آراستہ، فضل وکمال سے مرصع۔ کیسا جامعیت تھی جس میں نہ کوئی تصنع تھا نہ بناوٹ۔ سادگی اور پرکاری کا مرقع۔ لیکن اس ظاہر کے سوا آپ کا ایک باطن بھی تھا جو ظاہر بینوں سے مخفی تھا۔ وہ تھا حضرت کا ایمان واعتصام، اور قرب واحسان میں حضور

چنانچہ حضرت مجدد الف ثانیؒ ذکر اشغال کے متعلق فرماتے ہیں کہ ذکر کا تلقین کرنا بچوں کو الف بے پڑھانے کی طرح ہے (مکتوب ۲۶ ۔ دفتر دوم) احوال کے متعلق فرماتے ہیں کہ یہ احوال جو طالبوں پر ابتدا میں ظاہر ہوتے ہیں ایسے ہیں جیسے بچوں کو الف بے سکھاتے ہیں (مکتوب ۱۲ ۔ جلد سوم)

کشف و کرامات کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں کہ ۔ مثالی ظہور تمام ظہورات میں کمتر اور ضعیف ہے ۔ اس راہ کے طالب مثال میں اپنے آپ کو بڑے مقامات پر پاتے ہیں ۔ اگر یہ معنی عالمِ شہادت میں ظہور پیدا کریں تو بڑی دولت ہے ورنہ ظہورِ مثالی پر ہی اکتفا کریں تو لاحاصل ہے ۔ ہر جولاہا اور حجام خواب میں اپنے آپ کو بادشاہ دیکھتا ہے لیکن کچھ حاصل نہیں ۔ پس صرف خیال ہے ۔ مثال کی باتوں پر اعتبار نہ کرنا چاہیئے ۔ عالمِ شہادت میں جو کچھ حاصل ہو جائے اُسے حاصل سمجھنا چاہیئے ۔

چو غلام آفتابم ہمہ ز آفتاب گویم
نہ شبم نہ شب پرستم کہ حدیثِ خواب گویم

(مکتوب ۵۸ ۔ جلد دوم)

کرامات کی عدم ضرورت کی یوں تشریح فرماتے ہیں ۔

بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ بے کشف سالک زیادہ قُرب کے باعث جو اُسے حاصل ہوتا ہے ، کشف والے سے افضل و پیش قدم ہوتا ہے ۔ کرامات یقین کی تقویت کے لیے عطا ہوتے ہیں ۔ جب کسی کو یقین حاصل ہو چکا تو اُسے کرامات کی کیا حاجت ہے ۔ (مکتوب ۹۲ ۔ جلد دوم)

صوفیہ اور فلاسفہ کے علم و بیان میں بظاہر جو مشابہت معلوم ہوتی ہے اس سے اکثر لوگ ہمیشہ سے دھوکا کھاتے رہے ہیں ۔ صوفیہ کے قریباً

کے تین بڑے گروہ بن گئے۔ ایک وہ جو عقل و استدلال سے حقیقت کا پتہ چلانا چاہتے ہیں۔ یہ گروہ فلسفیوں کا ہے۔ دوسرے وہ جو روحانی مجاہدے ریاضتیں اور مشقتیں کر کے کشفِ روحانی کے ذریعے حقیقت تک رسائی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ یہ گروہ اشراقیوں اور جوگیوں کا ہے۔ تیسرے وہ جو نورِ عقل کے لئے نورِ حق (وحی) کو رہبر مانتے ہیں۔ اور حقیقت تک رسائی کے لیے رسالت کو واحد ذریعہ جانتے ہیں۔ یہ گروہ مومنین کا ہے۔ اس طرح ایک جماعت عقل کے تابع اور دوسری کا مکاشفاتِ روحانی پر مدار ہے۔ لیکن اسلام میں عقل کو نورِ وحی کے تابع کر کے کام میں لیا جاتا ہے۔

**(۸) حضرت محمدؐ کی تعلیم کی روشنی میں حضرت کے سلوک کی شان**

حضرت کا طریقہ تحقیقی اور یقینی تھا۔ تو قرب احسان کا علم بیان فرماتے اور بیان کے دریا بہا دیتے لیکن احوال کے اعتبار کا یہ عالم کہ اچھے اچھے حضرت کی ظاہری حالت سے دھوکا کھا جاتے اور کہتے کہ ان کے پاس قال ہی قال ہے، حال نہیں۔ علم ہی علم ہے، ذکر و اشغال نہیں۔ فلسفیوں کی سی ذہانت کی باتیں تو خوب کر لیتے ہیں، سلوک و کشف نہیں ہیں۔

آپ کی فہم قرآنی اور تعلیم ایمانی کا انداز بالکل عجیب فطری تھا۔ کہ علم دل میں اتر جائے۔ قال حال بن جائے چنانچہ فرماتے۔ یہ عالم ظہور ہے یہاں تجلیات پر نظر لازمی ہے۔ بلا تعینات و آثار ذات کی یافت کا خیال محض خیال کا چکر ہے۔ بہت سے لوگ توحید ذہنی اور تجرید خیالی کو ذات کی یافت کہتے ہیں جو محض دھوکا ہے۔ نفس، دل، روح کی تجرید کے کمالات مومن و کافر میں مشترک ہیں۔ مومن کی امتیازی خصوصیت ایمان و علم صحیح ہے جو رسالت کے ربط سے حاصل ہوتا ہے۔ یہی مسلک اکابرِ دین کا رہا ہے۔

لحاظ سے اچھے لوگ تھے۔ لیکن ان کے ساتھ رابطۂ ایمان و اطاعت ضروری نہیں سمجھتے۔

واضح رہے کہ رسول اللہ صلعم کی ذاتِ بابرکات محض ایک قصۂ ماضی نہیں۔ بلکہ ایک زندۂ جاوید حقیقت ہے، جس کے دو پہلو ہیں۔ ایک یہ کہ آپ رَحْمَةً لِّلْعَالَمِیْنَ ہیں۔ تمام کائنات کے لیے ہر وقت فیضانِ رحمانیت کا واسطہ ہیں۔ اور دوسرا پہلو یہ کہ آپ کی ذاتِ مبارک اللہ تعالیٰ کے اسمِ رحیم اور اسمِ ہادی کا مظہرِ اعظم ہے۔ پس حکمِ ربانی کے تحت ہمارا مقام و منزل محمد رسول اللہؐ ہونا چاہیے۔

اے مقام و منزلِ ہر راہ رَو
جذبِ تو اندر دلِ ہر راہ رَو

المختصر دین و ایمان نبوت سے ربط ہی کا نام ہے۔ یہی ربط اصلِ حیات ہے، جس میں محبت سے جان پڑتی ہے۔ حُبِّ نبویؐ کے بغیر، دین و ایمان سے ربط پیدا نہیں ہو سکتا اور نہ حقیقی توحید ملتی ہے۔ اسلام میں رسالت ناگزیر چیز ہے۔ ترقی کے لیے ہر آن اس کا ربط اور اس سے عقیدت و وابستگی لازم ہے۔ اسی پر تمام اولیاء اللہ اور اکابرِ دین کا اصرار ہے۔ سب کا محور و مرکز رسالت ہی رہا۔ سب کہہ گئے۔ لَوْلَاكَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاكَ۔ اور صحابۂ کرامؓ کی زندگی کا تو ایک ایک واقعہ اس کا شاہد ہے۔ رسالت سے کیسا ربط تھا۔ کیسی محبت تھی۔ کیسی شیفتگی تھی۔ کیسا عشق تھا۔ کیسی جاں نثاری تھی۔ سُبْحَانَ اللہ۔

**(۱۰) فسادِ قلبی کے دو باعث**

پس رسالت ہی حِزبُ اللہ کا حصنِ حصین اور ملجا و ماویٰ ہے جس پر شیطان کی ہمیشہ یورش

احسان کے علوم و معارف کو بس کر ان کو صرف زبانی باتوں یا فلسفیانہ استدلال سے تعبیر کرتے رہے ہیں۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ نے اِس التباس و اشتباہ کو یوں صاف فرمایا ہے۔

اِن دونوں گروہوں کے علم میں اثر کا شہود لازم ہے تاکہ اس سے موثر کا پتہ حاصل ہو سکے جو غیر مشہود ہے۔ لیکن دونوں میں فرق یہ ہے کہ صوفیہ (عارفین) کے علم الیقین میں وہ ارتباط جو اثر و موثر کے درمیان حاصل ہے، اور اثر کے وجود سے موثر کی طرف منتقل ہونے کا سبب ہے، مکشوف و مشہود ہے۔ اور اہلِ فلسفہ کے علم میں وہ ارتباط نظری اور ذہنی ہے، جو فکر و استدلال کا محتاج ہے۔ (مکتوب ۴۹۔ جلد سوم)

علمی سلوک کے متعلق حضرت مجددؒ نے تحریر فرمایا ہے کہ حضرت خواجہ نقشبند قدس سرہٗ فرمایا کرتے تھے کہ حضرت مولٰنا زین الدین تائبادیؒ کو وصول اِلی اللہ، علم کی راہ سے حاصل ہوا۔ (مکتوب ۱۲۔ جلد دوم)

اور ذکر کے حقیقی معنی کے متعلق حضرت مجددؒ فرماتے ہیں کہ ذکر سے مراد یہ ہے کہ غفلت دُور ہو جائے (یعنی علم حاضر رہے) خواہ کسی طرح ہو۔ نہ یہ کہ ذکر کو نفی و اثبات، یا اسمِ ذات کی تکرار پر منحصر سمجھا جائے جیسا کہ گمان کیا جاتا ہے۔ (مکتوب ۴۶۔ جلد دوم)

**(۹) رسالت سے زندہ ربط** حضرت اکثر فرماتے۔ اصل دین قرآن و رسالت سے زندہ ربط کا نام ہے۔ حقیقی توحید وہی ہے جو نبی کریم صلعم کی محبت و تعظیم کا ثمرہ ہو۔ زمانۂ حال میں توحید سارے عالم میں فلسفہ بن چکی ہے۔ نہ ماننے والے بھی اسے ماننے لگے ہیں۔ بلکہ رسالت کو بھی قبول کرنے پر تیار ہیں کہ واقعی انبیاء اخلاق وغیرہ کے

ذوالخویصرہ اور اُس کے ہم مشرب لوگوں کی مثال ہے۔ جو بظاہر بات تو ٹھیک کہتے ہیں لیکن اُن کا مقصود کچھ اور ہوتا ہے یعنی اہانتِ رسولؐ۔ یہ شخص نجد کے قبیلہ بنو تمیم سے تھا۔ بخاری اور مسلم میں اس شخص کے متعلق حدیث ہے کہ حضرت ابو سعید خدریؓ نے فرمایا۔ ایک وقت جب حضورؐ کچھ مال تقسیم فرما رہے تھے۔ اتنے میں ایک شخص آیا اور کہا۔ یارسول اللہ۔ عدل کیجئے۔ حضرت نے فرمایا۔ تیرا بُرا ہو۔ جب میں ہی عدل نہ کروں تو کون کرے گا۔ حضرت عمر فاروق اعظمؓ نے عرض کیا۔ اجازت ہو تو اس کی گردن اُڑا دوں۔ حضورؐ نے فرمایا۔ اسے چھوڑ دو۔ اس کے رُفقاء ایسے لوگ ہوں گے کہ ان کی نمازیں روزوں کے مقابل میں، تم لوگ اپنی نمازوں روزوں کو حقیر سمجھو گے۔ وہ قرآن پڑھیں گے لیکن اُن کے حلق سے نیچے نہیں اُترے گا۔ وہ دین سے ایسے نکل جائیں گے جیسے تیر شکار سے صاف گزر جاتا ہے۔

پس یہ فتنے ایسے ہیں کہ ان میں مبتلا ہونے والا شخص ایمان و اسلام بلکہ زہد و تقویٰ کا مدعی رہتا ہے اور اکثروں کو اس پر ایمان کا دھوکا ہوتا ہے۔ حالانکہ درحقیقت دامنِ رسالت ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے اور وہ شخص بازیچۂ شیطان بن کر رہ جاتا ہے۔ غرض یہ دونوں فتنے قدیم ہیں۔

**(۱۲) زمانہ حال کے چار بڑے فتنے**

اللہ اللہ زمانے کے شعبدوں نے مسلمانوں کو اسلام سے کس قدر غافل بلکہ بیگانہ بنا دیا۔ نوجوان کیسے کچھ حیران نظر آتے ہیں۔ خدا ہی جانے کیا کیا وسوسے اور خطرات دلوں کو بہکاتے اور ستاتے ہیں۔ گرچہ شکوک سے ایمان ڈگمگاتے ہیں۔ تاہم غنیمت ہے کہ عقیدۃً وادباً اسلام ہی کی خیر مناتے ہیں۔ زمانے نے پلٹا کھایا اور دُنیا رنگ بدلا چاہتی ہے۔ تن پروری سے دل اکتا چلے۔ مادّیات کی

رہتی ہے کہ اس سے لوگوں کو نکال کر باہر لائے۔ اور بندے کے اور رسالت کے ربط کو توڑ دے، یا کم سے کم مضمحل اور کمزور تو ضرور کر دے کہ صورۃً تعلق معلوم ہو، اور معناً تعلق ٹوٹ جائے۔

اس قسم کے فسادِ قلبی کا باعث بنیادی طور پر دو چیزیں ہوتی ہیں ایک تو یہ کہ کوئی شخص اپنے آپ کو بڑھا کر منصبِ رسالت کا شریک و سہیم اور دعوے دار بن جائے کہ گویا وہ خود حضورؐ کا مثل و مثیل ہے نبی ہے، رسول ہے۔ دوسری چیز یہ کہ آپ کی بشریت پر تو زور ہو، اس کا اقرار ہو، بلکہ اس پر اصرار ہو۔ لیکن اس بشریت میں آپ کی جو افضلیت پنہاں ہے، اس سے انکار ہو۔ جہاں کی وجہ سے حضورؐ کی بشریت کو اپنی بشریت پر قیاس کرے۔ اور حضورؐ کا مرتبہ گھٹا کر حضورؐ کو اپنا مثل یا مثیل سمجھے کہ وہ اپنی مادہ پرستانہ ذہنیت کی وجہ سے، خود کو بھی محض گوشت پوست کا مجموعہ سمجھتا ہے۔ اور حضورؐ کی عبدیت میں جو رفعت ہے اور انسانی مرتبت کا جو انتہائی علو ہے، اس سے اغماض و اعراض کرے

### (۱۱) عہدِ نبویؐ کے فتنے

اس زمانے میں ان فتنوں نے نہایت قوت اور تنظیم کے ساتھ سر اٹھایا ہے۔ لیکن ان کی ابتدا خود عہدِ نبویؐ سے ہو چکی تھی۔ اور متنبّی مسیلمہ کذاب نے آپ کی رسالت سے استناد لے کر نبوت کا دعویٰ کر دیا تھا۔ آپؐ کی وفات کے بعد مسیلمہ کذاب، اسودِ عنسی اور سجاح وغیرہ نے نبوت کا دعویٰ کیا۔ بہت سے لوگ اس فتنہ میں مبتلا ہو کر مرتد ہو گئے۔ ان کے خلاف حضرت صدیق اکبرؓ نے جہاد فرمایا

اسی طرح مقامِ نبوت کی شان و عظمت گھٹانے میں

حقایق و معارف کو اشراقیت و جوگیت کے مشاغلِ رُوحانی کے ساتھ مخلوط و مُلتبس کر دیا جا رہا ہے۔ اور رسالت کی تعلیم عبدیت کو چھوڑ کر، توحید کے نام سے ، تجرید رُوحانی اور کشف و کمالات کے چکر میں لوگ مبتلا ہو رہے ہیں۔

(۳) تیسرا فتنہ مُتنبّیوں کا ہے یعنی نبوت کے دعوے داروں کا ، یا اُن مُضلین کا ہے جنھوں نے بظاہر نبوت کا دعویٰ تو نہیں کیا۔ لیکن انھوں نے اپنے آپ کو اِسی رنگ میں پیش کیا۔

(۴) چوتھا بڑا فتنہ مُعترضین کا ہے جو دوست نما دشمنِ اسلام ہیں۔ اور خوشنما اصلاحی ناموں کی آڑ لے کر اپنا کام مُلک مُلک پھیلا رہے ہیں اور عقائد میں فساد ڈال رہے ہیں۔ یہ مارِ آستین ہیں۔

**(۱۳) رسالت پر زور اور حضرت کا جہاد**

حضرت فرمایا کرتے تھے۔ اِن سب فتنوں کا مَعرکہ رسالت ہی ہے۔ لہٰذا دورِ جدید کا سب سے بڑا تقاضا یہ ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر سب سے زیادہ زور دیا جائے۔ اسی کے اظہار اور اسی پر اصرار کی سخت ضرورت ہے۔ چنانچہ حضرت نے تمام عالم میں نسبتِ رسالت کو زندہ کرنے کی کوشش میں ، زندگی کا چین آرام ، تن ، من ، دھن سب قربان فرما دیا۔ اور رسالت کے مقام اور اُس کی عظمت و اہمیت کو واضح کرنے اور حُبِّ رسولؐ پھیلانے کے لیے پے در پے کتابیں لکھیں۔ اور ہزارہا کی تعداد میں سارے عالم میں اپنی طرف سے مفت تقسیم فرمائیں۔ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنْهُ۔

آپ نے استیصالِ قادیانیت اور ردِّ قادیانیت کے سلسلے میں جو زرّین خدمات انجام دیں ، وہ تاریخِ اسلام کا مایہ ناز یادگار کارنامہ سمجھا جائے گا۔

قید سے پھر خلاص چاہتے ہیں۔ دبی زبان سے رُوحانیات کے چرچے سُننے میں آتے ہیں۔ باطنی کرشمے اچھے اچھوں کے دل لُبھاتے ہیں۔ حالانکہ کاملین (اولیاء اللہ) ان کو بھی محض لہو و لعب بتاتے ہیں۔ حقیقت تو کہیں ارفع و اعلیٰ ہے۔ اگر اس کی طلب ہو تو اسلام کا بول بالا ہے۔ قرآن کے بعد حیرانی کیسے۔

غرض یہ کہ زمانۂ حال کے چار بڑے فتنے ہیں۔ (۱) فتنۂ مادّیین (۲) فتنۂ اشراقیین (۳) فتنۂ متبنّیین (۴) فتنۂ مُعرضین۔

(۱) پہلا فتنہ مادّیت کا ہے کہ جب یورپ میں مادیت کا زور بڑھا، رُوحانیت گھٹی اور عقلیت کا اثر پھیلا، تو عالمِ اسلام میں بھی بہت سے ذہن اس سے مسموم ہو گئے۔ اور اس غلط فہمی کا شکار ہو گئے کہ سائنس اور علومِ طبعی کی ترقیوں کا مادّہ پرستانہ فلسفے سے گویا لازمی تعلق ہے۔ اور یہ کہ اب مذہب کو عقلیت و مادّیت کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑیں گے۔ یہ استدلال ایسا ہی مضحکہ خیز ہے جیسے غروبِ آفتاب کے وقت ابر آتا اور پانی برستا دیکھ کر کوئی کہے کہ غروبِ آفتاب کی وجہ سے ابر آیا اور پانی برسا تو وہم پرستی کی حد ہے۔ اس توہم پرستی کا نتیجہ بہرحال یہ ہوا کہ یورپ کے عقلیت پسند اور مادّہ پرست فلسفیوں کی عظمت لوگوں کے دلوں میں گھر کرنے لگی اور رسالت سے اُن کا ربط کمزور پڑ گیا۔ ستم ظریفی یہ کہ مذہبی ذہنیت رکھنے والے بعض علماء تک، اللہ تعالیٰ کی حاکمیت، مالکیت، امانت و خلافت کی ایسی تعبیریں کرنے لگے، جو بظاہر قرآن سے مستند معلوم ہوں۔ لیکن باطن و معنی کے لحاظ سے وہ تعبیریں فلسفۂ مادّیت سے اثر پذیر ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مادّی تصوّرات بھی کیا کیا روپ اختیار کر سکتے ہیں۔

(۲) دوسرا فتنہ اشراقیت کا ہے۔ وہ یہ کہ قرآنِ مجید کی تعلیم قرب و احسان

سعادت حاصل رہی ہے۔ یہ سب حضرت سیدنا غوث اعظمؓ کی ذرّہ نوازیوں کا صدقہ ہے۔ هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّيْ (سورہ نمل ۴۰) بندہ نوازی کی حد ہوگئی۔ اے خدا قربانِ احسانت شوم۔ لیکن ایاز قدر خود بشناس آقا آقا ہے اور خادم خادم۔ اور خادم بھی ادنیٰ خادم۔ اظہارِ نعمت مقصود ہے کہ واجب ہے۔ اور شکر کی مقبول صورت ہے۔ اللہ تعالیٰ اخلاص نصیب کرے اور خود ستائی سے محفوظ رکھے (آمین)

## (۱۵) ملت کی امانت ملفوظات کا خیال

۱۳۴۴ھ میں حضرت سے پہلی دفعہ شرفِ نیاز حاصل ہوا۔ حضرت کا وصال دوشنبہ ۱۶ رجب ۱۳۷۸ھ مطابق ۲۶ جنوری ۱۹۵۹ء کو ہوا۔ تقریباً چونتیس سال تک حضرت کے قدموں پر اس ناچیز کو سرفرازی نصیب رہی۔ حضرت کی ہر بات میں قرآنی معارف کے جواہر ریزوں کی ارزانی ہوتی تھی۔ ۱۳۶۴ھ تک حضرت کے ارشادات قلمبند کرنے کی صورت پیدا نہ ہو سکی۔ لیکن قلب کا مسلسل تقاضا رہا کہ اگر یہ ارشادات ضبطِ تحریر میں آجائیں تو ان کا فیض ملت کے لیے خاص سے عام اور نسلاً بعد نسلٍ متعدی ہو سکتا ہے۔ اور جن حضرات کو حضرت سے فیضِ صحبت حاصل کرنے کا موقع نہ مل سکا وہ شنید سے دید کا لطف حاصل کر سکیں گے۔

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد
بسا کیں دولت از گفتار خیزد

۱۳۶۴ھ میں ایک رات حضرت سے اپنے اس قلبی تقاضے کا اظہار کیا۔ اور اس ناچیز کو اجازت مل گئی۔ لیکن دقّت یہ کہ حاضری توجہ چاہتی تھی۔ اس لیے ارشادات کو ساتھ ساتھ بروقت ضبطِ تحریر

آپ کی مشہور تالیف 'قادیانی مذہب' قادیانیت کی قاموس تسلیم کی جاتی ہے۔ علاوہ ازیں انگریزی میں کتاب 'اسلام' اور عربی میں درود شریف کی کتاب 'مشکوٰۃ الصلوات' اور 'حزب اللہ' اور اردو میں 'صراط الحمید'، 'سراج حق'، 'تحفۂ محمدیہ' وغیرہ تالیف فرمائیں جو تعمیری خدمات اسلام کے لحاظ سے نمایاں امتیازی آثار رکھتی ہیں۔ آپ کی ذات نسبت رسالت کے لیے سپر اور دشمنانِ عظمتِ رسالت کے لیے شمشیرِ بے نیام تھی چنانچہ سیلاح الدین کے لقب سے آپ کی سرفرازی ہوئی۔ ما شاء اللہ۔

(۱۴) اخوت کی سرفرازیاں | یوں تو یہ ناچیز اس در کا ادنیٰ غلام ہے جو خود بڑی سرفرازی ہے۔ لیکن کالج کی

طالب علمی ہی کے زمانے میں رویا میں بشارت ہوئی کہ اس ناچیز کو حضرت سے اخوت کی نسبت بطفیل نبی کریم صلعم حاصل ہے۔ اس بناء پر ناچیز نے حضرت کو بھائی جان کہنا شروع کیا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد حضرت پیر سید یوسف گیلانی بغدادی مدظلہ العالی پہلی دفعہ ۱۳۵۱ھ میں بغداد سے حیدرآباد تشریف لائے اور حضرت کے دولت خانہ پر چند مہینے قیام فرمایا۔ پیر صاحب ممدوح خاندانِ عالیہ قادریہ بغداد کے خاص چشم و چراغ ہیں۔ بے حد اولوالعزم ہیں۔ حضرت بھائی جان قبلہ سے حضرت پیر صاحب کی ایسی موانست و مجانست بڑھی کہ بھائی جان قبلہ کو پیر صاحب بڑے بھائی فرماتے۔ شب عرفہ ذی الحجہ ۱۳۵۱ھ کو پیر صاحب نے ایک غیر معمولی نورانی قرآنی خواب دیکھا اور اس ناچیز پر یہ سرفرازی ہوئی کہ مجھے چھوٹا بھائی فرمایا۔ اور فرمایا کہ مجھے 'بھائی' کہا کرو۔ اس ارشاد کی بنا پر اس ناچیز کو حضرت پیر صاحب کو بھی 'بھائی جان' کہنے کی

جمع کرنے کی کوشش کی گئی ہے جن میں حضرت کی قرآنی تعلیم کی امتیازی شان نمایاں ہے۔ یہ بھی مُشتے نمونہ از خروارے ہے۔ ورنہ تفصیلی تحریروں کا حال یہ ہے کہ نہ صرف ہر فصل پر بلکہ بعض بہت سے عنوانات پر ایک ایک کتاب مُرتّب کی جاسکتی ہے۔

**(۱۷) ضروری عرض** | ملفوظات کے سلسلے میں عرض یہ ہے کہ جو کچھ آنکھوں سے دیکھا، کانوں سے سُنا، یا ان سے سمجھا، بقدر گنجائش دیانت سے قلمبند کر دیا تاہم غلطی سے مُبرّا ہونے کا کون دعویٰ کر سکتا ہے۔ البتہ حُسنِ نیت تک اہتمام ممکن اور لازم ہے۔ بہرحال استغفار واجب ہے۔ تاہم کوشش کی گئی ہے کہ حتی الامکان اس میں وہی علم، وہی الفاظ رہیں جو بیان میں آئے۔ جہاں الفاظ تمام کے تمام مستحضر نہ رہے اپنے الفاظ میں حضرت کے مفہوم کو ادا کیا گیا ہے۔ گویا شرابِ طہور کو جامِ زمرّدین کی جگہ جامِ سفالین میں پیش کیا گیا ہے۔ بہرحال بیان میں اصل و نقل کا فرق نمایاں ہے۔ اور ضرورتاً حضرت کی بعض تحریریں بجنسہٖ جہاں ملفوظات کے ساتھ شریک کی گئی ہیں اُن سے مقابلہ کیا جائے تو یہ فرق واضح طور پر نمایاں ہو جاتا ہے۔

اس کتاب میں کثرت سے لطیف نکات اور نازک اعلیٰ مقامات کی تشریح و توضیح آگئی ہے۔ اس پر جتنا زیادہ غور کیا جائے انشاء اللہ الفتاح بڑھے گا اور فیضانِ کثیر حاصل ہوگا۔ جہاں کہیں قرآنی آیات آگئی ہیں، آیات کے ساتھ پارہ رکوع لکھ دیا گیا ہے تاکہ تحقیق میں سہولت ہو۔

**(۱۸) برادرم عبدالخالق خان صاحب** | اپنی مصروفیات کے باوجود مسودہ جب پانچ ماہ میں بفضلہ مکمل ہوگیا تو محسوس ہوا کہ اس اہم نازک کام میں شَاوِرْهُمْ فِی الْاَمْرِ کی تعمیل میں ایسے

میں لانا ممکن نہ تھا اور نہ اس کی اجازت تھی۔ اس لیے کبھی دوسرے تیسرے دن، بعض دفعہ ایک ایک ہفتہ بعد، اور بعض دفعہ دو دو تین تین ماہ بعد حافظہ کی مدد سے نوٹ مرتب کر لیتا۔ اس کا سلسلہ اخیر زمانے تک جاری رہا۔

**(۱۶) ترتیب و تہذیب** ۱۳۷۹ھ میں جب اس ناچیز نے بفضلہٖ حج کا عزم کیا تو حج کے متعلق ہدایات کے لیے ان تحریروں کی بھی ورق گردانی کی۔ اس وقت اندازہ ہوا کہ حضرت کے ارشادات کا کتنا قیمتی خزینہ جمع ہو گیا ہے چنانچہ ارادہ ہوا کہ حج سے واپسی کے بعد، اس کی ترتیب و تہذیب کا کام انجام دیا جائے۔ واپسی کے بعد مصروفیات کا وہ سلسلہ رہا کہ ایک سال تک اس طرف توجہ کی نوبت نہ آئی۔ گو دل اس میں لگا رہا۔ بالآخر ذی الحجہ ۱۳۸۰ھ مئی ۱۹۶۱ء میں بسم اللہ کہہ کر اس کام کو شروع کیا۔

ملفوظات کی قسم کی تالیف کی دقتوں کا وہی اصحاب اندازہ کر سکتے ہیں جنھوں نے کبھی ایسا کام انجام دیا ہو۔ پندرہ سال کے ارشادات کے ہزاروں نوشتوں میں سے جو مختلف تواریخ و اوقات میں لکھے گئے تھے اقتباسات نقل کر کے، مختلف فصلیں قائم کرنا، اور مکررات کو چھانٹنا، اور تقریباً چار سو عنوانات کے تحت مناسبت معنوی کے لحاظ سے مربوط طریقے پر انھیں درج کرنا، ایک مشکل کام تھا، اس کتاب کا کوئی ایک موضوع نہیں۔ بلکہ مختلف موضوعات پر چھوٹے بڑے مختلف بیانات کو موزوں عنوانات کے تحت اس کتاب میں درج کیا گیا ہے۔ اس میں خاص طور پر عملی تعلیم کے وہ اعتبارات

اولیاء اللہ سے عقیدت و محبت کا ولولہ رکھتے ہیں، اور حضرت کی صحبت سے فیض یاب نہ ہو سکے، اُن کے لیے یہ ملفوظات نہ صرف ایمان افروز ہوں گے بلکہ حضوری کا فائدہ بخشیں گے۔ بفضلہ اس میں حیاتِ انسانی کے مختلف پہلوؤں کے متعلق ہدایات پیش ہیں جو ہر طبقۂ خیال کے لیے علماً و عملاً مفید ثابت ہوں گی۔ انشاء اللہ۔

**(۲۰) قرآنی سند** حضرت کے ملفوظات بفضلہ ترتیب پاکر تیار ہو گئے۔ اور قرآنِ کریم سے سند چاہی تو یہ ارشاد ملا۔

وَهُدُوْٓا اِلَى الطَّيِّبِ مِنَ الْقَوْلِ ۚ وَهُدُوْٓا اِلٰى صِرَاطِ الْحَمِيْدِ (۱۰/۱۷)

سُبحان اللہ، قولِ طیّب، بڑا انعام ہے۔ اور صراطُ الحمید کا عالی مقام ہے۔ سچ پوچھئے تو صراط الحمید (صراط المستقیم) کے سفر میں "قولِ طیب" ہی زادِ راہ ہے۔ اللہ تعالیٰ سب کو اس کے برکات نصیب کرے۔ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ۔ بحق نبیِ کریم۔ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ۔ وَمَا تَوْفِيْقُنَآ اِلَّا بِاللّٰهِ۔ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ۔

احقر العباد

خادم محمد عبد الحلیم الیاسی

محرم الحرام ۱۳۸۲ھ

مسجد پیر پاشا

۱۳۹۔ بیرون دروازہ دبیر پورہ

حیدر آباد۔ ۲۴۔ انڈیا

دوستوں سے مشورہ کیا جائے جو نہ صرف حضرت کے صحبت یافتہ ہوں۔ بلکہ حضرت کے قرآنی نقطۂ نظر کی صحیح یافت بھی رکھتے ہوں۔ چنانچہ اس ناچیز نے برادر مکرم مولوی عبدالخالق خاں صاحب سے اس کی خواہش کی۔ صاحب موصوف تقریباً بتیس سال حضرت کے فیضِ صحبت سے سرفراز رہے۔ نہ صرف یہی بلکہ بعض علمی کاموں میں ایک حد تک حضرت کے ساتھ شرکت کی آپ کو سعادت حاصل رہی۔ آپ کی باریک نظر اور ذہانت و ذکاوت کی حضرت قبلہ تعریف فرماتے تھے۔ چنانچہ آپ نے اکتوبر ۱۹۶۱ء تا ختم مئی ۱۹۹۲ء اس کی موسمی تعطیلات میں اپنا قیمتی وقت دیا اور وقفہ وقفہ سے بلحاظ فرصت ملفوظات کی تفصیلی نظرِ ثانی میں میرا ساتھ دیا۔ آپ کی توجہ، دقتِ نظر اور مخلصانہ قیمتی مشوروں کا شکریہ واجب ہے۔ جَزَاہُ اللّٰہُ اَحْسَنَ الْجَزَاء۔ اس مکمل نظرِ ثانی کے بعد برادرم ڈاکٹر غلام دستگیر رشید نے بھی ایک ہفتہ تک پہلی آٹھ فصلیں دیکھیں اور ضروری مشورے دیئے۔ بعض اور احباب نے بھی ہمت افزائی فرمائی اور مخلصانہ دعائیں دیں اور بعض نے کتابت و طباعت کے مراحل میں مدد فرمائی جس کے لیے مؤلف ان سب کا تہ دل سے شکرگزار ہے۔ برادرم احمد حسین خاں صاحب لکچرار عربی نے پریس کی کاپی کی تصحیح میں خاص حصہ لیا۔ دورانِ کتابت میں برادرم عبدالسلیم لکچرار اُردو کو اکثر مقامات سنانے کی مسرت حاصل کرتا اور زبان کی حد تک کبھی مشورے رہتے۔ دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سب کو دارین میں صحیح معنی میں جزائے خیر عطا فرمائے (آمین)

**(۱۹) فرمائشِ احباب** دوست احباب کی ہر چہار طرف سے فرمائش تھی، تاکید تھی کہ ملفوظات جلد لکھیے، شائع کیجئے۔ خدا کا شکر ہے اُن کی خوشی پوری ہوگئی۔ جو لوگ حیاتِ ایمانی کے قائل ہیں۔ دل میں

اس موقع پر نسبت کا ظہور ہوا۔ مگر اپنی غفلت و کوتاہی سے 'ھُوَ الظَّاھِرُ' کو نظر انداز کر کے 'ھُوَ الْبَاطِنُ' سے غیر معمولی مطالبہ کرنا درست نہیں ہے۔ 'الرَّحمٰن' کی عمومی حکومت بھی 'الرَّحیم' کی خصوصی حکومت کی طرح واجب الاطاعت ہے۔ دونوں کی اطاعت عبدیت میں لازم ہے۔ مجذوبیت کی دوسری بات ہے۔ مگر وہ بھی ایک خامی ہے تکمیل طلب ہے۔ اللہ تعالیٰ حسبِ حیثیت عبدیت میں کمال عطا فرمائے۔ بطفیل عبدہٗ و رسولہٗ صلی اللہ علیہ وسلم۔ توفیقِ استقامت کا جس قدر شکر ادا ہو کم ہے۔ اور کیا فضل ہے کہ بچے بھی اس سرفرازی میں شریک رہے۔ فالحمد للہ۔

مکرر آنکہ شکر میں فخر کی آمیزش نہ ہونے پائے۔ پوری احتیاط رہے۔ یہ غفلت بہت نازک مگر بہت خطرناک ہے . . . . . . اللہ کے فضل سے اسمِ غفورؔ نے کئی بار بچا لیا . . . . . . متانت کی ضرورت ہے۔ اور شکر و استغفار اپنا مقام ہے۔ اللہ تعالیٰ قائم رکھے۔ فالحمد للہ فقط

والدعا

الیاس برنی

# (۲) اسلام کی امتیازی خصوصیات

(خلاصۂ تقریر جلسۂ میلاد النبی منعقدہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد۔ انڈیا۔ جمعرات ۲۰ ربیع الاول ۱۳۶۶ھ)

فرمایا۔ میں نے مذاہب کا تقابلی مطالعہ کیا ہے۔ اسی نقطۂ نظر سے میں آپ حضرات کو دینِ اسلام کے مطالعے کا مشورہ دوں گا۔ اس مجلس میں تفصیلات پیش کرنے کا موقع نہیں۔ اس لیے میں بنیادی اصولِ اسلام کو

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
صَلِّ وَسَلِّمْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ

# فصلِ دوم

# توحید و رسالت

## (۱) مؤلف کے نام حضرت کے آخری مکتوب کا اقتباس

بیت السّلام۔ سیف آباد۔ حیدرآباد
۱۴ ستمبر ۱۹۵۸ء

حلیم میاں سلّمکم اللہ تعالیٰ

تمہارے پچھلے خط کا جواب روانہ کر چکا ہوں۔ وصول ہوا ہوگا۔ آج تمہارا دوسرا خط مورخہ ۱۲ ستمبر پہنچا کہ تمہارا تبادلہ ہوگیا۔ اطمینان ہوا۔ خدا کا شکر ادا کیا۔ رَبِّ اَنْزِلْنِیْ مُنْزَلًا مُّبٰرَکًا وَّاَنْتَ خَیْرُ الْمُنْزِلِیْنَ (۱۸ پ) اللہ تعالیٰ نئی جگہ مبارک کرے۔ اور ماحول کو موافق رکھے۔ تم بھی تجربہ سے کام لو۔ اسماء کے ظاہری ملحوظات کا بھی خیال رکھو۔ انہیں نظر انداز نہ کرو کہ وہ بھی کچھ حقیقت رکھتے ہیں۔ البتہ دین و ایمان کے معیار پر حق و باطل کا امتیاز نہ پیّت کے محل پر واجب ہے۔ مقدم ہے۔ جہاں یہ محل متحقق اور واضح نہ ہو۔ بلکہ نفسانیت یا غفلت کی آمیزش کا احتمال ہو وہاں برکت اور نصرت کی گنجائش بھی نسبتاً کمتر رہے گی۔ یوں بعد کو توبہ و استغفار سے تلافی ہو کر گنجائش بڑھ جائے تو دوسری بات ہے۔ جیسا کہ

اور جو کم و بیش تمام دُنیا میں رائج ہے۔ اکثر ممالک میں بولی جاتی ہے۔ اور جس کے اخبار و رسائل ہیں۔ اس کے برخلاف دیگر مذہبی کتابیں انتہائی قدیم زبانوں میں پائی جاتی ہیں جن کا اب چلن نہیں یا وہ تقریباً مفقود ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان میں سے بعض کو کھینچ تان کر ترجموں میں محفوظ کر دیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن ہی وہ اصلی بنیادی کتاب ہے جس کا اصلی متن دُنیا میں سب سے زیادہ پڑھا جاتا ہے (دیکھو انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا طبع نہم و یازدہم) جبکہ دیگر مذاہب کی کتابوں کو اپنی تحدیدات کی بنا پر یہ بات نصیب نہیں۔ حتیٰ کہ اسی کتاب کی یہ امتیازی خصوصیت ہے کہ دُنیا میں لاکھوں اشخاص پورے قرآن کے حافظ ہیں۔

**(۳) مقابلے کا بہترین طریق** مذاہب کے باہمی تقابل اور جانچ کا بہترین طریق یہ ہو سکتا ہے کہ آپ سب مل کر اب بھی ہر مذہبی کتاب کی سطر سطر، لفظ لفظ، حرف حرف پڑھ کر اہم مذہبی ٹیکنیکل (فنی) مسائل کی علیحدہ علیحدہ فہرستِ اصطلاحات تیار کریں اور فرہنگ زبانوں (مجموعۂ محاورات) بنائیں۔ اور دیکھیں کہ ہر مذہب کیا کیا تصورات پیش کرتا ہے جس طرح کیمیا، طبیعیات، معاشیات کے ٹکنیکل مسائل کی فہرستیں بنائی جاتی ہیں۔ اُسی طرح ان کی بھی فہرست بنائی جائے۔ مثلاً معاشیات کا ماضی اور حال میں مقابلہ کیا جائے تو اگر بینک کا لفظ کسی قوم کی تاریخ میں نہ ملے تو فوراً اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس قوم میں بینک کا علم و رواج نہ تھا۔ اسی طرح ہر مذہبی کتاب کی فہرستِ اصطلاحات تیار کی جائے تو معلوم ہوگا کہ مذہبِ اسلام قرآن کے ذریعے ہماری زندگی کے متعلق ایک کامل نظام پیش کرتا ہے جو انتہائی جامع، مربوط و منظم ہے۔ انسانی زندگی

پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔

## (۱) قرآن کے امتیازی خصوصیات
## قرآن۔ اصلی متن

اس وقت اسلام، عیسائیت، یہودیت، ہندو دھرم، بدھ مت، زرتشتیت اور کنفیوشزم دُنیا کے بڑے مذاہب سمجھے جاتے ہیں۔ جن کی بُنیادی کتابیں ہیں۔ جو اپنے مذہب کے نظام تعلیم کے لیے اصلی سند سمجھی جاتی ہیں۔ ان سب کتابوں میں قرآن ہی وہ واحد آسمانی کتاب ہے جس کا قطعی، قوی دعویٰ ہے کہ اس کا اصلی متن مکمل کلام الہٰی ہے۔ جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بذریعہ وحی نازل ہوا۔ اور یہ امر اہلِ تحقیق کے نزدیک بھی مُسلّم ہے کہ قرآن ہی دُنیا میں وہ کتاب ہے جس کا اصلی متن تواتر کے ساتھ محفوظ و محقق ہے۔ دوسری کتابیں یا تو ایسا دعویٰ نہیں کرتیں۔ یا کم و بیش اپنے کلام الہٰی ہونے کی تعبیر تاویل کرتی ہیں۔ یا اگر وہ ابتدا میں کلام الہٰی رہی بھی ہوں تو سمجھا جاتا ہے کہ امتدادِ زمانہ کی وجہ سے ان کے اصلی متن میں متعدد تغیرات واقع ہو گئے ہیں۔ یا بعض حالات میں ان کی اصلی شکل غائب ہو گئی۔ اور اُس کی جگہ ان کے پیروؤں کے اقوال و تحریرات نے لے لی۔ اس لیے منشائے ربانی یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کے بعد کسی اور کتاب آسمانی کی تعلیم کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ اور اب یہ حقیقت ناقابلِ انکار بن گئی ہے۔ کہ قرآن کی توحید کی تعلیم دوسرے اہل مذاہب پر قوت سے اثر انداز ہو رہی ہے۔

## (۲) عربی زندہ زبان

متن کے بعد دوسری اہم چیز زبان کا مسئلہ ہے کہ قرآن اپنی اصلی مکمل حالت میں ایک زندہ ترقی پذیر زبان عربی میں پایا جاتا ہے۔ جس میں تہذیب و ادب کے خزانے ہیں۔

آپ کو مسیحائی کے معجزات عطا ہوئے۔ گویا مثلیت میں فوقیت عطا ہوئی۔ اس طرح مقام و وقت کی حد تک اُن کے کام ختم ہو گئے۔ لیکن اب دُنیا کے حالات بدلنے والے تھے۔ اور سائنس کی ایجادات ریڈیو، ٹیلیفون وغیرہ کے ذریعے تمام دُنیا ایک شہر، ایک محلّہ بلکہ ایک گھر بننے والی تھی۔ اس لیے سارے عالم کو ایک ہی پیام کی ضرورت دائمی ہوئی۔ چنانچہ رسول اللہ صلعم کو رَحْمَةً لِّلْعَالَمِيْنَ (۲۱/۱۰۷) اور کَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا (۳۴/۲۸)۔ سارے عالموں اور ساری انسانیت کے لیے رحمت اور بشیر و نذیر بنا کر قرآن کا پیام دے کر بھیجا گیا۔ اور آپ جلال و جمال کا مظہر بن کر تشریف لائے۔ جس طرح ہر چیز ترقی کرتے کرتے کمال کو پہنچتی ہے، اسی طرح پیام کُتبِ سماوی ترقی کرتے کرتے قرآن بن گئے اور نبی ترقی کرتے کرتے حضور خاتم النبیینؐ تشریف لائے۔ لہٰذا اسلام ہی دُنیا کے لیے جدید ترین مذہب ہے۔

## (۶) سیرتِ نبویؐ کی بے نظیر تاریخی تفصیلات

رسول اللہ صلعم کی امتیازی خصوصیات پر غور فرمائیں تو معلوم ہوگا کہ آپ کی زندگی کی ہر حرکت و سکنت کو اس دُنیا میں اپنے اور پرائے دونوں نے تحقیقات سے محفوظ کر دیا ہے۔ مسلمانوں نے حضورؐ کے تفصیلی حالات کو روایت و درایت کے تحت، اتنی صحت و خوبی و اہتمام سے تاریخ کے معیار پر محفوظ کر دیا کہ اس کا جواب ملنا دشوار ہے۔ یہاں تک کہ آپ کے تقریباً ایک لاکھ روایت کرنے والوں کے متعلق رجال کا فن، بنا۔ جس نے ان کی عقل، دیانت، صداقت، امانت و زندگی کی اتنی زیادہ تفصیلات محفوظ کر دی ہیں تو خود اپنے آقا رسول اللہ

کے متعلق قرآن کے تصوّرات انتہائی وسعت، رفعت، کثرت و وضاحت رکھتے ہیں۔ یعنی اس کے تصوّرات بے حد وسیع، بہت بلند و پاک، بہت کثیر اور انتہائی واضح روشن ہیں۔ اور مجھے یہ سب چیزیں اکٹھی جیسے دینِ اسلام میں ملی ہیں، کہیں نہیں پا سکا۔

**(۴) دینِ کامل** اسلام ایک ایسا مذہب ہے جس نے سابقہ سب پیغمبروں اور اُن کی کتابوں کی تصدیق کو جزوِ ایمان بنایا۔ اسلام کے نزدیک مذاہب میں تفریق نہیں اور نہ رسولوں میں تفریق ہے۔ آیت: لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ (۲/۲۸۵) اس پر دال ہے۔ بلکہ قرآن کہتا ہے۔ سب مذاہب حق ہیں۔ ایک ہی پیام لائے ہیں۔ البتہ کسی میں تھوڑے پھول ہیں تو دوسرے میں زیادہ۔ قانونِ قدرت کے تحت، ہر چیز کو ترقی کرتے کرتے کامل ہونا ضروری ہے۔ لہٰذا مذاہب نے ترقی کر کے عروج کی آخری کامل شکل یعنی اسلام میں ظہور کیا۔ گویا ستارے مل کر آفتاب بن گئے۔ چنانچہ ارشادِ باری ہے:۔ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (۵/۳) ترجمہ: آج میں نے تمھارے لیے دین کو کامل مکمل کر دیا۔ اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی۔ اور تمھارے لیے اسلام ہی کو بلحاظِ دین پسند کیا۔

**(۵) خاتم النبیّینؐ اور تکمیلِ علمِ نبوّت** رسول اللہ صلعم سے قبل، اس عالم میں ہر ملک کی ضروریات اور خاص حالات کے تحت رسول آیا کرتے تھے۔ مثلاً موسیٰ علیہ السلام کی قوم میں سحر کا زور تھا تو عصائے موسوی کا معجزہ عطا فرمایا گیا۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کے زمانے میں فنِ طب بہت عروج پر تھا تو

قرآن بھرا ہوا ہے کہ دَنیٰ فَتَدَلّٰی (نزدیک ہوا پس اُتر آیا) بلکہ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی (۵۳) (پس تھا قدر دو کمان کے یا زیادہ نزدیک) ہیں لیکن نزول خود بھی اس ذات مبارک کا کمال ہے۔ کسی بڑے آدمی کا عروج ہی قابلِ تعریف نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کے نزول میں کمال کی وجہ سے اس کی شان ظاہر ہوتی ہے اور محبوبیت بڑھتی ہے۔ جو جتنا بلند ہوتا ہے اُسے اتنا نیچے اُترنا بھی طبعاً و فطرۃً پسندیدہ ہے۔ مثلاً اگر ہما یا باز جو آسمان کی بلندیوں پر اُڑتا ہے اور اُڑا کرتا ہے جب شکار کو دیکھتا ہے تو غوطہ لگا کر زمین تک آکر شکار کو لے اُڑتا ہے۔ اگر اتنا نزول نہ ہو تو اس کا کمال نہ رہا۔ اسی طرح پیراک کا اس وقت تک کمال نہیں سمجھا جاتا جب تک کہ وہ بلندی سے غوطہ زن ہو کر پانی میں گھس کر تہ کی مٹی نہ نکال لائے۔
اسی طرح جسمانی صحت کی خوبی یہ ہے کہ کھڑا ہو کر اتنا جھک سکے کہ زمین کو ہتھیلیاں یا انگلیاں لگ جائیں۔ اور اس کے بعد پھر وہ اُسی طرح پستی سے بلند ہو کر کھڑا ہو سکے۔ نہ صرف یہی بلکہ فطرت کا مقتضا ہے کہ اگر کسی بڑے آدمی سے ایک چھوٹا آدمی ملے تو چھوٹے آدمی کی سطح پر آکر اگر وہ بے تکلف ہو جائے اور خوشی سے باتیں کرے تو وہ اپنے آدمیوں میں کہے گا میں تو بہت بڑا آدمی سمجھا تھا لیکن ان سے ملنے پر مجھے ایسا معلوم ہوا کہ گویا اپنے بھائی سے بے تکلف ملا۔ مطلب یہ کہ فطرت کہتی ہے نزول کامل ہونا چاہئے جسے وہ اپنے الفاظ میں یوں ادا کر رہا ہے۔ اس کے برخلاف کسی بڑے سے ملا لیکن اس نے شان کی، تو وہ مغائرت و اجنبیت محسوس کرے گا اور کہے گا۔ ملا تو تھا لیکن آخر وہ بڑے آدمی ہیں۔ یعنی نزول کامل نہ تھا۔ اسی اصول فطرت کے تحت یورپ میں

کے متعلق انھوں نے کیا کچھ اہتمام نہ کیا ہوگا۔ دُنیا میں یہ ایک زندہ معجزہ ہے
کہ کسی اور پیغمبر کی سیرت و زندگی آج تک رسول اللہ کے برابر صحت و تفصیل
حزم و احتیاط و تحقیق کے ساتھ، اتنے مسلسل ثقہ راویوں کے ذریعے مرتب
و محفوظ نہیں کی گئی اور نہ اس کی نظیر مل سکتی ہے۔ تاریخ میں کوئی اور
اتنا مشہور اور بنی نوع انسان سے اس قدر بے تکلف مجانست رکھنے والا
یا انسانیت سے اتنی موانست رکھنے والا نظر نہیں آتا۔ چنانچہ جملہ معاملاتِ
زندگی میں آپ کی اتباع کا علم، جس انتہائی یقین کے ساتھ آسان ہے
کسی اور سے ممکن نہیں۔ آپ تحقیق کریں تو معلوم ہوگا کہ دیگر مذاہب
کے پیروؤں نے متضاد بیانات کی وجہ سے اپنے پیغمبروں کو افسانوی
شخصیتیں بنا دیا۔ اور سچ پوچھو تو قرآن کے طفیل میں بہت سے پیغمبروں کے
نام اور کام اور ان کی پاکیزہ سیرتیں بے لوث رنگ میں دُنیا کے سامنے ظاہر
ہوئیں۔ نظرِ انصاف سے دیکھئے تو یہ بھی قرآن کا بڑا احسان ہے۔

**(۷) کاملِ عروج۔ کاملِ نزول** | دوسری خاص نکتہ کی بات حضورِ انورؐ کی شخصیت کے متعلق یہ ہے کہ عروج
کی بھی حد نہیں، اور نزول کی بھی حد نہیں۔ یعنی عروج کامل، نزول کامل۔
یہ ایک ایسا اعجاز و کمال ہے جو سارے عالم میں حضورؐ کا امتیازی ہے۔
اسی عروج و نزول پر نظر کر کے دو طبقے بن گئے۔ ایک ایسے مشائخ جنھوں
نے صرف عروج پر نظر کی تو رسول اللہ کو اللہ بنا دیا۔ دوسرے وہ وہابی
جنھوں نے صرف نزول پر نظر رکھی تو "مِثْلُنَا" کہہ دیا۔ یعنی رسول اللہ
ہماری طرح معمولی آدمی ہیں یا زیادہ سے زیادہ بڑے بھائی ہیں، وہ لوگ
صریح غلطی پر ہیں۔ رسول اللہ کے عروج کا کیا کہنا کہ اس کی تفصیل سے

مسلمانوں کو خبر نہیں کہ وہ کتنی بے شمار نعمتوں سے مستفید ہو رہے ہیں جو چیزیں ہمارے پاس روزمرّہ معمولی ہیں وہ اوروں کے پاس غیر معمولی اہمیت پاتی ہیں، کیا بلحاظ کیفیت اور کیا بلحاظ کمیّت لیکن انسان اکثر ندرت پسند واقع ہوا ہے۔ اگر دُمدار ستارہ کبھی نکلا تو لوگ ضروری کام کاج بھی چھوڑ کر دیکھنے لگتے ہیں۔ اور روزانہ آبتاب آفتاب نکلتا ہے، اگر کوئی اُسے دیکھنے کو کہے تو اس پر تعجب کریں گے۔ غرض کسی چیز کی کثرت احساس قدر ذاتی کو کم کر دیتی ہے گویا وہ ہے ہی نہیں۔ ہم خود ہیں۔ دُنیا جہان کو ڈھونڈتے ہیں۔ لیکن خود کا پتہ نہیں۔

## (۱۰) توحید و رسالت

اسلام امن و سلامتی، آزادی، حق و انصاف، حُسن و خوبی کا مذہب ہے۔ فطری عملی مذہب ہے۔ محبت، رحمت، طہارت، شرم و حیا اس کے خمیر میں داخل ہیں۔ یہ دین یسر ہے۔ اس میں شدائد پسندی نہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ اسلام کی امتیازی خصوصیات کیا ہیں۔ اسلام کا سب سے بڑا مسئلہ توحید ہے۔ اس میں وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ کی تاکید ہے۔ قرآن نے اللہ کی ذات، صفات، افعال، آثار پر بالتفصیل، بالتکرار بحث کی ہے۔ مقصود کچھ اپنے کو منوانا نہیں، بلکہ اس میں ہمارا ہی فائدہ ہے۔ اللہ تو اپنی ذات کی حد تک غنی، حمید ہے، اور خلق کی حد تک: اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ (۲۰) تحقیق اللہ البتہ بے پرواہ ہے سارے عالموں سے۔ اسلام کی دوسری خصوصیت رسالت ہے جس سے عبد و رب کے باہمی تعلق کا علم ملتا ہے۔ اسلام نے عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ کو خوب صاف کیا۔ اتنا صاف کیا کہ اسلام کا معجزہ ہے کہ رسول سے کہ سب میں تاب تو نہیں

چھوٹی جماعتوں کو بوڑھے قابل پروفیسر پڑھاتے ہیں جو اعلیٰ علمیت کے باوجود بچوں کے معیار پر نزول کرتے ہیں۔ اور ایسی مجانست و محبت دکھاتے ہیں کہ بچوں کی طرح ہنستے ہیں، کھیلتے ہیں اور اسی میں بڑا کلچر اور علم بچوں کو دیتے ہیں۔ ورنہ بلند ہی بلند رہیں اور تقدس اور افضلیت دکھاتے رہیں تو بچے اُن سے کچھ نہ سیکھ سکیں۔

مختصر یہ کہ یہ اصول فطرت یعنی نزول کا کمال رسول اللہؐ میں بدرجۂ اکمل و اتم تھا۔ اتنا زیادہ کہ جن کی نظر افضلیت پر نہ ہو، کہنے لگے یہ تو ہماری طرح ہیں۔ آپ اس درجہ مجانست و ہم آہنگی برتتے کہ بچے آپ سے بے تکلف ہو جاتے اور آپ اُن کے ساتھ کھیلتے۔ اور بڑے بوڑھے، عورت مرد، بدوی حضری سب آپ سے مجانست محسوس کرتے وہ تو بلند تھے اور ہیں، لیکن نیچے اُتر کر پستی میں گرے ہوؤں کو ہاتھ پکڑ کر پہاڑ کی بلندیوں پر لے جانا کمال ہے جو حضورؐ نے انجام دیا۔

**(۸) انسان کا عروج و نزول** جسمانی لحاظ سے انسان اتنا کمزور ہے کہ گدھے کے برابر بوجھ نہ اُٹھا سکے۔ سانپ بلکہ مچھر تک سے ڈرے۔ اور کتے بلی کے برابر دوڑ نہ سکے لیکن روحانیات کے قطع نظر، اس کے مادی عروج کا بھی یہ حال ہے کہ جو ہری بم کے ذریعے ایک منٹ میں ایک برِ اعظم کو ختم کر سکتا ہے پس اس کے عروج کو نظر انداز کر کے، اس کے نزول کی بنا پر اس کے مرتبہ کا تعین کرنا سراسر جہل ہے۔

**(۹) اسلام کی نعمتوں کی کثرت** اسلام کی نعمتیں اس قدر بداہت وضاحت و کثرت کے ساتھ ہیں کہ

حق ادا کرتا ہے کہ امانت اُسی کی جانتا ہے۔ پھر اللہ کے امر کے تحت خلیفہ (نائب) بنتا ہے تو سارے عالم پر حکومت کرتا ہے اور پورا عالم اُس کے سامنے سر جھکاتا ہے۔

**(۱۲) انسانیت کی ترقیاں** اسلام انسانیت کی ترقیوں کے لیے آیا ہے اور بڑا پیام لایا ہے۔ انسان بڑی حقیقت ہے۔ یہ عروج و نزول دونوں کا جامع ہے۔ یہ مٹی سے بنا ہے جس میں کامل تنزل ہے۔ انسانی تخلیق پر فرشتوں نے اعتراض کیا اور کہا۔ یہ فساد مچائے گا۔ ہم تقدیس کرتے ہیں اُن کی نظر عروج کی طرف نہیں گئی۔ اللہ نے فرمایا۔ تم نہیں جانتے ہو یعنی تم بلندی (عروج) پہ ہو۔ تم میں تنزل کی صلاحیت نہیں۔ قرآنی تعلیم بتاتی ہے۔ اللہ کیا۔ رسول کیا۔ انسان کا تعلق اللہ کے ساتھ بذریعہ عبادات کیسا ہونا چاہئیے۔ اور انسان کا ربط انسان سے معاملات کے تعلق سے کیسا ہو۔ نیز انسان کا کائنات اور ارواح سے کیسا ربط ہو۔ خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا (۱/۳) اس کی شاہد ہے اور سائنس کی ترقیات بھی اس کی تصدیق کرتی ہیں۔

**(۱۳) مساوات و اخوت** اسلام میں دو اور خاص امتیازی نعمتیں مساوات اور اُخوت ہیں جو دیگر ادیان میں نہیں۔ یوں کہنے کو دوسرے لوگ یہ الفاظ بولتے ہیں لیکن معنی کا پتہ نہیں۔ ہمارے پاس یہ نعمت عام ہے دوسری جگہ خاص بھی نہیں کہی جاسکتی۔ مثلاً کسی مسجد میں جائے۔ ایک غریب سے غریب مسلمان کو حق حاصل ہے کہ امیر کے بازو کھڑا ہو کر نماز پڑھے، معانقہ کرے، ساتھ بیٹھ کر کھائے، بھائی سمجھے اس کے برخلاف عیسائی ممالک میں عبادات تک کے لئے گوروں کا چرچ الگ،

اَوْ اَدْنٰی (۹/۵۳)، صفات میں رَؤُفٌ رَّحِیْم (۱۱/۵)، افعال میں مَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ (۹/۱۶) اور آثار میں یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ (۲۶/۹) کی شان نظر آئے۔ لیکن مجال نہیں کہ کسی محل پر عبدیت اُلوہیت سے ٹکرا جائے۔ عبد عبد ہے۔ اللہ اللہ ہے۔ رَب رَب ہے۔ اس کو اسلام خوبی سے اسلام نے حل کیا کہ کوئی شک باقی نہ رہے۔ دوسرے مذاہب میں کسی بندے پیغمبر، رشی، بادشاہ میں عظمت و کمالات کی ذرا الٰہی تجلیات آنے لگتی ہیں تو اُلوہیت سے ٹکر ہو جاتی ہے اور اُسے خدا یا اس کا اوتار، بیٹا یا بیوی بنا دیتے ہیں۔ لیکن اسلام کا کمال یہ ہے کہ اس سے لاکھوں گنا زیادہ عظمت انسانی کا علم ملنے کے باوجود، رسول اللہ کی عبدیت کو اتنا واضح کر دیا کہ شک کی گنجائش نہ رہی۔ بلکہ عبدہٗ و رسولہٗ ہمارا ایمان ہے۔ ہمارے عقیدہ کی جان ہے۔ قرآن میں رسول اللہ کو سراج منیر (روشن سورج) کہا گیا۔ سورج گو نور کا مخزن ہے لیکن آخر وہ ایک تعین ہے۔ سراج منیر ہی سہی۔ اسی تعینِ محمدی میں اللہ کے فیضانِ نور و وجود کا کمال نظر آتا ہے۔

**(۱۱) عبدیت و رسالت** یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ رسول کی عبدیت کا تعلق اللہ کی ذات سے ہے۔ اور رسالت کا تعلق مخلوق سے ہے۔ ان دونوں کو خلط ملط نہ کرنا چاہئے۔ لیکن عبدیت مقدم ہے، ربوبیت سے ٹکر نہیں۔ ارشاد ہے: مَرَجَ الْبَحْرَیْنِ یَلْتَقِیٰنِ بَیْنَھُمَا بَرْزَخٌ لَّا یَبْغِیٰنِ (۲۷/۱۱) ترجمہ: (چلا دیا دو دریا کو ایک دوسرے سے لگ رہے ہیں۔ درمیان اُن کے پردہ ہے۔ ایک دوسرے پر زیادتی نہیں کرتے) عبد کے پاس جو کچھ ہے وہ مالک (رب) کا ہے۔ پھر وہ امانت کا

ہمیں معاملات میں امانت، دیانت، صداقت سے کام لینا چاہئے۔

**(۱۶) غیر مسلموں کے ساتھ حسنِ ربط**

آخر میں آپ حضرات کو بتاؤں گا کہ قرآن غیر مسلموں کے ساتھ کس قسم کے ربط کی تعلیم دیتا ہے۔ آیا منافرت کی یا محبت کی۔ باہمی منافرت اسلامی تعلیم کے قطعاً خلاف ہے۔ اسلام ہی کا ایک امتیاز یہ ہے کہ اس نے دیگر مذاہب اور اُن کی کتابوں اور پیغمبروں کی تصدیق کو جزوِ ایمان بنا کر دیگر قوموں سے مجانست و مؤانست کی تعلیم دی تا کہ باہم اجنبیت نہ رہے۔ ہم ان کی تصدیق کرنے والے ہیں۔ توحید اور اسلام کا پیام کوئی نیا پیام نہیں ہے۔ البتہ یہاں ایک نازک فرق ہے۔ وہ یہ کہ ہم اپنے قرآن کے لحاظ سے ان سب انبیاء کو مانتے ہیں جن کا ذکر قرآن میں ہے اور نہیں بھی ہے۔ لیکن ہم نام سے خاص طور پر ان کو مانتے ہیں جن کا قرآن میں نام سے صاف ذکر ہے۔ جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام وغیرہ۔ لیکن سری کرشن جی اور گوتم بدھ وغیرہ کے متعلق اُن کی مذہبی کتابوں اور پیغمبروں کی اچھی باتوں کی وجہ سے حُسنِ ظن رکھتے ہیں۔ صدیق، نیک، مقرب بندے کہنے کے مجاز ہیں۔ لیکن نبی اس وقت تک نہیں کہہ سکتے جب تک ہمارے پاس قرآن میں ان کے متعلق کوئی حُکم موجود نہ ہو۔

غیر مُسلموں کے ساتھ ربط کی خاص آیات ہیں۔ اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ (۱۴/۲۲) ترجمہ: (اپنے رب کی راہ کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ بُلائیے اور اُن کے ساتھ اچھے طریقے سے بحث کیجئے)۔ مزید حُکم ہے: وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًاۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ (۷/۱۴) ترجمہ: (مت بُرا کہو اُن کو جن کو یہ لوگ اللہ کے سوائے پکارتے ہیں (حالانکہ وہ باطل ہیں) پس وہ بُرا کہیں گے اللہ کو حد سے گذر کر

یوں کا چرچ الگ بلکہ ہوٹل تک الگ۔ یوروپ کے پاس قلب نہیں، دماغ
ہے، دماغ میں بھی نفسانیت ہے۔ اسی لیے وہ جمہوریت کا نقطہ لو لیتے ہیں حالانکہ
نا فقت ہوتی ہے۔ عرب بدو آج بھی ایک روٹی ملے تو دو چار بدوؤں کو
لاکر کھاتے ہیں۔ اسلام کے تحت بانٹ کر کھاؤ تو کمیونزم، بالشیوزم
پیدا نہیں ہوسکتے۔ اُخوت و مساوات، اور زکوٰۃ، صدقات خیرات کے
ذریعے اسلام ہی سب مصیبتوں کا حل ہے۔ چار غریب بھوکے ہیں۔ ایک امیر
بریانی کھاتا ہے اور دِکھا دِکھا کر کھاتا ہے۔ آگ نہ بڑھے تو کیا ہو۔

**۱۴) اسلام ہی حل** کہتے ہیں آج کل سارے عالم میں فساد ہے۔ لڑائی
ہے۔ اِن کا سُدھارنا مشکل ہے۔ میں پوچھتا ہوں
با عربوں سے بڑھ کر مُفسد، جاہل، جھگڑالو، بہادر، سات پشت کا بدلہ لینے
الی کوئی قوم دُنیا میں تھی یا ہے۔ لیکن اسلام نے چند برسوں میں کس طرح
نھیں منظم کر کے انقلاب برپا کر دیا کہ انھوں نے اتفاق کے کرشموں سے
ساری دُنیا کو حیران کر دیا۔ تو پھر کیا وجہ ہے کہ انھیں اسلامی تعلیمات پر اگر
ج دُنیا عمل کرے تو اصلاح نہ ہو۔

**۱۵) حقوق اللہ، حقوق العباد** قرآن میں عبادات و معاملات کا خوب ذکر
ہے۔ لیکن معاملات پر خصوصیت سے
زور ہے جو حقوق العباد ہیں۔ اسلام میں رہبانیت نہیں۔ انسان کی تکریم
مرتبت کا مدار تقویٰ پر ہے۔ اور تقویٰ کا مدار معاملات کے حُسن و خوبی
نجام دہی پر ہے۔ آیات:۔ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ (۲۶ ۱۴) لَیْسَ
الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا الخ (پ۲) پڑھ لیجیے۔ حقوق اللہ (عبادات) معاف
ہوسکتے ہیں لیکن حقوق العباد میں کوتاہی ناقابلِ معافی ہے۔ اِس لیے

اللہ کا عرفان ہے عرفانِ محمدؐ۔ ہم رسول اللہ کے ساتھ ہیں جن کے ساتھ اللہ ہے۔ نبی کے تعلق کے یہ یک وقت دو رُخ ہوتے ہیں۔ ایک وجہ اِلَی الحق۔ ایک وجہ اِلَی الخلق۔ وہ مخلوق کو خالق سے ملاتا ہے جسے برزخ کہتے ہیں۔ سلوک میں شیخ سے جو فیض ہوتا ہے اس میں اول سے آخر تک رسول اللہ صلعم کا برزخ دستگیری فرماتا ہے۔

توحید میں سُبْحَانَ اللّٰہ عروجی ربط ہے جو اعلیٰ ترین مقام توحید ہے! توحید میں اَلْحَمْدُ لِلّٰہ نزولی اعتبار ہے۔ اس عالم سے الحمد للہ کا تعلق ہے جو حق تعالیٰ کے نزول و تجلی کا محل ہے۔

حقایق و معارف کی تفہیم کے لیے بعض صوفیائے کرام نے اپنے وقت کے مروجہ انداز کلام کے لحاظ سے مختلف اصطلاحات استعمال فرمائی ہیں جن سے بعض صورتوں میں لوگوں کو غلط فہمیاں پیدا ہوئیں۔ لہذا حقائق کے بیان کے لیے قرآنی کلمات و اصطلاحات کا استعمال اسلم طریق ہے جس میں حفاظت اور نور ہے۔

**(۴) کلمۂ طیبہ کے فیوض** مسلمانوں میں لاکھ اختلاف ہوں لیکن لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ میں کوئی چون و چرا نہیں کرتا۔ کلمہ ہی کو توحید کہتے ہیں۔ اپنے تو کیا، غیر بھی اپنے اپنے انداز فکر میں اس سے خوشہ چینی کرتے ہیں۔ اسلام میں توحید انتہا درجے روشن اور درخشاں ہے۔ لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا الخ (۴/۳) رسالت کتنی بڑی نعمت ہوگی کہ اللہ نے احسان جتایا۔ اس لیے مومن کا بھی بڑا مرتبہ ہے کہ رسول پر ایمان لایا۔ کلمۂ طیبہ کے اقرار و تصدیق سے انسان مسلمان بن جاتا ہے۔ کلمہ کے معنی معلوم نہ ہوں تو بھی

جہالت سے (جس سے تم پر ذمہ داری آئے گی)۔ لہذا حُسن و خوبی سے معاملت کریں ان کو اور اُن کے معبودوں تک کو بُرا نہ کہیں۔ اُن کے پیغمبروں اور کتابوں سے حسنِ ظن رکھیں۔ منافرت کے بجائے موانست و مجانست بڑھائیں تاکہ تبلیغ کی راہ نکلے۔ البتہ اُن کو حُسن و خوبی سے یہ بتانا چاہئے کہ توحید کا پیام نیا نہیں۔ اِمتدادِ زمانہ سے کتابوں، ترجموں وغیرہ میں تبدیلیاں ہوگئی ہیں۔ اِن اِن اہم مسائل میں تمھاری کتابوں سے تمھارا علم اتنا ہے۔ اور ہمارے پاس اِتنا قدر زیادہ ہے۔ اتنا بہتر ہے۔ اگر تم پسند کرو تو ان اچھی باتوں کو اختیار کرو ورنہ دین میں جبر نہیں۔ اختیار ہے۔ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (پ۳) لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ (پ۳۰) اسلام کا اصول ہے۔ پس باہمی منافرت دینِ حق کی تبلیغ کے بجائے رکاوٹ کا باعث ہوسکتی ہے۔ پہلے اولیاء اللہ نے مجانست کے ذریعے رام کیا۔ اس مُلک میں خواجۂ اعظم اجمیریؒ نے محبت سے قلوب کو مسخر کیا اور لاکھوں کو مسلمان کیا۔ اگر کافر کافر کہہ کر دور کیا ہوتا تو ایک بھی مسلمان نہ ہوتا۔ یاد رکھو فقیر قلوب کا فاتح ہوتا ہے۔ (ختمِ تقریر پر دُعا فرمائی)

**(۲۳) کلمۂ طیبہ کا عروجی و نزولی رُخ** فرمایا۔ مدینۂ طیبہ کی حاضری کے زمانے میں ایک خاص صحبت میں گفتگو چلی تو میں نے کہا۔ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ نزولی رُخ ہے یعنی شانِ ظہور اور مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ عروجی رُخ ہے یعنی شانِ ہدایت۔ نزولی رُخ میں لا الٰہ الا اللہ اجمال ہے اور محمد رسول اللہ تفصیل۔ اور عروجی رُخ میں محمد رسول اللہ اجمال ہے اور لا الٰہ الا اللہ تفصیل۔ محمد رسول اللہ کے توسّل سے اللہ ملتا ہے۔ اور اسی اجمال کی تفصیل میں لا الٰہ الا اللہ کی گوناگوں تجلیات ظاہر و باہر ہیں۔ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ہی کے عرفان میں اللہ کا عرفان ہے۔ ع

کلمہ شہادت کہلاتا ہے۔ البتہ مدارج کا فرق ہے۔

کلمہ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں لیکن معبود کے لیے عبد بھی ہے اور رسول بھی ہے۔ عبد وہ ہے جس کے پاس اپنا کچھ نہیں۔ لیکن جب وہ خلعت شاہانہ پہن کر آیا۔ اور اس خلعت کو انعام شاہانہ بنایا تو شرک کیسے ہوا کیونکہ سب اللہ کی عطا ہے جب تک عبدیت نہیں کھلی توحید نہیں کھلی۔ ادھر سے پانی آیا تو کہہ دیا اس بادل کا ہے ادھر سے پانی آیا تو کہہ دیا اس بادل کا ہے۔ اس پر سمندر نہیں کھلا۔

کلمہ طیبہ کے ذریعے سے حدیثوں میں اشارات آتے ہیں۔ ان کے علم کی جان توحید و عبدیت ہے جس توحید میں عبدیت و رسالت نہ ہو تو ناقص فلسفہ ہے۔ عبدیت نہ ہو تو شرک، رسالت نہ ہو تو کفر۔

(۱۵) رسالت ناگزیر ہے: قرآن بالتکرار رسالت پر زور دیتا ہے۔ لہذا حکم ربانی کے تحت ہمارا مقام و منزل، مطلوب و محبوب محمد رسول اللہ ہونا چاہیے۔ اور محمد رسول اللہ کی منزل لا الہ الا اللہ ہے۔ ہمارا مقصود رسالت حاصل ہونے کے بعد حضور انور کے ذریعے حقیقی توحید یعنی لا الہ الا اللہ کی سیر کرانا ہے۔ عام طور پر یہ غلط فہمی ہے کہ ابتدا میں مبتدی و متوسط کے لیے تو رسالت کی ضرورت ہے۔ لیکن منتہی ہونے کے بعد استغراق کے لیے اس کی ضرورت نہیں۔ حالانکہ درحقیقت ہر مقام پر جہاں ہدایت ہے، اس کے مقابل اس مقام کی ضلالت بھی ہے۔ لہذا ہر محل پر حضور کی رہبری ناگزیر ہے لیکن ایک کج فہم طبقہ کو رسالت کا صرف اقرار ہے، حالانکہ اکابر کو اسی پر اصرار ہے کہ حضور کے بغیر کسی منزل کا صحیح راستہ اور کسی محل کا صحیح حال نہیں مل سکتا۔ ہر محل پر رسالت کا تعلق تا موجود ہے

اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔ افسوس ہے کہ اب یہی بات بعض کج فہم مولوی بھی چھپانے لگے ہیں۔ لیکن اسلام میں رسالت ناگزیر چیز ہے۔ ترقی کے لیے ہر آن اس کا ربط اور اس سے عقیدت و وابستگی لازمی ہے۔ اس پر اولیاء اللہ کا اصرار ہے۔ اسی لیے نامعلوم طور پر محبت و عقیدتِ نبوی کے انجکشن دینے ضروری ہیں۔ آج کل راست تخاطب و موعظت سے لوگ بھڑک جاتے ہیں۔ وہ سسٹم اب پسند نہیں۔ لہذا نفسیات کا لحاظ ضروری ہے۔

## (۸) واسطۂ رسالت اور قرآن

انسانیت کی تکمیل حضورؐ کی شکل میں ہوئی۔ آپ سارے اسماء و صفات و کمالاتِ الہٰی کے مظہر بنے۔ لوگ رسول اللہؐ کی عظمت اور مقام کو نہیں سمجھتے اور نہ یافت ہے۔ اور ذات کی یافت کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اگر توحید کی معمولی ہوا لگ جائے تو برداشت نہ کر سکیں۔ یہ تو رسالت ہی کا صدقہ ہے کہ اس کے سایہ اور واسطہ سے انسان توحید کو برداشت کر لیتا ہے۔ رسالت کی ٹھنڈک میں توحید کی حرارت برداشت کی جاتی ہے، ورنہ بھسم ہو کر رہ جائے۔ اللہ تو لامحدود ہے۔ یافت و شہود سے بالا ہے۔ مقام ھُو ہے۔ نایافت ہے۔

رسول اللہؐ کا اقتضائے ذات قرآن ہے۔ اللہ نے سارا علم قرآن کے ذریعے ظاہر کیا۔ کُلٌّ فِیْ کِتَابٍ مُّبِیْنٍ (۱۲) انبیاء تک کو قرآن ہی سے حصہ ملا۔ رسول اللہؐ ہی کے واسطے سے انھیں یافت ہوئی۔ ساری یافت علم کی ہو رہی ہے اور علم قرآن ہے۔ حضورؐ علم مجسم ہیں۔ اس لیے جو کچھ یافت ہو رہی ہے بفضلہ رسول اللہؐ کی ہے۔ چنانچہ اولیاء اللہ کا اتفاق ہے کہ رسول کے معنی علماً و عملاً قرآن کے ہیں۔ ایمان کے بعد جو شخص جس قدر قرآنی علم و عمل میں لگا ہوا ہے۔ یا جس قدر آیات کے ساتھ لپٹا ہوا ہے اُسی قدر وہ رسول اللہ کے ساتھ لپٹا ہوا ہے، اور اُسے حضور کی معیت و رفاقت حاصل ہے۔

والکیت کا لازمی نتیجہ ہونا چاہئے چنانچہ فیصلہ ملاحظہ ہو۔ بَلْ اَتَیْنٰهُمْ بِالْحَقِّ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ (۲۳ پ ۱۸) ترجمہ: بلکہ لائے ہم اُن کے پاس حق (یعنی رسالت) اور تحقیق وہ البتہ جھوٹے ہیں (کیونکہ رسالت سے انکار ہے، گو توحید کے بعض پہلوؤں کا سطحی اقرار ہے)۔

## (۷) ربطِ رسالت دین کی جان

آج کل بہت سے علماء اور مرشدین کثرتِ معلومات پر فخر کرتے ہیں جو از روئے قرآن صحیح نہیں۔ کثرتِ معلومات اصل نہیں دین کے متعلق کثیر معلومات ہونے سے لازم نہیں آتا کہ انہیں ایمان بھی حاصل ہو۔ اگر یہی نظریہ ہو تو مستشرقین یورپ کے معلومات تفسیر، حدیث، فقہ کے متعلق اتنے زیادہ رہتے ہیں کہ اکثر مولوی مشائخ اُن سے پانچ منٹ بات نہیں کر سکتے۔ کیا اسی بنا پر انہیں مومن کہا جا سکتا ہے!

دراصل دین و ایمان نبوّت سے ربط کا نام ہے۔ ربط اصلِ حیات ہے جس میں محبت سے جان پڑتی ہے۔ حُبِ نبوی کے بغیر دین، ایمان کا ربط پیدا نہیں ہو سکتا اور نہ حقیقی توحید مل سکتی ہے۔ اس کے بغیر دینی معلومات جسد بے رُوح ہیں۔ جلانے کی لکڑی ہیں۔ ثمردار درخت نہیں۔ لہٰذا محبت لازمی ہے۔ زمانۂ حال کے شر و فتن کا اقتضا یہ ہے کہ تبلیغ میں محمدؐ رسول اللہ پر بہت زیادہ زور دیا جائے ؎ بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست۔

آج کل توحید سارے عالم میں فلسفہ بن چکی ہے۔ نہ ماننے والے بھی اسے ماننے لگے ہیں۔ بلکہ رسالت کو بھی قبول کرنے پر تیار ہیں کہ وہ واقعی انبیاء اخلاق وغیرہ کے لحاظ سے اچھے لوگ تھے۔ لیکن اُن کے ساتھ ایمان و اطاعت کا رابطہ ضروری نہیں سمجھتے۔ حالانکہ حکم ہے۔ وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ (۶۴ پ ۵) ترجمہ: نہیں بھیجا ہم نے کوئی پیغمبر مگر اس واسطے

تعلق ماضی سے ہے۔ اس مقام صدق کے بعد نہ ماضی کے متعلق حزن و غم باقی رہتا، اور نہ مستقبل کے بارے میں خوف۔

**(۱۰) مقام حق** حضورؐ مقام حق پر ہیں۔ اِنَّکَ عَلَی الْحَقِّ الْمُبِیْنِ ﴿۲۷﴾
ترجمہ: تحقیق تو اوپر حق ظاہر کے ہے۔ غلام وہیں رہے گا جہاں آقا رہے گا۔ جو اس مقام کو دیکھیں گے پہچان لیں گے نسبت غلامی کی وجہ سے یہ سرفرازی ہے۔ حضورؐ اعلیٰ ترین مقام حق پر رہنے کے باوجود ہم غلاموں کے حق میں رؤف و رحیم ہیں جس کی وجہ سے اعلیٰ مقام حق تک ہمیں سرفرازی نصیب ہوتی ہے۔

**(۱۱) انسان کے احتیاجات** کافر و مومن کے تصور کائنات میں بہت فرق ہے۔ کافر چاند، سورج وغیرہ کو مخدوم بلکہ معبود سمجھتا ہے، اور مومن خادم۔ اللہ نے انسان کو مخدوم بنایا ہے اور کائنات کو اس کا خادم و تابع۔

یوں تو کائنات میں ہر چیز محتاج ہے، لیکن سب سے زیادہ محتاج انسان ہے۔ یہ ہر چیز کا محتاج ہے۔ کبھی کوئی دعویٰ نہیں کر سکتا کہ میں کسی کا محتاج نہیں رہوں گا چاہے وہ چھوٹی چیز ہی کیوں نہ ہو۔ ورنہ اُسی کا محتاج بنا دیا جاتا ہے۔ انسان کا بال بال محتاج ہے۔ میں نے عرض کیا۔ یوں تو بندہ اللہ کا ہر طرح محتاج ہے لیکن مخلوق کا بھی محتاج ہے۔

فرمایا۔ دراصل انسان اللہ ہی کا محتاج و فقیر ہے۔ اور اللہ کے ظہور کے مرتبہ میں مخلوق کا محتاج ہے۔ لہذا وہ اللہ ہی کا محتاج ہوا۔ علم صحیح ہونا چاہیئے۔

عبدیت فقر و احتیاج کا نام ہے۔ احتیاجات بڑھائے جاؤ اور

محمدؐ ہی کو برزخ، واسطہ، ذریعہ، توسط، توسل کہتے ہیں۔ آپ ہرمحل پر واسطہ ہیں۔ واسطہ کا یہ مطلب نہیں کہ استاد نے کچھ پڑھا دیا، باقی ہم خود پڑھ لیں گے۔ یا سفرِ حج کے لیے کسی ایجنسی سے ٹکٹ لے لیا۔ بعد کو ایجنٹ کی ضرورت نہیں۔ بلکہ ہر محل پر آپ کی ضرورت اُسی مناسبت سے بڑھتی جاتی ہے۔ غوث، اقطاب ہر اعلیٰ سے اعلیٰ محل پر انھیں قدموں کے ذریعے ترقی کرتے ہیں۔ ہماری رسائی محمدؐ تک ہے۔ اور محمدؐ کی رسائی اللہ تک ہے۔ وہ چاہیں تو بفضلہ ہمیں رسائی عطا کریں۔

فقیری کا نکتہ یہی ہے۔ جو ماسوا رسول اللہ۔ جو نہ ماسوا اللہ۔ جو کچھ بافت و شہود میں ہے وہی محمدؐ ہے۔ ظہور ہی کو محمدؐ کہتے ہیں۔

ع جہاں روشن است از جمالِ محمدؐ (جامیؒ)

## (۹) تصدیقِ رسالت کا انعام

وَالَّذِیْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهٖۤ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ۔ لَهُمْ مَّا یَشَآءُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الْمُحْسِنِیْنَ (۲۴) ترجمہ: اور وہ جو آیا سچ کے ساتھ اور جس نے اس کو مان لیا۔ یہ لوگ ہی پرہیزگار ہیں وہ جو چاہیں ان کے لیے ہے نزدیک اُن کے پروردگار کے۔ یہ صلہ ہے احسان کرنے والوں کے لیے۔

رُبوبیت کے علم کو جڑ پکڑنے میں دیر بھی لگتی ہے تاہم بعض جلد ہی سمجھ جاتے ہیں اور عمل جاری ہو جاتا ہے۔ تصدیقِ رسالت کے ساتھ ہی متقی کی ڈگری ملتی ہے۔ اور رُبوبیت کے علم کے بعد لَهُمْ مَّا یَشَآءُوْنَ کا فیضان جاری ہوتا ہے۔ جب ہم اللہ کو رب بنائیں تو لَا خَوْفٌ وَّلَا حُزْنٌ کا مقام عطا ہوتا ہے۔ خوف کا تعلق مستقبل سے اور حزن و غم کا

اور رب ہے کہ وہ حضرتِ وجود ہے اور حمد کا مرجع ہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ۔ وَسُبْحَانَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ (۹/۱۹) البتہ ربوبیت کے فیضان میں اللہ سے اقرب اسم رحمٰن ہے۔ وَاِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمٰنُ (۱۶/۱۴) اور سب پر حاوی صفتِ رحمت۔ وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ (۹/۹) پس ربُّ العالمین کی طرف سے جو رَحْمَةٌ لِّلْعَالَمِيْنَ کا ظہور ہوا یہ عبدیتِ محمدیؐ کا مقام ہے۔ اور بایں ہمہ اللہ بے استغنیٰ۔ اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِيْنَ۔ پھر حمد کیا ہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ حمد تمام اللہ کی ہے۔ هُوَ الظَّاهِرُ کے عوالم حمد سے معمور ہیں۔ البتہ هُوَ الْبَاطِنُ کی هُوِيَّتْ سُبُّوحِيَّت میں مستور ہے۔ تو پھر حمد ہی گویا رسول اللہ نکلی کہ ہر دم اور ہر قدم اس کی خبر دیتی ہے۔ (اقتباس از صراط الحمید البرہانی حصہ اول)

## (۱۳) حُبُّ العالمین حُبِّ ربُّ العالمین | عبدیت کا شغل سب شغلوں میں اعلیٰ ہے

اسی عبدیت کے صدقے میں، عبد انبیاء، اولیا کے مقامات کو پاتا ہے، دیکھتا ہے۔ حضورؐ علمِ الٰہی کا ظہور ہیں۔ جامعیتِ ظہور کی بنا پر حضورؐ محبوب ہوتے ہیں۔ گویا محبت ہی نے عالمین میں ظہور کیا ہے۔ بقول میرؔ

نہ ہوتی محبت نہ ہوتا ظہور ٭ محبت نے ظلمت سے کاڑا ہے نور

حُبُّ العالمین اور حُبِّ ربُّ العالمین کے درمیان حُبِّ نبیؐ ہی سہارا ہے۔ حُبِّ نبیؐ ہی دونوں نسبتوں کو سنبھالتا ہے۔ کائنات کی محبت جو دراصل حُبِّ نبیؐ کا مظاہرہ ہے اس میں بھی خوبی پیدا کرنے والی اور توازن برقرار رکھنے والی چیز حُبِّ نبیؐ ہی ہے۔

محبت کی تجلی ہوئی تو عالمین میں ہر ایک کو اس سے حصہ ملا اور

خدا کی خدائی لیتے جاؤ۔ یَسْأَلُهُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۔ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ (۲۷/۱۲) ترجمہ: آسمان زمین والے اسی سے اپنی اپنی حاجتیں مانگتے ہیں۔ ہر روز وہ بیچ ایک شان کے ہے جتنا فقر بڑھے گا اسمِ غنی کی تجلی اُسی شان سے ظاہر ہوگی۔ أَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ إِلَى اللهِ ۔ وَاللهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ (۲۲/۱۲) تم اللہ کے محتاج ہو۔ اللہ ہی بے احتیاج خوبیوں والا ہے۔

**(۱۲) عبدیتِ محمدی** ذاتُ اللہ یافت و شہود سے بالا ہے۔ وَرَاءُ الْوَرَاءِ، ثُمَّ وَرَاءُ الْوَرَاءِ ۔ اللہ تعالیٰ کی کیا شان ہے۔ سُبْحَانَ اللهِ وَتَعَالَىٰ عَمَّا يَقُولُونَ عُلُوًّا كَبِيرًا (۲۵/۵) وَيُحَذِّرُكُمُ اللهُ نَفْسَهُ (۳/۱۱) اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم۔ لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ (۷/۱۴) درست۔ لَنْ تَرَانِي (۹/۴) بجا۔ تاہم اللہ دکھائے تو بہت کچھ نظر آئے۔ سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ (۲۵/۱) یعنی آفاق و انفس میں ہم اُن کو اپنی نشانیاں دکھائیں گے یہاں تک کہ حق اُن پر ظاہر ہو جائے گا۔ خلاصہ یہ کہ هُوَ الْأَوَّلُ وَالْآخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۔ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ (۲۷/۱۷) وہی اوّل آخر ظاہر باطن ہے۔ اور وہ ہر چیز کو جانتا ہے۔

اُس کے سوا موجود ہے کون جو ہونے کا دعویٰ کرے۔ یہ جو کائنات موجود نظر آتی ہے۔ یہ اُسی وجود کا فیضان ہے۔ هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ (۳/۳) البتہ کل شیٔ کو علمِ الٰہی میں ایک ثبوتِ علمی ضرور حاصل ہے اور یہی اُن کی اصل ہے۔ یہ جو عالمین مربوبات سے معمور ہیں فیضانِ ربوبیت کا ظہور ہیں۔ اور پھر مربوب مربوب ہیں کہ ان کو ثبوتِ علمی کے سوا کچھ حاصل نہیں۔

آتے رکھتے ہیں۔ وہاں کسی کا کوئی اعتبار نہیں۔

ارشاد فرماتا ہے۔ ہم محمدؐ کے رب ہیں۔ عالمین میں ربوبیت کا فیضان مِنْ عَطَاءِ رَبِّكَ ہے۔ یعنی ربِّ محمدؐ کی عطا کے طور پر حضورؐ کے صدقے میں اور وسیلے سے فیضانِ ربوبیت سب کو مل رہا ہے۔ انبیاء تک حضورؐ کے واسطے سے فیض لے رہے ہیں۔ سوائے حضورؐ کے کوئی ربوبیت کا مظہر نہیں۔ حضرت موسیٰؑ کے مریدین نے کہا تھا۔ آمَنَّا بِرَبِّ هَارُونَ وَمُوسَىٰ (۷۰-۲۰)۔ لیکن یہاں خود اللہ فرماتا ہے۔ هُوَ مِنْ عَطَاءِ رَبِّكَ۔ یعنی ربِّ محمدؐ۔ اس کی مثال ایسی ہے۔ ایک باپ بیٹے سے کہتا ہے۔ میں تیرے دوستوں وغیرہ کی جو کچھ خاطر و مدارات کر رہا ہوں وہ محض تیری خاطر ہے، تیرے واسطے ہے۔ اسی لیے کہا گیا۔ لَوْلَاكَ لَمَا خَلَقْتُ الْأَفْلَاكَ۔ اگر محمدؐ کی ذات نہ ہوتی تو ربوبیت کا فیضان ہی نہ ہوتا۔ اور نہ آسمان، زمین پیدا کئے جاتے۔ اگر ہم قُلْ يَا عِبَادِيَ (۵۳-۳۹) میں آجائیں تو کامل فیضان حاصل ہوتا ہے۔

## (۱۵) حقیقتِ محمدیؐ اور قرآن

رسولؐ علم کو کہتے ہیں۔ ہماری ساری ہستی بحسبِ اقتضاءِ علم کی حد تک ہے کہ ہم صورِ علمیہ ہیں۔ علم سے ہٹ کر ہمارا کہیں قیام و قرار نہیں۔ البتہ علم علیم سے راست ربط رکھتا ہے۔ جیسے قرآن کلام اللہ ہے، اس کے حروف و کلمات بھی کلام اللہ ہیں۔ حروف وغیرہ کا ایک ربط قرآن سے ہے تو دوسرا ربط اللہ کے کلام سے ہے۔ یہ ایک دوسرے کے مغائر نہیں بلکہ لازم و ملزوم ہیں۔ رسول کے تعلق سے اللہ کے تعلق میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اور اللہ کے تعلق سے رسول کے تعلق میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔

ہر شخص اپنی اقتضا کے لحاظ سے اسے استعمال کر رہا ہے۔ بلند نظری کی وجہ سے پروانہ شمع کے حسن پر فدا ہو رہا ہے تو گبریلا گوبر پر شیدا ہو رہا ہے۔ اسی طرح انسانوں میں کوئی زر، زمین، زن پر فدا ہو رہا ہے تو کوئی اللہ، رسول، اولیاء اللہ پر نثار ہو رہا ہے۔ یہ سب فرقِ محل و نسبت کی وجہ سے پیدا ہو رہا ہے۔

**(۱۴) حقیقتِ محمدی ﷺ** فرمایا۔ ابھی نمازِ جمعہ میں رسول اللہ ﷺ کی شان (حقیقتِ محمدی ﷺ) اس آیت سے کھل گئی۔ كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ۚ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا (پ ۱۵) ترجمہ: ان میں سے ہر ایک کو ہم مدد دیتے ہیں۔ اور ان کو تیرے رب کی بخشش سے اور تیرے رب کی عطا (دنیوی) بند نہیں کی گئی۔ مطلب یہ کہ سارے عالمین میں جو فیضانِ ربوبیت ہے وہ صرف تیرے رب کی عطا ہے۔ یعنی اصل میں رب محمد ﷺ کا ہے۔ ایک ہی رب ہے تو ایک ہی مربوب (عبد محمد ﷺ) ہے۔ اجمالاً دراصل محمد ﷺ ہی ایک ذاتِ مربوب ہے۔ باقی سب عالمین محمد ﷺ کی تفصیل ہیں۔ ان سب میں ربِّ محمد ﷺ ہی کا فیضان ہے۔ بعض اولیاء اللہ نے فرمایا۔ ربِّ محمد اسمِ اعظم ہے۔ علم (قرآن) حقیقتِ محمدی ﷺ ہے، اور سارے معلومات (عوالم) حقیقتِ محمدی ﷺ کی تفصیلات ہیں۔ چار چیزیں اصل ہیں۔ محمد، حامد، احمد، احد۔ اِس عالم کے تعلق سے دو۔ اُس عالم کے تعلق سے دو۔ اِس عالم میں حمد کے ذریعے سے فیض ہے۔ اِس عالمِ خلق میں جس ذات کی طرف اللہ تعالیٰ کی توجہ ہے وہ اِس عالم کی نسبت سے محمد ﷺ کہلاتی ہے۔ اس عالمِ امر میں جس ذاتِ محمدی ﷺ کی طرف اللہ کی توجہ ہے وہ اُس عالم کی نسبت سے احمد کہلاتی ہے۔ اور احمد کی توجہ جس ذات کی طرف ہے اسے

اُن سے ہٹ کر کوئی شئے نہیں۔ رسول اللہ برزخ ہیں۔ واسطہ ہیں۔ رحمۃ للعالمین ہیں۔ اِس لیے ہر چیز کو رسول اللہ ہی سے فیض مل رہا ہے۔ وہی رُوحُ الارواح، قلبُ القلوب، اور جسدُ الاجساد ہیں۔ حضورؐ نے فرمایا۔ اللّٰہُ مُعطِیْ وَاَنَا قَاسِمٌ یعنی اللہ اصل میں خالق ہے اور رسول اللہ کو نعمتیں عطا فرماتا ہے۔ اور حضورؐ اِن نعمتوں کو سارے عالم میں بانٹ رہے ہیں۔ یا، عالمین کے ساتھ اللہ اور رسولؐ کے ربط کو آسمان کے بادل اور زمین کے سمندر سمجھو کہ پانی کا تعلق آسمان و زمین دونوں سے ہے۔

(۱۷) **حقیقتِ محمدیؐ اور علم** | حضورِ انورؐ کا خاص امتیاز آپ کا علم ہے۔ وَ عَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ (پ۵) علم حیات پر حاکم ہے۔ بعض عیسائی مصنفین کہتے ہیں حضرت عیسیٰؑ کو یہ معجزات حاصل تھے کہ مُردوں کو زندہ کرتے تھے اور اندھوں، مجذامیوں کو اچھا کرتے تھے۔ اور یہ کہ حضرت موسیٰؑ کو سمندر نے راستہ دیا۔ اور یہ کہ حضرت سُلیمانؑ کی حکومت ہواؤں اور جِنوں پر تھی۔ اس کے برخلاف وہ کہتے ہیں کہ حضورِ انورؐ کے معجزات زیادہ نظر نہیں آتے۔ اس کو سمجھنے کے لیے بصیرت کی ضرورت ہے۔ علم اور معجزات کے فرق کی مثال ایسی ہے کہ ایک شخص سائنس اور علمِ ادویہ کا بڑا ماہر ہے۔ اس کے علم کے چند اصول معلوم کر کے بڑے بڑے ڈاکٹر علاج کرتے ہیں، لاکھوں کو شفا بخشتے ہیں۔ اگر کوئی کہے کہ میں نے تو اُس محقق کو آپریشن کرتے اور دوا دیتے نہیں دیکھا تو وہ نرا جاہل ہے۔ اسی طرح بجلی کا ایک بڑا ماہر انجنیر ہے۔ شہر بھر میں نیچے کے فِٹر اپنے بجلی کے کارناموں سے سب کو حیران کئے ہوئے ہیں حالانکہ انجنیر کا پوزیشن بہت اعلیٰ ہے۔ جب ضرورت ہوگی اُسی کے علم سے بجلی کی ساری خرابیاں دُور

اِسی لیے توحید اُسی کی پکی ہے جس کی رسالت پکی ہے۔ محمدٌ رسول اللہ کے بغیر لا اِلٰہ اِلّا اللہ حاصل ہی نہیں ہوسکتا۔ ہم نے رسولؐ ہی سے اللہ کو پایا اور پاتے رہیں گے۔

(۱۶) حقیقتِ محمدیؐ اور خاص صورِ مبارک | حقیقتِ محمدیؐ اور آپ کی خاص شکل و صورت کی مثال یوں

سمجھو جیسے لفظِ قرآن۔ کہ قرآن کہتے ہی قرآن کا وہ لفظ معین بھی ذہن میں آجاتا ہے جو اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ (۲۷/۱۹) ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ اِک لفظِ قرآن میں، قرآن کا ہر ہر کلمہ بلکہ ہر ہر حرف شامل ہے۔ گویا یہ لفظ پورے قرآن کو حاوی ہے جس میں جنت، دوزخ، ابولہب، شیطان اور ہر رطب و یابس داخل ہیں۔ اور اس میں لفظ شیطان و دوزخ وغیرہ ہونے سے، قرآن کی تطہیر و تقدیس میں کوئی فرق نہیں پڑتا اسی طرح محمدؐ کہتے ہی آپ کی خاص صورت مبارک اور آپ کا سارے عالم پر حاوی ہونا شامل ہے۔ اس لیے حضورؐ سے ہمارا زندہ ربط ہر آن رہنا چاہیئے حضور اور قرآن ایک ہیں لیکن ایسے لوگ بھی ہیں جو قرآن کا علم حاصل کرنے اور اس پر عمل کرنے کو حضورؐ کی معیت و رفاقت نہیں سمجھتے۔

مزید براں عالم کے ساتھ اللہ اور رسول اللہؐ کے تعلق کو اس طرح سمجھو کہ ایک تو عموداً راست تعلق ہے۔ اُوپر سے نیچے۔ اور ایک اُفقی تعلق ہے، سطح زمین پر سطح کے لحاظ سے۔ اس طرح ایک بالائی تعلق ہے اور ایک ذیلی تعلق۔ ایک اوپر کا۔ ایک نیچے کا۔ ایک تخلیقی اعتبار خالق کا اوپر سے عموداً ہے۔ دوسرے رسول اللہؐ کا اعتبار عالم سے اُفقاً

رسولؐ کی صورت میں مقید ہو کر آتی ہے تو رسول اللہؐ کہلاتی ہے۔ وَمَنْ يُطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (۵/۸) یعنی رسولؐ کی اطاعت دراصل اللہ کی اطاعت ہے۔

**(۱۹) عبدؐ کا عبد** فرمایا۔ ہمارا مسلک قرآنی ہے۔ یعنی قُلْ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰۤی اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ (۲۴/۳)

ترجمہ: کہہ۔ اے میرے بندو جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی اللہ کی رحمت سے نا امید مت ہو۔ یہی مسلک حضرت عمرؓ کا رہا۔ مستدرک میں حاکم نے روایت کی ہے کہ جب حضرت عمرؓ خلیفہ بنائے گئے تو آپ نے منبر پہ خطبہ میں فرمایا۔ اِنِّیْ كُنْتُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَكُنْتُ عَبْدَهٗ وَخَادِمَهٗ۔ یعنی میں رسول اللہؐ کا عبد (غلام) اور خادم تھا۔ حضرت علیؓ نے بھی یہی فرمایا۔ اَنَا عَبْدٌ مِنْ عَبِيْدِ مُحَمَّدٍ صلعم۔ اللہ کے عبد رسول اللہؐ ہیں اور ہم عبد اللہ کے عبد ہیں۔ بعض مُرشدین عبد بننے کے بجائے اللہ بنتے ہیں۔ عبدیت اور عبدؐ کے عبد بننے کی تعلیم کو نقص سمجھتے ہیں۔ لیکن جب وقت پڑے تو یہ خدا بننے والے عباد الدنیا کے سامنے جھکنے میں تامل نہیں کرتے۔ معترضین کہتے ہیں۔ ہم عبد اللہ ہیں۔ اور اللہ سے ربط کے لیے ہماری عبادات و اعمال صالحہ کافی ہیں۔ وہ آیت 'قُلْ یٰعِبَادِیَ' کی ایسی تعبیر کرتے ہیں کہ عبد الرّسول کہنے کو شرک سمجھتے ہیں۔ حکمت کا اقتضا تھا کہ اللہ نے اپنی طرف توجہ اور محبت کے لیے حضورؐ کا توسط لازمی قرار دیا۔ حکم ہے فَاتَّبِعُوْنِیْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (۳/۳) بڑے بڑے انبیاء آپ کا دامن تھامتے ہیں، وسیلہ بناتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اپنے حبیبؐ کے طفیل میں متوجہ ہوتا ہے۔ ورنہ غنی سے توجہ کی کیا صورت ہو سکتی ہے۔ لَا تَقْنَطُوْا کی بشارت 'یٰعِبَادِیَ' کے بعد ہے۔

لہ تفسیر سورۂ فاتحہ (علامہ حسرت)

ہوں گی۔ یہی علم جو سب کائنات پر حادی ہے حضورِ انور کا خاص امتیازی کمال ہے اور یہی سب سے بڑا اکرام ہے۔ یہ وحدت کا مقام ہے۔ کلام کا مقام نہیں۔ اس لیے فرمایا۔ فَاَوْحٰۤی اِلٰی عَبْدِہٖ مَاۤ اَوْحٰی (۲۷)

### (۱۸) خُلقِ عظیم

فرمایا۔ وَمَاۤ اَدْرِیْ مَا یُفْعَلُ بِیْ وَلَا بِکُمْ (۲۶) ترجمہ (میں نہیں جانتا کہ میرے ساتھ کیا کیا جائے گا اور نہ تمہارے ساتھ) کہنے والا ہی اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ (۱۵) کا سزاوار ہے۔ اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ (۲۹) (آپ اخلاق کے اعلیٰ پیمانہ پر ہیں) اور بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر۔ اُسی کی شان ہے۔ لیکن بے بصیرتوں کو اسی وَمَاۤ اَدْرِیْ میں مثلیت، معذوری، مجبوری نظر آتی ہے۔ اور جو حضور کی عظمت کی بلند چوٹی ہے اور انتہائی قرب کا مقام ہے وہی اِن منکروں کو وادیوں کی پستی نظر آتی ہے۔ حالانکہ اسی میں انتہائی عُلو، عظمت، امانت، ولایت، خلافت مضمر ہیں کہ یہ سب عبدیت کے لوازم ہیں۔ سارے عالم پر تصرف عطا کئے جانے کا راز اسی عبدیت میں ہے۔ بفضلہ آپ کی صفت رحمۃ للعالمین ہے۔ لیکن عبدیت کا اقتضا ہے کہ اپنی حقیقت اور بے بسی کا یوں اظہار فرماتے ہیں اور محض فضل کے امیدوار رہیں۔

جو بی بی زیور، لباس، مکان، ملازمین پر پوری متصرف و مالک ہو۔ اور پھر بھی سمجھے کہ یہ محض میاں کا عطیہ ہے اپنا کچھ نہیں۔ تو وہی میاں کی نظر میں سب سے زیادہ محبوب بن کر رہے گی۔ اور اُسے امانت کی صلاحیت کی وجہ سے کمال تصرف عطا کیا جائے گا۔

جب خلافت کی حکومت کے باوجود، اطاعت و عبدیت ظاہر ہوتی ہے تو اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ سے سرفرازی ہوتی ہے۔ اور مرضیٔ الٰہی جب

عبدیت ہی امانت کی حامل ہے۔ خلافت اسی کی شان ہے۔ اس لیے عبدیت بہرصورت مقدّم ہے۔ اور عبدیت حضرت خاتم النبیینؐ کا خاص الخاص مقام ہے۔ عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ۔ پھر رسالت کی شان دیکھیے۔

اِدھر مخلوق میں شامل اُدھر اللہ سے واصل
خواص اس برزخ کبریٰ میں ہے حرفِ مشدّد کا

**(۳) عروج کے لوازم** توحید کے تحت حکمت کا ظہور ہوتا ہے۔ اور ظہور میں انسان بہت جامع ظہور ہے۔ کہ اس کے عروج و نزول میں بہت وسعت ہے۔ انسانیت کا انتہائی عروج نبوت ہے۔ اور نبوّت کا کمال رسالت ہے۔ اس عروج کے لوازم عبدیت (معلومیت) امانت، ولایت، خلافت ہیں۔ وحی۔ تعلیم لدنی معراج۔ معجزہ۔ دُعا۔ استغفار۔ شفاعت۔ صلواۃ وسلام۔ ایسے تعلقات بھی نبوّت کی تفصیل ہیں۔ جو علیٰ قدرِ مراتب اُمّت میں بطور فیضان تقسیم ہوتے ہیں۔ صدّیقین و مقربین جو قرآن میں اولیاء اللہ بھی کہلاتے ہیں، اُن کے علم و عمل سے نبوّت کے تحت حق و صدق کے انوار و برکات، حکمت کی راہ اُمّت میں پھیلتے رہتے ہیں۔

**(۴) نبوّت کی جہتیں** نبوّت میں دو جہتیں ہوتی ہیں۔ ایک مثلیت۔ دوسری فضیلت (فوقیت)۔ مثلیت کیا ہے۔ نزول تامّہ اِلَی الخلق۔ فضیلت کیا ہے۔ عروج تامّہ اِلَی الحق۔ نبی کی زندگی جو انتہائی عروج و نزول کے درمیان ہوتی ہے وہی اس کا مقام کہلاتی ہے۔ اس میں جس قدر وسعت ہوگی اسی قدر

یعنی حضورؐ کے عباد (غلاموں) کے لیے مایوسی نہیں۔ یہی فقرا کا مسلک ہے مولانا رومؒ بضمن سبب حرمانِ اشقیاء، دفتر اول مثنوی میں فرماتے ہیں:

بندۂ خود خواند احمد در رشاد
جملہ عالم را بخواں "قل یا عباد"

## (۲۰) نبی کی مثلیت و فضیلت

اللہ۔ رسول اللہ۔ اولیاء اللہ بیٹا! ہیں جہاں قلبِ مومن کو عروج عطا ہوتا ہے۔ دل کو جمع اور فرق کی تمیز حاصل ہو تو کیا کہنا۔ اس مقام کے احوال بھی عجیب ہیں۔ عروج و نزول کا دَور بندھا رہتا ہے۔ اور یہی جامعیت انسان کا کمال ہے۔ عروج و نزول کا ربط اور محل نہ سمجھنے سے ناواقف مغالطوں میں پھنستے ہیں تو افراط و تفریط میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ قرآن کریم کے کلام اللہ ہونے کی ایک بڑی دلیل قرآن میں یہ بیان ہوئی ہے کہ اس میں کہیں کوئی اختلاف نہیں۔ ارشاد ہے۔ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِندِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا (۴/۸۲) ترجمہ: اگر یہ (قرآن) اللہ کے سوا کسی اور کے پاس سے آتا تو اس میں بہت اختلاف پاتے۔ لیکن اگر اس دلیل کے باوجود کسی کو قرآن کریم میں اختلافات نظر آئیں کہ مختلف اعتبارات اس کے نزدیک تطبیق نہ پائیں۔ بلکہ متعارض ہو جائیں تو ظاہر ہے کہ یہ اس کی فہم اور اس کے علم کا قصور ہے ورنہ قرآن کریم اپنے دعویٰ میں سچا ہے۔

## عبدیت

خلاصہ یہ کہ عبدیت میں دیکھو تو معدوم کے سوا کچھ بھی نہیں لیکن امانت میں دیکھو تو سب کچھ موجود۔ پھر خلافت کا کیا کہنا کہ اس کے حق میں ملائکہ پر سجدہ واجب ہوا۔ تب ہی تو انسان کے سوا کائنات امانت کی برداشت سے معذور رہی۔ اور لطف یہ کہ خود

ہیں۔ خلاصہ یہ کہ نبوت کے یہی دو جہات مشرک و کافریں اور صدیقین و معرضین میں فرق پیدا کرتے ہیں۔

**(۵) فضیلت خصوصیت** غور کیجئے تو مثلیت کے پہلو بہ پہلو فضیلت خلقت کی عام خصوصیت ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے: اُنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ (۱۵پ) ترجمہ: دیکھو ہم نے ایک کو دوسرے پر کیسی فوقیت دی ہے۔ انبیاء و رسل میں بھی ایک دوسرے کے مقابل فضیلت رہتی ہے۔ نبی یا رسول کو دوسروں کے مقابل س درجہ فضیلت حاصل رہے گی۔ اور پھر خاتم النبیین، رسول کریم کو سب کے مقابل کس درجہ فضیلت حاصل ہوگی، قیاس سے باہر ہے۔ ظلمت میں شرح صدر ہو تو ربوبیت کے نور سے عبدیت منکشف ہو جاتی ہے عبدیت ربوبیت کے تابع رہتی ہے اور رسالت توحید کی تعلیم بن جاتی ہے۔ اصل توحید وہی ہے جو عبدہٗ و رسولہٗ کی اتباع و تعظیم سے حاصل ہوتی ہے۔

**(۶) مثلیت کی حکمت** جب نبوت کے ذیل میں صدیقین کو فضیلت کا عروج نصیب ہوتا ہے تو انتہائے عروج پر مثلیت توازن برقرار رکھتی ہے۔ مثلیت کی سب سے اعلیٰ یہی حکمت ہے کہ مانع شرک ہے۔ اور اللہ تعالیٰ مثلیت سے پاک ہے۔ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ (۲۵پ) کوئی چیز اس کے مانند نہیں لیکن جب مبتدی اور متوسط مثلیت سے اکتائیں تو فضیلت پر توجہ لازم ہے کہ دل میں عروج کی تحریک پیدا ہو ایک جماعت کا مقام فضیلت رہتا ہے۔ بقدر ضرورت وہ مثلیت کی طرف التفات کرتے ہیں۔ دوسری جماعت کا مقام مثلیت رہتا ہے کہ گویا اس سے

نبی کی شخصیت میں امامت و خلافت کا ظہور کامل ہوگا۔ چنانچہ حضور اکرم کا مقام مَقَامًا مَّحْمُوْدًا (۱۵/۹) ہے۔ جو انسان کا اعلیٰ ترین مقام عظمت ہے۔ مثلیت میں مجانست قائم ہو کر تعلیم و تبلیغ کی صورت پیدا ہوتی ہے۔ فضیلت میں ادب و اتباع اور تعظیم و محبت سے عروج کی راہ ملتی ہے۔ مشرک مثلیت فراموش کر دیتے ہیں فضیلت میں عبداللہ کو اللہ، یا اوتار، اللہ کا بیٹا، بی بی کہہ دیتے ہیں۔ چنانچہ یہود و نصاریٰ حضرت عزیرؑ اور حضرت عیسیٰؑ کو اللہ کا بیٹا کہتے ہیں۔ اس کی ایک صورت اوتار کا عقیدہ ہے۔ اس کے برعکس کافر نبی کی فضیلت سے انکار کرتے ہیں۔ اور مثلیت میں نبی (عبداللہ) کو اپنا جیسا قرار دیتے ہیں۔ اور کہتے ہیں: مَا نَرَاكَ إِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا (۱۲/۲۷) مَا هٰذَا إِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ (۱۸/۲) یعنی یہ تو تمہاری طرح معمولی آدمی ہیں۔

لیکن نبی تحت امر اپنے حق میں مثلیت و فضیلت دونوں کا اعلان کرتے ہیں۔ البتہ مثلیت کا اعلان سادہ، عام فہم ہوتا ہے۔ اور فضیلت کا اعلان بلحاظ رفعت و جامعیت عالمانہ ہوتا ہے۔ اور یہ فرق ہر دو محل کے اقتضا کا جزو لاینفک ہے۔ قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ أَنَّمَا إِلٰهُكُمْ إِلٰهٌ وَّاحِدٌ (۱۶/۴) ترجمہ: کہہ میں تمہاری طرح ایک بشر ہوں کہ میری طرف وحی کی جاتی ہے کہ تمہارا معبود معبودِ واحد ہے۔ جو مسلم ہیں وہ مثلیت و فضیلت دونوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ پھر بھی فرق رہتا ہے کہ صادقین مثلیت کا اقرار کر کے فضیلت پر اصرار کرتے ہیں کہ وہ عروج کی صورت ہے لیکن معترضین دبی زبان سے فضیلت کا اقرار کریں بھی تو مثلیت پر بڑا اصرار کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ عروج سے غافل ہو کر تنزل میں پھنس جاتے

حضرت زکریاؑ نے دعا مانگی۔ فَهَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا يَّرِثُنِيْ وَيَرِثُ مِنْ اٰلِ يَعْقُوْبَ (۱۶/۴) چنانچہ حضرت یحییٰؑ نبی عطا ہوئے۔

**(۲) نبی۔ رسول** قرآن شریف میں انتہائی انعام کے لیے دو لفظ مستعمل ہیں۔ ایک نبی دوسرا رسول۔ قرآن نے بعض کو صرف نبی کہا۔ اور بعض کو نبی اور رسول دونوں کہہ دیا۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول کا لفظ خاص ہے اور نبی کا لفظ عام ہے۔ سب جانتے ہیں۔ عام وہ ہے جس میں خاص داخل ہے۔ لیکن خاص میں عام داخل نہیں ہوا کرتا مثلاً اگر کہیں کہ عام دعوت ہے تو بادشاہ سے لے کر فقیر تک دعوت میں جا سکتا ہے۔ لیکن اگر کہیں کہ خاص دعوت ہے تو عام لوگ نہیں شریک ہو سکتے۔ خاص مدعو ہی جا سکیں گے۔ چنانچہ آیات ملاحظہ ہوں۔

(۱) وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيّٖنَ عَلٰى بَعْضٍ وَّاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا (۱۵/۹)

ترجمہ: ہم نے بعض انبیاء کو بعض پر فضیلت دی۔ اور داؤد کو کتاب زبور دی۔ ارشاد ہے

(۲) تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ (۳/۲) ہم نے بعض رسولوں کو بعض پر فضیلت دی۔

(۳) وَوَهَبْنَا لَهٗ مِنْ رَّحْمَتِنَآ اَخَاهُ هٰرُوْنَ نَبِيًّا (۱۶/۷) ہم نے موسیٰ کو اپنی رحمت سے اُس کا بھائی ہارون نبی دیا۔

(۴) وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مُوْسٰى۔ اِنَّهٗ كَانَ مُخْلَصًا وَّكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا (۱۶/۷) اور کتاب میں موسیٰ کا ذکر کرو۔ وہ برگزیدہ تھا اور رسول اور نبی تھا۔ نمبر ۳، ۴ آیتوں سے معلوم ہوا کہ نبی کا لفظ عام ہے۔ رسول کا خاص ہے۔ یعنی حضرت ہارونؑ صرف نبی تھے۔ لیکن حضرت موسیٰؑ نبی اور رسول دونوں تھے یعنی نبوت سے رسالت کا مرتبہ بڑا ہے۔

بالاتر کوئی مقام نہیں۔ چنانچہ وہ فضیلت سے چکراتے ہیں۔ بدرجۂ مجبوری ایمان مانیں بھی تو عدم علم کے سبب وسوسۂ شرک سے گھبراتے ہیں۔ البتہ ان کا مرتبہ بڑا ہے جو مثلیت و فضیلت دونوں کو اپنے اپنے محل پر علی قدر مراتب ایک ساتھ ملحوظ رکھتے ہیں۔ (اقتباس از مقدمہ معروضہ للبرنی)

## (۲۱) ختم نبوت کی خاص تشریح

(خلاصۂ تقریر جلسۂ میلاد النبی منعقدہ ۲۰ ربیع الاول ۱۳۶۲ھ بمقام بادشاہی عاشور خانہ۔ حیدرآباد۔ انڈیا۔ زیر صدارت نواب ضیا یار جنگ مرحوم)

فرمایا۔ مجھے اچانک کل رات میرے مفوضہ عنوان فضائل نبوی کے خلاف "ختم نبوت" کا عنوان چھپا دیکھ کر تعجب ہوا۔ جی چاہا کہ عذر کر دوں لیکن دل شکنی کا خیال کر کے حاضر ہوا۔ ختم نبوت اسلام کا معرکۃ الآرا امتیازی مسئلہ ہے میں قرآن ہی سے بتاؤں گا۔ آیتیں پڑھتا جاؤں گا اور اس کا سیدھا سادھا ترجمہ پڑھوں گا۔ آپ خود تصفیہ فرماسکیں گے۔

**(۱) ہر نبی کی دعائے اولاد** قرآن شریف سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر نبی نے اولاد کی دعا مانگی۔ منشا یہ کہ ان کی اولاد میں نبوت کی سعادت رہے۔ اور علم الٰہی ان کی اولاد کے ذریعے پھیلے چنانچہ ان کی دعائیں مقبول ہوئیں۔ اور ان کی اولاد میں نبوت جاری رہی۔ تعمیر کعبہ کے وقت حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ کی دعا تھی۔ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ الخ (۱/۱۵) مقبولیت یہ کہ حضرت اسمٰعیل کی اولاد میں حضور انورؐ تشریف لائے۔ حضرت ابراہیمؑ کو دوسری بشارت یہ ملی۔ وَوَهَبْنَا لَهُ إِسْحٰقَ وَيَعْقُوبَ (۷/۱۹) حضرت ابراہیمؑ کو حضرت اسحٰقؑ عطا ہوئے پھر ان کو حضرت یعقوبؑ ملے۔ اسی طرح

اللہ نے علم کے باوجود گمراہ کیا۔ اس کے کان اور دل پر مہر کر دی اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا۔

ان دو آیتوں میں تین الفاظ مشترک ہیں۔ دل، کان، آنکھ جن کا عمل بند ہو جاتا ہے۔ دل اور کان پر ایسی مہر کر دی کہ اس کے اندر علمِ صحیح داخل نہیں ہو سکتا۔ باہر سے کوئی چیز دل اور کان میں داخل نہیں ہو سکتی یعنی بند ہو گئی۔ اس میں کوئی اضافہ ہو نہیں سکتا۔ اور آنکھوں پر پردہ ڈال دیا یعنی آنکھ نہیں دیکھ سکتی کوئی چیز باہر سے آنکھ میں نہیں آ سکتی چنانچہ سرکاری دفاتر میں بھی عام قاعدہ رہا کہ سب تحریر ختم ہونے کے بعد سرکاری مہر کی جاتی تھی تاکہ اس کے بعد کسی تحریر کا اضافہ نہ کیا جا سکے۔ چنانچہ آیتِ ذیل پر اب غور فرمائیں۔

**(۴) مردوں کا باپ ہونا** مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ۔ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا (۲۲/۲) محمد صلعم تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں۔ لیکن خدا کے رسول ہیں اور تمام نبیوں کے ختم کرنے والے ہیں۔ اور اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔

(اس آیت کے پڑھتے ہی سامعین کی ذوق سے عجب حالت ہو گئی کہ ہر طرف سے آوازیں آنے لگیں۔ سبحان اللہ۔ ماشاء اللہ۔ للمؤلف حلیم)

چونکہ محمد صلعم مردوں کے باپ نہ تھے۔ بلکہ رسول اللہ اور خاتم النبیین تھے اس لیے آپ کی نرینہ اولاد زندہ نہ رہی۔ بچپن ہی میں سب بچے اس عالم سے گزر گئے ورنہ ناممکن تھا کہ آپ جیسے افضل الرسل کی اولاد زندہ رہتی، رجل بنتی اور رسول و نبی نہ بنتی جب کہ ہر نبی کی اولاد میں دعا کے مطابق نبی یا رسول

(۵) وَوَهَبْنَا لَهٗ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ۔ وَكُلًّا جَعَلْنَا نَبِيًّا (۱۶) ہم نے ابراہیم کو اسحٰق اور یعقوب عطا کیا۔ اور ان دونوں کو نبی بنایا۔

(۶) وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ۔ اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا (۱۶) اور کتاب میں اسمٰعیل کا ذکر کرو وہ وعدہ کا سچا تھا اور رسول اور نبی تھا۔

(۷) وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِدْرِيْسَ۔ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا (۱۶) اور کتاب میں ادریس کا ذکر کرو۔ وہ صدیق نبی تھا۔

نمبر ۵، ۶، ۷ آیات سے مزید وضاحت ہوتی ہے کہ حضرت اسحٰقؑ، حضرت یعقوبؑ اور حضرت ادریسؑ نبی تھے۔ لیکن حضرت اسمٰعیلؑ رسول اور نبی تھے۔ حضور انورؐ کے متعلق ارشاد ہے۔ اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ (۹) جو (یہود) رسول نبی امی (محمدؐ) کی اتباع کرتے ہیں جن کا ذکر ان کے پاس تورات میں وہ پاتے ہیں۔

**(۳) ختم کی تعریف** اب صرف ختم کے معنی اور تعریف قرآن سے سمجھتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

(۱) خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ۔ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (۱) اللہ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر مہر کر دی اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے۔

(۲) اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً (۲۵) کیا دیکھا تو نے اس شخص کو جس نے اپنی خواہش کو اپنا معبود بنا لیا ہے۔ اور اس

پیغمبروں میں سے۔ پھر رسول کریمؐ کا علم کہ وہ اجْتَبٰی کے تاج اور ارْتَضٰی کے سرمایۂ ناز ہیں۔ معلّم ہیں اور کیسے معلّم۔ یُعَلِّمُکُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ وَیُعَلِّمُکُمْ مَّا لَمْ تَکُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ (۲/۲) تم کو کتاب وحکمت کی تعلیم کرتا ہے۔ تم کو وہ علم دیتا ہے جو تم نہیں جانتے۔ اسی لیے شرح صدر سے سرفراز ہیں۔ اَلَمْ نَشْرَحْ لَکَ صَدْرَکَ (۳۰/۱۹) وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا (۱۶/۱۵) ہر دم تازہ اُٹھان ہے۔ وَلَلْاٰخِرَۃُ خَیْرٌ لَّکَ مِنَ الْاُوْلٰی (۳۰/۱۸) تا ابد یہی شان ہے۔ لیکن یہ سب اللہ کا فیضان ہے۔ عبد بذاتہٖ فقیر ہے اور اُس کو یہی کہنا لازم ہے۔ لَا اَعْلَمُ الْغَیْبَ (۷/۱۱) بلکہ غیب وشہادت کی تفریق کیا یہ سب مدارج کا اعتبار ہے کہ ایک کی نظر میں جو غیب ہے دوسرے کی نظر میں وہ شہادت ہے۔ اور پھر شہادت میں کتنی ہی وسعت کیوں نہ ہو جائے غیب کی حد باقی رہتی ہے بہرحال جس درجہ کا جو علم ملتا ہے علیم سے ہی ملتا ہے۔ ورنہ علیم کے علم میں کون شریک ہو سکتا ہے۔ پس خلاصہ یہ ہے کہ هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ۔ عَالِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ۔ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ (۲۸/۲۲) یعنی اللہ غیب وشہادت کا عالم ہے۔ (صراط الحمید حصہ اول للبرقی ص۱۶۱)

**(۲۳) عربٌ بلا عینٍ کا مغالطہ**

بعض صوفیا نے رسول اللہؐ کے بارے میں عربٌ بلا عینٍ۔ احمدٌ بلا میمٍ کہہ دیا ہے۔ جب اصولاً حدیث تک کو قرآن کے مقابل ماننا لازم نہیں۔ تو اولیاء اللہ کے اقوال کو قرآن کے خلاف قبول کرنا کہاں تک مناسب ہے۔ اگر اولیاء اللہ کے یہ اقوال ہیں تو ہمارا اسلم طریق یہ ہے کہ نہ انکار می کنم۔ نہ ایں کار می کنم۔ ممکن ہے ان کی کوئی اصطلاح ہو۔ ہمارا قرآنی مسلک عبدیت ہے۔ اگر وہ لوگ اُلوہیت اختیار کر کے اَنَا الحق کہنا چاہتے ہیں تو کہنے دو۔ حضرت دادا پیر فرماتے ہیں:

بن گئے تھے۔ لیکن چونکہ نبوّت کو ختم ہونا تھا اس لیے آپؐ کی اولادِ نرینہ زندہ نہ رہی۔ صرف لڑکیاں زندہ رہیں۔ رَجُل کا لفظ پختہ مرد کے لیے بولا جاتا ہے نہ کہ صبی (بچہ) کے لیے۔ اِسی قرآنی تفسیر کے لحاظ سے نبوت پر آپ ایسی مہر بن گئے کہ نبوت میں اب کسی اضافہ کی گنجائش ہی نہ رہی۔ یعنی آپ کے بعد اب کوئی نبی نہیں ہوسکتا۔ جب کوئی نبی نہیں ہوسکتا تو رسول کا کیا ذکر ہے۔

البتہ اس نبوت کا منشا یعنی توحید و رسالت کی اشاعت کا کام آپ کی صاحبزادی حضرت خاتونِ جنتؓ کی اولاد سادات حسنی و حسینی کے ذریعے اس عالم میں پورا ہوا۔ جو عُلَمَاءُ اُمَّتِیْ کَاَنْبِیَاءِ بَنِیْ اِسْرَائِیْل کی روشن تفسیر بنے۔ کوئی غوثِ اعظمؒ بنا تو کوئی خواجۂ اعظمؒ۔ اور عالم میں قرآنی تعلیمات کو پھیلا دیا۔ (ایک اور موقع پر فرمایا۔ حضرت غوث اعظمؒ، حضرت خواجۂ اعظمؒ اور دیگر اکابر نے ختمِ نبوّت کے مسئلے کو مسلّمات میں جانا، مانا۔ اس لیے مسلمان اِس پر بحث کی ضرورت نہیں سمجھتے)

صدرِ جلسہ نواب ضیا یار جنگ جو خود بھی متبحر عالم تھے انھوں نے اس تقریر کے متعلق فرمایا۔ برنی صاحب! میں نے بہت سی تفسیریں دیکھی ہیں لیکن ختمِ نبوّت کی ایسی نادر اور لطیف تفسیر کہیں نہیں دیکھی۔ یہ آپ پر خاص انفتاح ہے ماشاء اللہ۔

## (۲۲) رسولؐ کا علمِ غیب

رسول رازداں نہ ہوں تو کون ہوگا۔

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَاءُ (۳/۴) عَالِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖ اَحَدًا اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ (۲۹/۱۲)

ترجمہ: اللہ عالم الغیب ہے نہیں خبر کرتا اپنے غیب پر کسی کو مگر جس کو پسند کرتا ہے۔

اس میں مزاج شناسی، حق شناسی اور اقتضا شناسی ہے۔

یا تو بچے بنے رہیں۔ اللہ سے لاڈ، پیار کریں۔ ذمہ داری نہیں رہتی۔ کہ قربِ نوافل کے مقام پر بندہ فاعل اور حق آلہ بن جاتا ہے یعنی اللہ ہاتھ پیر بن جاتا ہے۔ بچے تو ضد کر کے مٹھائیاں لیتے ہیں، کھلونے لیتے ہیں۔ یا بڑے بن جائیں تو ذمہ داریاں آئیں گی اور قربِ فرائض کا مقام ملے گا۔ حق فاعل اور بندہ آلہ بن جائے گا۔ یعنی بندہ مرضیٔ الٰہی کا مظہر بن جائے گا۔ اور اس کا فعل بمنزلۂ اللہ کا فعل و منشا ہو جائے گا۔ قربِ فرائض سے مُراد ذاتِ الٰہی سے متحقق ہونا ہے۔ قربِ نوافل سے مُراد صفاتِ الٰہی سے متصف ہونا ہے۔ اب وہ خلیفہ بنتا ہے اور مامور ہو کر جانشینی کے فرائض ادا کرتا ہے۔

غرض مقامِ قرب کی نزاکتیں بہت ہیں۔ اپنا ارادہ کچھ نہ ہو۔ فعل تحت ارادۃ اللہ ہو۔ مامور ہو کر سب کچھ کرے۔ ورنہ ارادت و سعی کے مقامات جہاں انیت چلتی ہے پیچھے کے ہیں۔ ہر عمل اپنے محل پر اچھا ہے۔ ایک محل پر کسی کا علم و عمل درست ہوتا ہے تو دوسرے محل والے کے لیے وہی چیز غلط ہوتی ہے۔ آج کل جوہری توانائی کے تجربے خانوں میں کام کرنے والوں کو اتنی احتیاط لازم ہے کہ وہ سانس بھی احتیاط سے لیتے ہیں تاکہ دھماکہ نہ ہو۔ لیکن نیچے کے محل پر چولہا پھونکتے رہیں تو فکر نہیں۔ ایک محل پر پھونکیں مارنا درست، تو دوسرے محل پر دم بخود رہنا لازم۔ اسی طرح اعلیٰ مقامِ قرب پر بندے بے ارادہ دم بخود رہتے ہیں۔ اور منشائے الٰہی کو دیکھتے رہتے ہیں۔ جو لوگ قرب کے حدود میں رہتے ہیں چاہے چوبدار ہی کیوں نہ ہوں ان کے احکام الگ ہیں۔ وہ ہر وقت بادشاہ کی دید میں لگے ہیں۔ قرب کے حدود کے باہر اعلیٰ سے اعلیٰ عہدہ داروں کے لیے وہ نزاکتیں اور احکام

اَنَا الْعَبْدُ بول کر ہونا مُحَمَّدؐ
اَنَا الْحَقُّ بول کیوں منصور ہونا

**(۲۴) قربِ فرائض۔ قربِ نوافل** طبائع مختلف ہوتے ہیں۔ بعض سالکین خطرات کی تمیز کے بارے میں قربِ فرائض کے مقام پر رہتے ہیں۔ یعنی ان کا ارادہ ہی نہیں ہوتا۔ وہ مُردہ بدستِ زندہ ہوتے ہیں۔ حق فاعل (خالقِ فعل) اور وہ آلہ (کارِ فعل) ہوتے ہیں۔ دوسرے لوگ قربِ نوافل کے مقام پر ہوتے ہیں۔ وہ ارادہ رکھتے ہیں۔ خود فاعل (کاسبِ فعل) ہوتے ہیں اور حق کا تخلیقی فیضان بمنزلہ آلہ ہوتا ہے۔ اور بعض دونوں حالتیں رکھتے ہیں۔ کبھی وہ قربِ فرائض کے تحت عمل کرتے ہیں، کبھی قربِ نوافل کے تحت عمل کرتے ہیں۔ مطلب یہ کہ ان کا مقام کوئی ایک یعنی قربِ فرائض یا قربِ نوافل ہوتا ہے۔ لیکن اپنے مقام سے عروج و نزول کیا کرتے ہیں۔ عبدیت سے متحقق ہونے کے بعد ذوق سے یہ سب چیزیں حاصل ہوتی ہیں۔

ہر ایک کا ربط مختلف ہوتا ہے۔ کسی محل پر فضل و فیض کو مُقیّد نہ سمجھیں۔ بعض کے لیے تبدیلِ مقام کی خاطر ارادتاً دُعا مناسب ہے۔ لیکن کسی کی اصلاح و ترقی مقصود ہو تو بے ارادتی پیدا کرنے کے لیے اس کے خلاف کیا جاتا ہے۔ مثلاً قربِ نوافل والے کو قربِ فرائض کے مقام پر ترقی دینی ہو تو ہر چیز مخالف ہو جائے گی۔ یا تو قربِ نوافل میں حق تعالیٰ اس کے ہاتھ پیر ہو کر ہر خواہش کو پورا کرتے ہیں۔ یا قربِ فرائض میں بندہ حق تعالیٰ کا ہاتھ پیر ہو کر یَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ (۱۶/۵۰) (جو حکم ہو وہ تعمیل کرتے ہیں) میں آجاتا ہے۔ اپنا ارادہ نہیں رکھتا۔ بظاہر تعطّل معلوم ہوتا ہے لیکن وہ منشاءِ وامرِ الٰہی کے تحت ہوتا ہے۔

لوگ تحت امر اور غیر تحت امر کا راز نہیں سمجھتے۔ بے کمالی اور امانت
کا اعتبار عالی ہے۔ کمالات وکرامات میں بڑے دھوکے ہیں۔ نفس پھولتا
ہے۔ ان کے ذکر میں فخر آتا ہے۔ دراصل بے کمالی مقام ہونا چاہیئے۔ اس
کے بعد کمالات ظاہر ہوں تو اِسے فضل جانے گا۔ فخر نہیں کرے گا۔ الحمدللہ
کہے گا۔ اس کے بعد حکم ہو تو حضرت غوثِ اعظمؒ کی طرح کمالات وکرامات کا
ذکر کرے گا۔ ورنہ خاموش رہے گا۔

### (۲۶) عبدیت بمعنی مرضی شناسی

عبدیت کے معنی اللہ تعالیٰ کی مرضی شناسی کے ہیں۔ لوگ صبر یا شکر
کے مقام کی فکر میں رہتے ہیں حالانکہ قرآن میں انبیاء کے احوال پڑھنے سے
معلوم ہوتا ہے کہ کوئی مقام مطلوب نہ رہے۔ بلکہ بندہ کو مرضئ الٰہی کے تابع
رہنا چاہیئے جو سب سے بڑی ترقی اور قرب ہے۔ اگر ان کا منشا ہو کہ ہم روتے
رہیں تو رویا کریں۔ ان کا منشا ہو کہ ہنسیں تو ہنسا کریں۔ ان کا ایما ہو کہ
تڑپیں، تو تڑپا کریں۔ ان کی مرضی ہو کہ شکوہ کریں تو شکوہ کریں۔ ان کا
مطلوب ہو کہ صبر یا شکر کریں تو وہی کریں۔ اسی لیے رونے میں حق کی
مرضی دیکھی تو حضرت یعقوبؑ نے رو رو کر آنکھیں کھو دیں۔ سلیمان علیہ السلام
نے حکومت کی کیا کیا شانیں دکھائیں۔ حضرت موسیٰؑ نے تو یہ تک کہہ دیا
اِنْ هِيَ اِلَّا فِتْنَتُكَ (۹) یعنی یہ سب آپ کا فتنہ ہے۔

کیا یہ امر واقعہ نہیں کہ ہم اپنے ساتھ قابل تر اور بہتر آدمی نہیں
چاہتے، بلکہ صرف ایسا آدمی چاہتے ہیں جو ہمارے منشا، مرضی اور فطرت
کے مطابق ہو۔ اور جیسا ہم چاہیں وہ کرتا رہے۔ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ
فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا (۲) کا قانون محکم ہے (ترجمہ: اختیار کرو اللہ کی فطرت

نہیں رہتے۔

**(۲۵) بے ارادتی۔ ارادت** ایک خطرہ مِنَ اللہ دل میں آتا ہے۔ گویا ٹیلیفون کال ہوتا ہے۔ اس کی تعمیل میں بڑی فتح و برکت ہوتی ہے۔ اس کی قدر اور تمیز نہ ہو تو خطرہ بند ہو جاتا ہے۔ عبدیت بے ارادتی کا نام ہے۔ یہ قادری سُلوک ہے۔ انبیاءؑ تک کا یہی مقام ہے عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ کہا گیا، نہ کہ رَسُوْلُہٗ وَعَبْدُہٗ۔ حضورؐ کی عبدیت کا مرتبہ رسالت سے بڑھ کر ہے۔ عبدیت ذات کی مظہر ہے اور رسالت علم کا مظہر ہے۔ عبد کے پاس ہر چیز رب کی ہوتی ہے۔ جب اس امانت میں صادق ہو جائے تو خلافت عطا ہوتی ہے۔ اللہ کا نائب بنتا ہے۔ اس کے بعد جتنے اختیارات عطا ہوتے ہیں انھیں امانت جان کر استعمال کرتا ہے۔ ہر چیز کو حق کی جانتا ہے۔ بے ارادتی دراصل سرکاری حیثیت کا نام ہے۔ اور ارادت میں خانگی حیثیت رہتی ہے جس میں ذمہ داری رہتی ہے۔ کوئی ہمیں ہاتھی دے تو یہ نعمت ہے۔ لیکن اس کی حفاظت و پرورش ایک مصیبت ہے۔ اس کے برخلاف ایک شاہی ملازم ہے جس کو جب ضرورت ہو سرکاری ہاتھی سواری کے لیے ملتا ہے۔ پالنے کی دردِ سری سے آزاد ہے۔ اللہ کے بنے رہو۔ بے ارادہ رہو تو ہر حال میں سکون ہے ورنہ حیرانی ہوگی۔ ایک معمولی سپاہی تحت امر رہتا ہے تو اس کے ہاتھ اُٹھانے پر دور دور تک کا موٹر رُک جاتا ہے، ورنہ اس کے خلاف قانونی کارروائی ہو سکتی ہے۔ اس کے برخلاف اگر بڑا زمیندار یا جاگیردار بھی کسی کا موٹر روکے تو اس کا یہ عمل خانگی حیثیت میں ہوگا۔ اور کسی کے لیے اس کی تعمیل ضروری نہ ہوگی اور وہ مجرم ہوگا۔

ایک صاحب توحید کے مدعی ہیں۔ انھوں نے لکھ دیا۔ میں نہ بندہ ہوں نہ مولا ہوں۔ یہ علم باطل ہے۔ عبدیت تو پکی ہے اور اعلیٰ مقام ہے جس کی قرآن نے تعلیم دی ہے۔ یاد رکھو ہماری رسائی علم کی حد تک ہے۔ اس کے اوپر کا کسی کو علم نہیں۔ ہم علمِ الٰہی میں صرف معلوم ہیں۔ معلومیت ہی عبدیت ہے یعنی علمِ الٰہی میں صرف ہمارا ثبوت ہے، وجود نہیں۔ اس کے آگے مقامِ احدیت ہے۔ وہاں پر علم و صفات کو جگہ نہیں۔ یعنی تفصیل نہیں۔ بعض اولیاء نے اگر اس قسم کی بات کہی ہے تو احدیت کی طرف صرف اشارہ ہے کہ وہاں عبد کا پتہ نہیں۔ نہ یہ کہ ہم عبد نہیں۔ اس قسم کی تعلیم باطل ہے۔ گمراہی ہے۔

## (۲۸) عینیت، غیریت

مخلوق میں وجودِ مطلق کا اعتبار لے کر بلحاظ غیریتِ ذات وجوداً عین کہنا گویا ادنا ذالاعلم ہے جو صحیح نہیں۔ ایسے صوفی دراصل شرک میں مبتلا رہتے ہیں۔ یہ اللہ کی ایک مار ہے۔ البتہ اولیاء اللہ کو بندہ جان کر، اسماء و صفاتِ الٰہی کا مظہر دیکھنا، محترم، معظم سمجھنا عینِ توحید ہے۔ وجود یا عینِ وجود کی اصطلاحات میں احتیاط لازم ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ ان میں وجود کا ظہور ہے، فیضان ہے کیونکہ وجود کے حصے نہیں ہوا کرتے۔ اللہ تعالیٰ کے ثعلق سے وجود عینِ ذات ہے۔ صفت بھی کہنا مشکل ہے۔ ہمارے لیئے یعنی بندے کے لیے وجود زائد بر ذات ہے۔ اور یہی اسلم طریق ہے۔ ورنہ اگر علم صحیح نہ ہو تو مشرک یا ملحد ہو جائے گا۔ بعض لوگ توحید کو کان کی چیز سمجھتے ہیں حالانکہ قرآن توحید کو ڈنکے کی چوٹ بیان کرتا ہے۔ اصل شں توحید شرحِ صدر کی چیز ہے۔ بحث اور منطق کی نہیں۔ اللہ کھولے

جس پر لوگوں کو پیدا کیا) اللہ کے ساتھ بھی بندہ کا یہی ربط ہونا چاہیے۔

(۲۷) توحید مُبین

فرمایا۔ دوسرے حج کے موقع پر، عالمِ اسلام کے بڑے بڑے مشاہیر سے ملاقات ہوئی۔ مثلاً حضرت عبدالحی کتانی۔ فاس، مُلائے شور بازار افغانستان وغیرہ۔ اور توحید پر گفتگو رہی۔ میں نے اپنے سلسلے کی خاص تعلیم کی روشنی میں اپنے اعتبارات توحید کو پیش کیا تو سب نے بہ اتفاق آراء فرمایا "آپ کی توحید سب سے زیادہ واضح، محکم، بیّن ہے۔ آج کل یہ خصوصیت اکثر صاحبانِ سلسلہ کو نصیب نہیں۔ ھٰذا مِنْ فَضْلِ رَبِّیْ۔

بعض سلسلوں میں غیریت کا پلڑا اکثر وزنی رہا کرتا ہے۔ تعلیم کے لحاظ سے بھی، اور واقعیت کے لحاظ سے بھی۔ لیکن ہمارے پاس تعلیم و واقعیت ہر لحاظ سے غیریت و عینیت کا بیان واضح، یقینی، قطعی ہوتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ بعض صاحبانِ احوال کو ملحوظیت نہ رہتی ہو۔ ورنہ واقعیت میں کلام نہیں۔

حیدرآباد میں ایک صوفی تھے۔ اِلحادی تعلیم دیتے تھے۔ اکثر مجمعوں میں کہتے۔ دیکھو۔ یہ اللہ میاں کی ڈاڑھی۔ اللہ میاں کا ہاتھ۔ ایک دفعہ وہ گُردہ کے درد میں مُبتلا ہوئے۔ میں نے اپنے دوست سے کہلایا صوفی صاحب سے پوچھنا۔ اب غیریت کا زیادہ احساس ہے یا عینیت کا۔ جواب دیا۔ غیریت زیادہ ملحوظ ہے۔ میں نے کہا۔ پھر ایسی غلط توحید کا کیا حاصل۔ وہ ایک عروجی رُخ ہے، حالِ شُہُود ہے جس میں غیر کی ملحوظیت و مشہودیت نہیں رہتی۔ نہ کہ غیر ہی نہیں ہے۔ یہ ایک نازک فرق ہے۔ ذرا غلطی کریں تو دھڑام سے اِلحاد میں گر جائیں۔

**(۲۹) تصورِ ذات**

ایک صاحب نے پوچھا۔ آپ ذات کا تصور کس طرح کرتے ہیں۔ فرمایا۔ وہ خدا ہی کیا جو میرے تصور میں آجائے، وہ تو میری مخلوق ہوگی۔ قرآن نے جیسا بتایا ویسا رہنا چاہئے۔ قرآن کہتا ہے۔ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ (۲۹/۲) ہر چیز معلومِ اللہ ہے اپنی معلومیت کھل جائے تو بڑی بات ہے۔ ستم ظریفی ہے کہ یافت و شہود کا کورس بنا کر اللہ کو سمجھنے چلے ہیں۔ خود محیط اور اللہ کو محاط بنا رہے ہیں اپنے کو اللہ کا مُقَوّم ثابت کر رہے ہیں۔ اس سے بڑھ کر کوئی شرک ہو سکتا ہے؟ لیکن بعض لوگ ہیں کہ اسی کو توحید سمجھتے ہیں۔ اور دوسروں کو اگر اپنے محلِ عدم وجہل و معلومیت کے مقام پر توحید نظر آئے تو اسے یہ حضرات بدعت و محرومیت سمجھتے ہیں۔ اس تفہیم پر وہ صاحب پھڑک اُٹھے اور کہا۔ میرا سارا ایمان دھل گیا۔ آپ نے کورا بنا دیا۔ الحمد للہ۔

**(۳۰) یافتِ ذات کے دھوکے**

یہ عالم تعینات ہے۔ یہاں تجلیات پر نظر لازمی ہے۔ اگر یہ مقصود نہ ہوتا تو ہمیں تجرید (روح) کے مقام پر ہی رکھا جاتا۔ یہاں کیوں آتے۔ انبیاءؑ اولیا نے دنیا میں شادیاں کیں تاکہ عالم شہادت کی تجلّیات کو دیکھیں ورنہ تکمیل نہ ہوتی۔ صحیح علم و نظر مشکل ہے جو اللہ کے فضل سے ملتی ہے بلا تعینات و آثار ذات کی یافت کا خیال محض دھوکا ہے۔ اس طرح جو لوگ صرف مسمّیٰ سے ربط پیدا کرنا چاہتے ہیں، وہ گویا سارے اسماء و صفات کے مظاہر کو باطل ٹھیراتے ہیں جو رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا (۱۱/۳) کے خلاف ہے یعنی اے رب آپ نے اس کو بے فائدہ نہیں پیدا کیا۔

دراصل یہ لوگ اپنے خیال کی یافت یعنی اپنی تجرید خیالی کو ذات کی

تو ملے۔

لوگ عینیت اپنے اوپر طاری کرنا چاہتے ہیں۔ یہ چیز طاری کرنے کی نہیں۔ بلکہ اللہ کی طرف سے انعاماً عطا کی جاتی ہے۔ غیریت محبوب خداوندی ہے۔ اور اس غیریت میں اسمائے الٰہی کا ظہور ہے۔ اس لیے ارادتاً عینیت طاری کرنا نامناسب ہے۔ ہر آن قرآن میں غرق رہ کر ہوش سنبھالے رہیں۔

یافت و شہود کی حد و انتہا نہیں۔ لیکن بعض نادانی سے سمجھتے ہیں ہم کو یافت و شہود حاصل ہوا۔ علم کامل ہو گیا حالانکہ علم کی انتہا نہیں۔ وَفَوْقَ کُلِّ ذِیْ عِلْمٍ عَلِیْمٌ (۱۲/۷۶)

علم صحیح سب سے بڑی نعمت ہے جس کی قدر نہیں۔ لوگ کمالات کشف چاہتے ہیں جس میں سوائے تصور، تخیل، تقلید کے کچھ نہیں اپنے حال اور عمل سے علم صحیح کی مطابقت کرنا، اور عالم شہادت کے ظہورات کو قرآن کی روشنی میں سمجھنا اور مشاہدہ کرنا ہمارے سلسلے کی تعلیم کا خاص وصف ہے۔ خواب کی تعبیر کے لیے تاویل چاہئیے۔ یہاں شہادت میں ہر چیز دیکھ لو، سمجھ لو، قرآن کے تحت، آیات کے مطابق۔ بہتوں کے پاس اس سے ہٹ کر تصورات اور خواب پر اپنے علم و عمل کا دار و مدار ہے۔ لیکن ایسے ہی لوگ زیادہ پائے جاتے ہیں۔ اور علم صحیح کے طالب صادق اور مخلص کم ہیں۔ علم صحیح کی مثال پانی کی ہے۔ بے رنگ۔ بے مزہ۔ اکثر لوگ لذیذ شربت کا رنگ و مزہ چاہتے ہیں۔ لیکن پانی کی بات کہاں جو حیات کا باعث ہے۔ لیکن بعض بیماروں کو پانی کڑوا معلوم ہوتا ہے تو ان کے مناسب چیز دینی پڑتی ہے۔ یہ پانی کی خرابی نہیں بلکہ ان کے مزاج کی خرابی ہے۔

**(۳۱) یافت و شہود و محویت** بعض لوگ یافت و شہود و محویت کے لیے خاص وقت میں کچھ دیر کے لیے خیال باندھ کر بیٹھتے ہیں۔ حالانکہ کل وقت یہ حال ہونا چاہیے کہ گویا مچھلی کی طرح پانی میں ہیں۔ یہ تک محسوس نہ ہو کہ یافت ہے، شہود ہے۔ اگر محویت ہی کسی کا مقصود ہو تو یہ کوئی امتیازی چیز نہیں۔ بعض اشراقیوں کو دس دس برس تک محویت رہتی ہے۔ حتیٰ کہ سانپ بچھو کے کاٹنے کا بھی احساس نہیں ہوتا۔ یہاں تو کیڑوں، مکوڑوں سے محویت ہوا ہو جائے گی۔ علم صحیح کے بعد چوبیس گھنٹے علم میں محویت ہونی چاہیئے۔ یہ اسلام کا امتیازی کمال ہے جس کے لیے خاص وقت کی ضرورت نہیں۔ ہر آن، ہر محل یہ محویت ہونی چاہیے۔ کہیں صبر کے ذریعے، کہیں شکر کے ذریعے، کہیں تڑپ کے ذریعے۔ بہر حال حق کے منشا کی تعمیل میں محو رہیں، منہمک رہیں۔

غلط قسم کی محویت کے بارے میں بڑے بڑوں نے اعتراف کیا ہے کہ وہ عرصے تک تجرید روحانی کو یافت و شہود سمجھتے رہے۔ کچھ لوگ ہوتے ہیں کہ اپنے خیالی نور کو خدا سمجھ کر خوش ہوتے ہیں۔ فقر و فاقہ، کمزوری اور غنودگی میں اُن کی آنکھیں چکاچوند ہو جاتی ہیں۔ یا روشنیاں نظر آتی ہیں تو اُسے وہ نورِ الٰہی اور وجود کا کھلنا سمجھتے ہیں۔ حالانکہ اس کو شہودِ حق سے کوئی تعلق نہیں۔ ہر آن وہ علم قرآنی ملے جس میں تضییق و تاویل نہ ہو۔ فطرت کے مطابق ہدایتی نور کھلے اور ہمارا ہر علم و عمل کسی آیت کی تفسیر بن جائے۔ یہ ہے اصل ہدایت و نور کا کھلنا، گویا کل وقت پانی میں تیر رہے ہیں۔ یہ کیا کہ تھوڑی دیر پانی کا خیال کیا کہ سردی ہونے لگی، ورنہ کچھ نہیں۔ کشف و عقل، وہب و کسب میں زمین آسمان کا فرق

عمل ود ؟

[illegible]

یافت کہتے ہیں۔ نفس میں بلا کی تجرید اور اطلاقیت ہے جس سے یکسوئی اور ربودگی حاصل ہوتی ہے۔ اس کے بعد قلب میں اور پھر روح میں تجرید سے اطلاقیت ہے۔ روح مخلوق اور حادث ہے۔ اس میں غیر معمولی نورانیت ہے۔ عالم امر کے کن فیکونی آثار پیدا ہو جاتے ہیں اس لیے روح کی یافت کو غلطی سے اکثر حق کی یافت سمجھتے ہیں۔ نفس، دل، روح کی تجرید مومن و کافر میں مشترک ہے۔ دراصل مومن کی امتیازی خصوصیت ایمان، علم صحیح اور بے ارادتی ہے جس سے حق کھلنا شروع ہوتا ہے۔ فراست ایمان کا لازمہ ہے۔ یہ کیسی بات کہ یافت تو ذات کی ہے لیکن موٹی موٹی چیزیں اتنی بھی نظر نہیں آتیں جتنی دنیادار کو۔ اور نیچے کے مقامات میں دھکے کھاتے پھرتے ہیں۔

یہ لوگ احادیث و قرآن کو اپنے خیال پر ڈھالتے ہیں حالانکہ اپنے خیال کو قرآن و حدیث پر ڈھالنا چاہیے۔ بکثرت آیات توحید سے بھری ہوئی ہیں جن سے کس طرح آنکھ بند کریں گے۔ اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ الخ (۳/۱۱) لیکن ان تجلیات میں انھیں شرک نظر آتا ہے حالانکہ اسی میں اصلی توحید ہے ورنہ دھوکا ہے۔

ذات کے مقام کے اولیاء اللہ شاذ ہیں۔ ورنہ اکثر غلطی سے ایسا سمجھتے ہیں۔ اکثروں کو ایک دو اسم سے خاص مناسبت ہوتی ہے اور وہ اس کا مظہر ہوتے ہیں۔ بعض اولیاء اللہ کو خود اپنے مقام کا علم نہیں ہوتا لیکن عمل جاری رہتا ہے۔ یہ مسلم ہے۔ بعض علم و عمل دونوں کے جامع ہوتے ہیں لیکن بیان نہیں کر سکتے۔ بعض کو قوت بیانیہ بھی حاصل رہتی ہے۔ جامعیت کم ہوتی ہے اور مشکل ہے۔

ہدایت سے محرومیت کو ضلالت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اِس طرح مُمیت، مضل اور ضار وغیرہ کوئی حقیقی ایجابی اسماءِ حُسنیٰ نہیں۔ اور نہ اس کا استعمال مناسب ہے۔ اللہ کس کو مارے گا، فنا کرے گا جب ہر چیز ہالک و فانی ہے۔ مرے کو کیا مارے۔ دراصل اسم حی و قیوم کے عدم اظہار کی اِس طرح تعبیر کی جاتی ہے۔

## (۳۳) رحمٰن۔ قرآن۔ اِنسان

اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ۔ خَلَقَ الْاِنْسَانَ عَلَّمَهُ الْبَیَانَ (۲۷/۱۱) ترجمہ رحمٰن نے قرآن سکھایا۔ انسان کو پیدا کیا۔ اور اِس کو بیان سکھایا۔ اِن آیات کے متعلق مفسّرین نے سوال اُٹھایا ہے کہ تخلیقِ انسانی سے پہلے کس کو قرآن پڑھایا۔ میرے قلب میں آیا۔ رسولِ کریمؐ قرآن کے حامل بن کر آئے قرآن کے معنی علم کے ہیں۔ اِسی آیت کے لحاظ سے حضورؐ کی حقیقت، بطون کے لحاظ سے، اِس عالم کی تخلیق سے پہلے، علم و قرآن ثابت ہوئی۔ پھر انسان کو قرآن کے بیان کے لیے پیدا کیا اور بیان سکھایا۔ جبریلؑ اور آدمؑ وغیرہ تو بعد کو علم و وحی لائے۔ لیکن دراصل پہلے ہی سے اپنے محل پر علم (حقیقتِ محمّدی) موجود تھا۔ البتہ اس عالم میں جسمانی لحاظ سے حضورِ انورؐ کا ظہور بعد کو ہُوا۔ یاد رکھو۔ انسان سے اصالۃً مراد انسانِ کامل یعنی رسولِ کریمؐ کی ذاتِ مبارک ہے۔ جو عقیدت و محبت ہی کے لحاظ سے نہیں، بلکہ حقیقت کے لحاظ سے ہے۔ ان ہی قرآنی آیات کی روشنی میں ساری احادیثِ رسالت سمجھ میں آتی ہیں۔ مثلاً اَنَا مِنْ نُوْرِ اللّٰہِ وَکُلُّ شَیْءٍ مِّنْ نُّوْرِیْ۔ کُنْتُ نَبِیًّا وَّ اٰدَمُ بَیْنَ الْمَاءِ وَالطِّیْنِ عارفین بھی یہی کہتے ہیں کہ انسانِ کامل (بالذّات) حضورِ انورؐ ہیں۔ اسی لیے ملائکہ کا سجدہ اصلاً صرف آدم کو نہیں بلکہ حضورِ انورؐ کو تھا۔ اس پر نا چیز نے عرض کیا۔ قرآن میں تو آدمؑ کو سجدہ کا ذکر ہے۔ فرمایا۔ علم اور قرآن حضورؐ کی

رہے ہے۔ اسرار قرآنی شرح صدر سے کھلتے ہیں۔ اور حضورؐ کی محبت کا ثمرہ کن فیکون ہو جاتا ہے۔

**(۳۴) اسمائے حُسنیٰ** فرمایا۔ ارشاد باری ہے: وَلِلّٰهِ الْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْۤ اَسْمَآئِهٖ (۹/۱۲) ترجمہ:۔ اچھے اچھے نام اللہ ہی کے لیے ہیں۔ پس ان ناموں سے اس کو پکارو۔ اور چھوڑ دو ان کو جو اس کے ناموں میں کج راہی کرتے ہیں۔ بعض اس قرآنی علم کی نزاکت کے فہم کے بغیر اللہ تعالیٰ کے لیے ایسے اسماء بولتے ہیں جو اسمائے حسنیٰ کے منافی ہیں اس میں ادب و احتیاط لازم ہے۔ اللہ، حی، علیم، مرید، قدیر، سمیع بصیر، کلیم، ہادی وغیرہ اللہ کے اسمائے حسنیٰ ہیں۔ اور قرآن مجید میں بعض مقامات پر آیا ہے۔ هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ (۱۱/۱۱) وہ جِلاتا ہے اور مارتا ہے۔ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ (۲۹/۱۵) اللہ گمراہ کرتا ہے جس کو چاہتا ہے۔ اس بنا پر اللہ تعالیٰ کے لیے ممیت و مضل کے اسماء بعض بولتے ہیں لیکن اس کا صحیح فہم کاملین اولیاء اللہ کی صحبت ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ ورنہ مغالطہ اور گمراہی میں پڑ جانے کا اندیشہ ہے۔ سمجھنے کی بات یہ ہے کہ حی، محی، ہادی، شافی، نافع تو اللہ تعالیٰ کے ایجابی اسماء حسنیٰ ہیں اللہ حی ہے یعنی زندہ ہے اور اپنی صفت حیات سے افاضۂ حیات کرتا ہے اس لیے محی اور حی و قیوم ہے۔ اور جب افاضۂ حیات نہیں کرتا اور اسم محی کی تجلی نہیں فرماتا تو اسی عمل کا نام اماتت ہے۔ اور ممیت ایجابی صفت نہیں، بلکہ سلبی ہے۔ اور حیات کے عدم افاضہ سے موت سمجھ میں آتی ہے۔ اسی طرح جب اسم ہادی کا افاضہ نہ ہوتو اسی

حرارت ہے اور رسالت میں ٹھنڈک۔ اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ (۲۷/۱۱)
سُورج اور چاند حساب سے (چلتے) ہیں۔ یہ اللہ، رسول (رب و عبد) کو
سمجھانے کی مثالیں ہیں۔ شمس اصلی ہے اور قمر مجازی (عارضی) ہے جس
میں ذاتی نور نہیں۔ اس طرح دو ذات مغائر یک دیگر ثابت ہوئیں۔
پھر ایک وجود بوجہ نور کھل گیا۔ اِس طرح توحید میں فرق نہیں۔ قمر کو
دیکھنے سے شمس کا انکار لازم نہیں۔ بلکہ لازم و ملزوم ہیں۔ چنانچہ حدیث
ہے۔ اَنَا مِنْ نُوْرِ اللّٰہِ وَکُلُّ شَیْءٍ مِنْ نُوْرِیْ۔ لہٰذا توحید اُسی کی
پکّی ہے جس کی رسالت پکّی ہے۔

**(۳۴) رحمٰن۔ رحیم کا علم سورہ رحمٰن۔ سورہ اقراء**

جب حضورؐ کو عالم شہادت میں قرآن دیا گیا تو جبریل امینؑ نے کہا۔ اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ o خَلَقَ الْاِنْسَانَ
مِنْ عَلَقٍ o اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ o عَلَّمَ الْاِنْسَانَ
مَا لَمْ یَعْلَمْ (۳۰/۲۱) ترجمہ: پڑھ تو اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا۔
انسان کو جمے ہوئے خون سے بنایا۔ پڑھ اور تیرے مہربان رب نے قلم کے
ذریعے علم دیا۔ اور انسان کو وہ علم دیا جو وہ نہیں جانتا تھا۔ اِن آیتوں
کو سورۂ رحمٰن کی ابتدائی آیتوں سے ملا کر دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ ان
دونوں میں کتنی یکسانیت و مطابقت ہے۔

**(۳۵) تعمیم و تخصیص**

رحمٰن کے علم میں ساری کائنات مندرج ہے اسی علم کے مطابق رحمٰن کے ذریعے تخلیق عمل
میں آئے گی۔ کائنات کی تخلیق کے بعد اسم رحیم کے ذریعے تفریق نمایاں
ہوگی اور ہر اسم اپنا حق ادا کرے گا۔ اس کو ایک تالاب اور خزانۂ آب

حقیقت تھے تو حضرت آدمؑ علم میں تھے یا نہیں، پس وہ اس علم کا جزو لازم ہوئے یا نہیں۔ اس طرح جو سجدہ حضرت آدمؑ کو کیا گیا، حضورؐ کے جزو ہونے کی وجہ سے اس کا رُخ حضورؐ ہی کی طرف ہوا۔ اور اصل سجدہ حضورِ انورؐ ہی کو کیا گیا۔ قرآن میں خلافتِ آدمؑ کا ذکر ہے لیکن اصلی خلافت حضورِ انورؐ ہی کی ہے جس سے ساری کائنات بلکہ آدمؑ بنے جو کُلّ شیءٍ مِنْ نُوْرِیْ سے ثابت ہے۔ جب علم، حمد، قرآن، انسان، محمدؐ کہو تو مطلب واحد ہے یعنی حضور اکرمؐ۔ وہی علم کائنات میں پھیلا تو حمد کہلایا اسی علم نے کلام کی شکل اختیار کی تو قرآن کہلایا۔ اور وہی علم انسان بنا تو محمدؐ کہلایا۔

اللہ کہنے کے بجائے الرَّحمٰن کیوں کہا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تو وَرَاءُ الوَراء ذات ہے۔ اس کا بیان تو الگ رہا، خیال بھی اس تک نہیں جا سکتا۔ رحمٰن اس لیے کہا کہ یہ صفت اللہ اور مخلوق میں وصل و تعلق پیدا کرنے والی ہے۔ اسی لیے کہا۔ قُلِ ادْعُوا اللّٰہَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ (۱۵/۱۲) اللہ یا رحمٰن کہنا بالکل برابر ہے۔ اللہ سے قریب ترین صفت رحمٰن ہے۔ اور اسی صفت کے ذریعے کائنات کی تخلیق عمل میں آئی۔ اور چونکہ یہی صفت انسان (محمدؐ) سے بھی قریب ہے۔ اس لیے رحمٰن نے قرآن سکھایا اسی لیے اَلرَّحْمٰنُ فَاسْئَلْ بِہٖ خَبِیْرًا (۱۹/۳) کہا گیا۔ ہم کو صفتِ رحمٰن ہی سمجھنی ہے۔ ورنہ اللہ تو وراءُ الوراء ہے اور ھُوْ ہے۔ اس میں وہ حرارت ہے کہ کسی کو باقی نہیں رکھتا۔ اور صفتِ رحمٰن برزخ ہے جو خالق کا مخلوق سے تعلق قائم و برقرار رکھتی ہے۔

میرے اس بیان کی تصدیق بھی اس آیت سے ہوتی ہے کہ توحید میں

اسم رحمٰن کا حق ادا کرتے تھے۔ اولیا اللہ کی عظمت کا راز اسی اسم کی اتباع و تعمیل میں ہے۔ اولیاء اللہ قربِ فرائض یا قربِ نوافل کے مقام پر رہتے ہیں۔ اس کی ایک مثال حضرت کلیم اللہ جہاں آبادیؒ نے لکھی ہے۔ ایک بڑے ولی اللہ اپنے خلیفہ کے ساتھ چڑھی ہوئی ندی پر پہنچے۔ مرید بسم اللہ کہہ کر دریا پار کر گئے۔ اور مرشد صاحب ٹھہر گئے۔ مرید نے کہا کیا آپ کو اللہ کی قدرت (رحیمیت) پر یقین نہیں۔ مرشد نے کہا۔ ہے، لیکن تجھے علم نہیں۔ مطلب یہ کہ مرید نے رحیم کے فیضان کے تحت عمل کیا۔ اور مرشد صاحب نے رحیم پر ایمان رکھتے ہوئے رحمٰن کا حق ادا کیا۔ اور سنتُ اللہ کی پیروی میں حکمت کے تحت کہا جب کشتی آئے گی تو میں آؤں گا۔ خرقِ عادت کی طلب ادب کے خلاف ہے۔

اسی طرح حضرت موسیٰؑ بہ تعمیل حکمت اپنے لوگوں کو ساتھ لے کر راتوں رات مصر سے نکل جاتے ہیں۔ فرعون کے لوگ اُن کا تعاقب کرتے ہیں اور جا لیتے ہیں۔ ایک طرف دشمن۔ ایک طرف سمندر۔ حضرت کے ساتھی پریشان ہو کر مایوس ہو جاتے ہیں۔ لیکن حضرت اِس دشواری میں ایمان پر جمتے ہیں۔ چنانچہ قدرت کی تجلی ہوتی ہے۔ سمندر میں راستہ ملتا ہے بصاف نکل جاتے ہیں۔ اور دشمن اُن کے پیچھے غرق ہو جاتے ہیں لطف یہ کہ موسیٰؑ کے اچھے بُرے سب ساتھی جبکہ ان کے ایمان متزلزل بلکہ معطل ہو چکے تھے، موسیٰؑ کے ساتھ ہلاکت کی بلا سے نجات پا جاتے ہیں۔ اور وجہ صرف یہ کہ موسیٰؑ کے ساتھ تھے۔ نیکوں کا ساتھ بھی کیا بڑی نعمت ہے۔ لیکن لوگ معیت کی برکتوں سے ناواقف ہیں۔ بلکہ بہت سے تو انکار کرتے ہیں۔ خود محروم رہتے ہیں۔

کی مثال سے سمجھو۔ رحمٰن کی مثال تالاب کی سی ہے جہاں سے شہر کو پانی آتا ہے ۔ لیکن تالاب سے پانی آکر خزانہ آب میں فلٹر (صاف) ہوتا ہے۔ یہ صاف پانی کا خزانہ گویا اسم رحیم ہے ۔ اصل تالاب میں اچھے بُرے پانی کی تفریق نہیں ہے ۔ یہ فرق و امتیاز اپنے محل پہ نمایاں ہو رہے ہیں۔ کافر و مومن کی تمیز ہو رہی ہے ۔ کافر کو اسم رحمٰن کا عام فیضان حاصل ہے اور مومن کو اسم رحیم کا خاص فیضان حاصل ہے ۔

**(۳۶) مثال** ایک صاحب نے پوچھا۔ رحمانیت اور رحیمیت کیا چیز ہے؟ فرمایا۔ ساری رعایا کا ایک بادشاہ ہوتا ہے، یہ تعمیم ہے لیکن شاہی ڈنر میں صرف خاص لوگ ہی شریک ہو سکتے ہیں، یہ تخصیص ہے ۔ رعایا میں سے ہر شخص شاہی دعوت میں نہیں آسکتا ۔ اسی طرح رعایا میں بڑے بڑے ساہوکار، زمیندار ہیں۔ وہ دولت کی بنا پر شاہی ڈنر میں نہیں آسکتے۔ لیکن ایک غریب آدمی، تخصیص و محبت شاہی کی بنا پر ڈنر میں شریک ہو سکتا ہے ۔ اسی طرح اللہ کی رحمانیت کے تحت ہر شخص دنیا میں فائدہ اٹھا رہا ہے۔ جیسے بادشاہ سے سب رعایا فائدہ اٹھا رہی ہے ۔ لیکن اللہ کی رحیمیت کے تحت صرف مسلمان ہی جنّت کی نعمتیں پائیں گے چاہے وہ غریب ہی کیوں نہ ہوں، کیونکہ وہ اللہ کے خاص بندے ہیں۔ اور کافر کتنے ہی دولت مند ہوں، جنّت میں نہیں جاسکیں گے ۔ جیسے ساہوکار، زمیندار شاہی ڈنر میں نہیں جاسکتے ۔ رحمانیت میں تعمیم ہے اور رحیمیت میں تخصیص ہے ۔

**(۳۷) اسباب ۔ بے اسبابی حکمت ۔ قدرت** رحمٰن و رحیم کے اسماء تمام کائنات کو حاوی ہیں ۔ رسول اللہ رحیم ہونے کے باوجود

سے ربط رکھ کر بے سروسامانی میں بھی ترقی کی۔ اور جب کبھی محض وسائل و اسباب سے ربط رکھا، بھروسہ کیا، مار کھائی۔ مثلاً جنگِ حنین میں اپنی کثرت و قوت پر عجب کیا، بھروسہ کیا تو شکست ہو گئی۔

مختصر یہ کہ مسلمان کافروں کی کثرت و قوت سے مرعوب نہ ہوں بلکہ اللہ کی معیت و قدرت پر نظر رکھیں کہ قرآن کہتا ہے۔ وَلَنْ تُغْنِيَ عَنْكُمْ فِئَتُكُمْ شَيْئًا وَلَوْ كَثُرَتْ وَاَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ (۹/۱۹) یعنی اے کافرو۔ تم کو تمھاری کثرت کچھ فائدہ نہیں دے گی کیونکہ اللہ مومنین کے ساتھ ہے۔

(۴۰) مال و دولت اور ایمان | اسلام میں مال و دولت کی خاص اہمیت نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے سورہ مزمل میں کافروں کو وَالْمُكَذِّبِيْنَ اُولِي النَّعْمَةِ (یعنی انبیاء رسول کو جھٹلانے والے اور خوب نعمتیں پانے والے) فرمایا۔ اور سورہ زخرف میں ان کافروں کے مکانات کو سونے چاندی کے بنا دینے کا خیال ظاہر فرمایا، اگر یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ مسلمان بھی کافر ہو جائیں گے۔ وَلَوْلَا اَنْ يَّكُوْنَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً لَّجَعَلْنَا لِمَنْ يَّكْفُرُ بِالرَّحْمٰنِ لِبُيُوْتِهِمْ سُقُفًا مِّنْ فِضَّةٍ . . . . وَزُخْرُفًا . . . وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ (۲۵/۹)

ظاہر ہے اللہ نے کافروں کو دولت و ثروت دنیا کی حد تک زیادہ دی ہے کیونکہ آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں۔ قرآن کے لحاظ سے اسلام کی امتیازی نعمت و خصوصیت دولت میں اضافہ کرنا نہیں۔ بلکہ ایمان اور علم صحیح دینا ہے۔ دولت کو اسلام کا لازمہ سمجھنا دھوکا ہے گو دولت مند ہونا بھی منافی اسلام نہیں۔ کافروں کو تبلیغ میں علم صحیح

## (۳۸) رحمٰن و رحیم کا ادب

مصیبت میں مختلف محل کو سمجھنا ضروری ہے
ہمیشہ 'رحیم' سے لپٹے رہیں اور رحمٰن کا حق
ادا کرتے جائیں۔ رحیم مومن کے حق میں نتائج کو کنٹرول کرتا ہے۔ رحیم
رحمٰن سے ٹکر نہیں لیتا۔ مثلاً اسم رحمٰن اقتضاءات کے مطابق چیزوں
کو پیدا کرتا ہے۔ سانپ ہو یا بچھو۔ عداوت ہو یا آگ۔ لیکن اسم رحیم
آگ کو حضرت ابراہیمؑ کے لیے بَرْدًا وَّ سَلَامًا (ٹھنڈی) کر دیتا ہے۔ رحمٰن
آگ کو پیدا کرتا ہے۔ اس کی تخلیق میں رحیم حارج نہیں۔ البتہ تخلیق کے
بعد مومن کو محفوظ رکھنے کے لیے اسم رحیم اپنے فیض سے اُسے بجھاتا ہے مومن
کو بچاتا ہے۔ اس لیے ادباً حکمت کے تحت، رحمٰن کے اقتضاءات کو ہمیشہ ملحوظ
رکھنا چاہیئے۔ اسباب میں بظاہر کسر نہ اٹھا رکھیں۔ اور دل بذریعہ دعا و
توجہ اسم رحیم (یعنی قدرت) کی طرف متوجہ رہے۔

## (۳۹) مسلمانوں کی ترقی کا راز

رحمٰن حکمت کے تحت اسباب مہیا کرتا
ہے لیکن رحیم میں حکمت و اسباب کی
گنجائش نہیں۔ وہاں محض قدرت ہی قدرت ہے۔ اور یہ اسم مومنین کے
لیے خاص ہے۔ یہ عالم اس کا متحمل نہیں۔ آخرت اور جنت میں اس کے
خوب مظاہرے ہیں۔ رحمٰن کا فیض کافر و مومن دونوں کے لیے عام ہے۔
حالاتِ حاضرہ میں مسلمانوں کے لیے حکمت میں، اسباب و وسائل میں
کوئی خاص گنجائش نہیں۔ کیا اس وقت وہ اسباب میں یورپ، امریکہ
اور روس کا مقابلہ کر سکتے ہیں؟ لیکن اللہ، رسولؐ کی محبت کے تحت،
رحیم و قدیر سے ربط پیدا کر کے، قرآن کے ذریعے قرنِ اولیٰ کی طرح دنیا
کو وہ مسخر کر سکتے ہیں۔ اسلامی تاریخ بتاتی ہے کہ مسلمانوں نے قدرت

اِس درجہ منفتح نہیں ہوتے، اور نہ اِس کا مزاج باطل کے موافق ہے۔ ایسے وقت اگر ہم عالمِ ظاہر میں اسمِ رحمٰن کے تقاضوں کا حق بھی ادا کریں اور حق پر رہیں تو ہمارا معاملہ رحمٰن سے بھی ٹھیک رہے گا اور رحیم سے بھی فیضان آئے گا۔ اِس طرح ہم دوچند فائدے میں رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ کو کوئی جیب میں نہیں اُتار سکتا۔ غنی و حمید کے مقابل کوئی کیا دعویٰ کر سکے گا۔ دعویٰ صرف اس کے فضل کی اُمید کا ہو سکتا ہے۔ پس ہر وقت خشیت کے مقام پر رہیں کہ وہ ذات غنی و حمید ہے اور ہمارا کوئی عمل قابلِ اعتبار اور قابلِ فخر نہیں۔ اس لیے کامیابیوں اور مقبولیت پر فخر و غرور نہ ہو۔ مصائب و آلام میں بھی طریقِ حق پر قائم رہیں۔ جلالی تجلیوں کو قہر و عذاب پر محمول نہ کریں۔ کیونکہ مومن کے لیے اِن میں لطف و کرم کی ادائیں پنہاں ہوتی ہیں۔

لطفِ نہانِ یار کا مشکل ہے امتیاز
لنگر چڑھی ہوئی ستم بر ملا کی ہے

اِس عالم میں بظاہر فسق و کفر کو تقویت نظر آتی ہے، اور اولیاء اللہ کے حق میں ذلت و اذیت۔ لیکن یہی امر عینِ حکمت ہے جس سے ایک طرف اہلِ عشق و محبت کی فدائیت کا اظہار ہوتا ہے تو دوسری طرف منکروں، کافروں کے حق میں اللہ تعالیٰ کی حجتِ بالغہ تمام ہوتی ہے۔ تاریخ اسلام کے بعض ادوار میں دین اور دینداروں کو جتنا نقصان بعض مسلمان حکمرانوں کے ہاتھوں پہنچا اتنا شاید کافروں کے ہاتھوں بھی نہیں پہنچا ہوگا۔

**(۴۴) رحمیت کی تجلّی** ایک بات سمجھ لو، سارے وساوس کافور ہو جائیں گے۔ قدرت کی تجلّی اُسی وقت ہوتی ہے جب سارے اسباب منقطع ہو جائیں۔ جب تک سبب کا ذرّہ برابر

پر زور دینا ضروری ہے۔ کبھی اُن کے اعتبار کے تابع نہ ہوں اور نہ تقویت دیں۔ کیونکہ بعض تو دولت کی پوجا کرتے ہیں۔ اور اولیاء اللہ سے بھی عقیدت رکھتے ہیں، نذر نیاز کرتے ہیں تاکہ اُن کی دعا سے دولت میں ترقی ہو۔ اکثر انبیاء، اولیاء بے بسی اور افلاس میں گزار گئے اور بعض تو ناحق قتل کئے گئے۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کی نصرت و قدرت کہاں گئی۔ یہ سخت دھوکا ہے۔ مومن کو مخالف حالات میں بھی سکون و اطمینانِ قلب حاصل رہتا ہے جو ایمان و علمِ صحیح کا نتیجہ ہوتا ہے۔

## (۴۱) مومن کے لیے دوہرے فائدے

کامیابیوں کے حصول پر انانیت نہ برتیں، پروپیگنڈا نہ کریں، تفاخر نہ جتائیں۔ اور مخالفین کا لحاظ کر کے ان کا حق تکریم و توصیف ادا کرتے رہیں، تو ان کی مخالفت و انانیت کی شدت میں بھی کمی ہو جائے گی۔ ایمان کے تقاضوں پر قائم رہ کر اپنے معاملات میں حق و صداقت سے تجاوز نہ کریں۔ اور اپنی مساعی میں اہلِ باطل کے طریقے، مکر و فریب وغیرہ اختیار نہ کریں۔ نتیجہ کا لحاظ کئے بغیر، اللہ تعالیٰ کی رحمت کی اُمید پر اپنا فرض ادا کرتے رہیں۔ اور عبدیت و استغفار اپنا مقام رکھیں تو اسمِ رحیم کی تائید حاصل ہو کر انشاء اللہ انجام بخیر ہو گا وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ (۹/۱۱) عاقبت کے معنی آخرت ہی نہیں بلکہ بعد کو آنے والی ہر چیز متقیوں کے لیے بہتر ہے۔

اس سے ہٹ کر اگر اپنی مساعی میں باطل کے حربے استعمال کریں تو اسمِ رحیم کی خصوصی تائید رُک جاتی ہے۔ ایسا ہے اسمِ رحمٰن کا معاملہ۔ اسمِ رحمٰن کے تحت باطل والوں کو بھی اُن کی مقتضیات کی تکمیل کے لیے قوت ملتی ہے اور شیاطین کی تائید اہلِ باطل کے لیے جنبش میں آتی ہے اور وہ بھی باطل کے حربے دل کھول کر اپنے اولیاء یعنی کافرین و فاسقین کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ مومن یہ باطل کے طور طریقے اور حربے

کی دو شان ہیں۔ رحمٰن۔ رحیم۔ اسم رحمٰن کی شان حکمت ہے۔ اسم رحیم کی شان قدرت۔ رحمٰن کا فیضان عام ہے۔ اس کے واسطے ایمان شرط نہیں مومن کے سوا کافر، ملحد، زندیق، سب کوئی اس فیضان پہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ کُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ (۱۵/۲) اس کے مقابل رحیم کا فیضان خاص ہے۔ اس کے واسطے ایمان شرط ہے۔ وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَحِيْمًا (۲۲/۳) بہرحال رحمٰن و رحیم کا فیضان اور حکمت و قدرت کا تعلق ایمان میں ربوبیت کا مرکزی مسئلہ ہے۔ جس کا خلاصہ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ہے۔ جس کا اجمال سورۂ فاتحہ میں درج ہے۔ جس کی تفصیل قرآن شریف میں پھیلی ہوئی ہے۔"

## (۴۴) خلق و امر۔ حکمت و قدرت

قرآن میں ظہور کے چار اہم اعتبار ہیں۔ خلق۔ امر۔ کُن۔ کلمہ۔ انسان روح اور جسم سے مرکب ہے۔ روح کا تعلق عالم امر سے ہے اور جسم کا تعلق عالم خلق سے۔ دونوں کا تعلق رب سے ہے۔ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ (۸/۱۴) قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ (۱۵/۱) عالم امر میں ہر چیز کُن کے ساتھ فوراً وجود میں آتی ہے۔ اس کا ظہور قدرت سے ہے۔ اس میں اطلاقیت ہے۔ یہ سلسلۂ اسباب سے بے نیاز ہے۔ امر کے عمل کے لیے کُن کلمہ ہے۔ اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْئًا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ (۲۳/۴) اس کے برخلاف جسم میں تقیید ہے۔ اور یہ سلسلۂ اسباب میں مقید ہے۔ اس کا ظہور حکمت کے تحت ہے۔ چونکہ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش عالم خلق کے عام قاعدہ کے خلاف باپ کے بغیر، امر کے تحت، کُن سے عمل میں آئی۔ اس لیے آپ کو قرآن میں کلمۃ اللہ کہا گیا۔ اس طرح کُن اور کلمہ ایک ہیں۔ حضرت مریمؑ اور حضرت

سہارا ہوگا صفتِ قدرت کی تجلی نہ ہوگی۔ اِس کی مثال ایسی ہے کہ اگر آپ کے پاس آبِ حیات ہو تو نفسیاتی طور پر آپ اسے معمولی مرض میں استعمال نہیں کریں گے۔ جب تمام دوائیں ناکام ہو جائیں، جان لبوں پر آجائے تو آپ آبِ حیات استعمال کریں گے اور مریض اچھا ہو جائے گا۔ اِسی طرح آج کل مسلمانوں پر بے شمار مہیب مصیبتیں ہیں، لیکن مایوسی کی بات نہیں۔ جب اسباب کا بھروسہ نکل جائے اور مسبّب پر دل جم جائے تو قدرت کی تجلی ہو کر مسلمان سنبھل جائیں گے۔ اِس وقت صرف سیاسی جنگ نہیں ہے، بلکہ اسلام و کفر کا معرکہ آن پڑا ہے اس وقت کافروں کے خلاف جنگ صرف اسباب کے ذریعہ ممکن نہیں۔ رحمٰن رحمٰن کا معاملہ نہیں۔ بلکہ رحمٰن کے مقابل، رحیم کو اپنی قدرت کی تجلی دکھانی ہوگی۔ تم ہی خیال کرو کہ ایسی شکل میں کافروں کی طرف اسمِ رحمٰن کا فیض ہوگا تو مومنین کی طرف اسماء رحمٰن و رحیم دونوں کے فیض ہوں گے۔ کس کا پلہ بھاری ہوگا۔ لہٰذا مسلمانوں کو چاہئے کہ حتی الامکان اسباب میں رحمٰن کا اقتضا پورا کرتے ہوئے اسمِ رحیم سے قوی ربط رکھیں۔ ایمان پر قائم رہیں اور حبِ نبوی اور اتباعِ رسالت میں کوتاہی نہ کریں۔

(۴۳) خلاصہ ۴۰ تا ۴۲ | چنانچہ حزب اللہ صفۃ البرنی میں اسماء رحمٰن و رحیم کی بحث کا حسبِ ذیل خلاصہ ملاحظہ ہو۔

"خلاصہ یہ کہ عبد جو اللہ کی ربوبیت کا مظہر ہوتا ہے، اُس کی عبدیت رحمٰن و رحیم دونوں اسم کے فیضان کی جامع ہوتی ہے۔ اِسی سبب عبدیت انسان کے عروج کا انتہائی مقام ہے۔ انبیاء کا بھی یہیں قیام ہے۔ انبیا کے تحت صدیقین، صالحین بھی اِس مقام سے فیض یاب ہوتے ہیں۔ ربوبیت

میں توازن کا بہترین نمونہ ہیں۔ یہ توازن ہر نبی کی امتیازی خصوصیت ہے حضرت عیسیٰؑ کی سہ سالہ رسالت کی زندگی کے چند واقعات دُنیا کو معلوم ہیں، باقی پردۂ راز میں ہیں۔ بظاہر حضرت مریمؑ اور حضرت عیسیٰؑ کی زندگی میں امر غالب معلوم ہوتا ہے لیکن خلق کے واقعات بھی قرآن و انجیل سے ثابت ہیں۔ مثلاً بچپن میں بلا سعی، امر کے تحت، حضرت مریمؑ کے کمرہ میں غیب سے کھانے آتے تھے۔ لیکن جب اُن کا مرتبہ بلند کیا گیا، اور حضرت عیسیٰؑ کی والدہ بننے کا وقت آیا تو زچگی کے بعد انھیں مقامِ خلق کا حق ادا کرنا پڑا۔ اور کھجور گرانے کے لیے سعی کا حکم ہوا۔ اسی طرح اَمر کے تحت حمل کے زمانے میں اُنھیں کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ لیکن مقامِ خلق میں زچگی کی تکلیف نہایت شدید رہی۔ یا تو حضرت عیسیٰؑ مُردوں کو زندہ کرتے تھے، یا انجیل کے بیان کے لحاظ سے حضرت عیسیٰؑ کو مقامِ خلق میں انتقال کے وقت انتہائی تکلیفیں ہوئیں۔ اس سے مقصود آپ دونوں کی زندگی میں خلق و امر میں توازن قائم کرنا تھا تاکہ آپ کے مرتبے عالم میں ممتاز ہوں۔ ملائکہ اَمر کے تابع ہیں اور حیوانات خلق کے۔ لیکن انسان مقامِ خلق و امر کا جامع توازن رکھتا ہے۔ جنّات ملائکہ اور انسان کے بین بین ہیں۔

**(۲۵۱) رسول کریمؐ۔ جبریلِ امینؑ** ناچیز نے عرض کیا۔ جبریلؑ حاملِ کلماتِ قرآن تھے یا عالمِ کلماتِ قرآن؟

فرمایا۔ اگر کہا جائے کہ خزانہ دار حافظ و امین ہے تو اس کے معنی یہ نہیں ہوتے کہ وہ خزانہ کی تفصیلات سے واقف ہے۔ اور خزانہ پہنچانے کے معنی بھی یہ نہیں ہیں۔ حامل و قاصدِ کلمات کے لیے یہ بھی ضروری نہیں کہ جاننے اور

عیسیٰؑ کی زندگی میں اَمر بمقابلہ خلق غالب و نمایاں ہے۔ اِسی لیے آپ کی زندگی کے واقعات پُراسرار، حیرت ناک ہیں۔ مثلاً بچپن میں کرامت تھی کہ حضرت مریمؑ کے کمرہ میں غیب سے کھانا آجاتا تھا۔ بغیر باپ کے حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش ہوئی۔ پیدا ہوتے ہی بولنے لگے اور اپنی نبوت کا اعلان فرمایا۔ آپ مٹی کا پرندہ بناتے اور اس پر پھونکتے ہی وہ زندہ پرندہ بن جاتا۔ اللہ کے حکم سے آپ کے چھونے سے اندھوں، جذامیوں کو صحت ہو جاتی۔ مُردوں کو زندہ کر دیتے۔ لوگوں کے گھروں کے خزانے اور کھانوں کی تفصیل بیان فرماتے۔ آپ کی دُعا سے آسمان سے خوانِ نعمت اُترتا۔ آپ کے بجائے آپ کا مُشابہ شخص سُولی دیا گیا۔ علاوہ ازیں حضورِ انور صلعم کی معراج اور شقِ قمر وغیرہ وہ معجزات ہیں جن کا خصوصیت سے اَمر سے تعلق ہے، جہاں اسباب کو دخل نہیں حکمت کے تحت اسباب عالمِ خلق کا اقتضا ہیں۔ اور قدرت کے تحت بے اسبابی عالمِ اَمر کا اقتضا۔ ان کے اسرار و حقائق عارفین پر کھلتے ہیں۔

قرآن کے لحاظ سے عبدیت میں مُردے کو زندہ کرنے کی گنجائش ہے چنانچہ حضرت عیسیٰؑ نے اپنے عبدُ اللہ ہونے کا اعلان فرمایا۔ امر کے عمل کا ظہور کُن سے ہوتا ہے۔ اور عموماً معجزات میں ملائکہ کا تعاون رہتا ہے۔ ایک فرشتہ نے امر کے تحت حضرت مریمؑ کو حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کی بشارت دی اور وہ حاملہ ہو گئیں۔

معجزات کی بنیاد اَمر و کُن پر ہے۔ دُنیا میں خلق کا عمل عام ہے اس میں علت و معلول کا سلسلہ چلتا ہے۔ لیکن اس بنا پر اَمر کے مقابلے میں خلق کی کمتری ثابت نہیں ہوتی۔ اگر خلق و امر میں اعلیٰ توازن ہو تو انسانیت کا اعلیٰ مقام حاصل ہوتا ہے۔ حضورِ انورؐ مقامِ خلق اور مقامِ اَمر کے واسطہ

اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا (۲پ) فرشتوں کو تھوڑا سا علم ملا ہے۔ لیکن کل علم و حکمت کا حامل و عالم صاحبِ حقیقتِ آدمیہ رسول اللہ ہیں۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔ اِن مقدمات سے ظاہر ہے کہ جبریلِ امین کو وہ علم حاصل نہیں جو بجامعیت کے ساتھ حضورؐ کو حاصل ہے۔ لہٰذا قرآن صاحبِ قرآن سے لینا چاہئے۔ وہی عالم ہیں یا جو آپ سے علم پائیں یعنی اولیاء اللہ

**(۴۶) ملائکہ، جن و اِنس کا علم** | فرشتوں نے آدمؑ کے علم ہی کو سجدہ کیا تھا کہ وہ اسمائے الٰہی کا علم رکھتا ہے۔

سب سے اعلیٰ علم انسان کو ہے۔ اس کے بعد جنوں کو، اس کے بعد ملائکہ کو۔ شیطان بھی جن تھا۔ فسق و فجور کی وجہ سے اس نے "شیطانِ رجیم" نام پایا۔ جنوں میں بھی مسلمان اور کافر ہیں۔ مرشدین و مشائخین ہیں۔ لیکن اُن کی عبدیت ناقص ہوتی ہے۔ کیونکہ ناری مخلوق ہیں۔ ہم خاکی ہیں۔ خاک جہاں ڈال دو پڑی رہتی ہے۔ بے ارادتی و اضطرار اس کا خاص وصف ہے۔ اس کے برخلاف آگ میں زور اور حرارت ہے۔ جنوں کا ارادہ فنا نہیں ہوتا۔ لیکن انسان کی اَنیت و ارادہ فنا ہوتے ہیں اور وہ ذات کا مظہر بن جاتا ہے جس کی وجہ سے وہ عبدیت کا کمال حاصل کرتا ہے۔

ملائکہ میں جنس نہیں۔ وہ ماموریت کی حد میں رہتے ہیں اور جبلّت پر عمل کرتے ہیں۔ اپنا ارادہ نہیں رکھتے۔ البتہ باقی مخلوق سے افضل ہیں کہتے ہیں۔ شیطان معلم الملکوت تھا۔ اس کا قرآن میں ذکر نہیں۔ البتہ اس کا منشا ملائکہ کے مقابل میں جنوں میں علم کی زیادتی دکھانا معلوم ہوتا ہے ملائکہ صرف خیر پر رہتے ہیں۔ شیطان شر پر لگا ہوا ہے کہ وہ سراسر ضلالت ہے۔ اور انسان خیر و شر کا جامع ہے۔ جب خیر پر آتا ہے تو فرشتے سجدہ کرتے

پیام پہنچانے کے بعد اُسے یاد بھی نہ رہے، جیسا کہ حضورؐ حافظ اور عالم ہیں۔ جبرئیلؑ فرشتہ ہیں، امین و قاصد ہیں نہ کہ عالم و حافظ۔ بینک اور بینکر دولت کا محل ہوتا ہے نہ کہ دولت سے تمتع کرتا ہے۔ ایک پوسٹ ماسٹر لاکھوں کی رقوم بلا زم و قاصد کی حیثیت سے تقسیم کرتا ہے، خود تمتع سے محروم ہے۔ لیکن متمتع ہونے والے متمتع ہوتے ہیں۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ قرآن میں بعض ایسی انسانی خصوصیات کا علم ہے جو فرشتوں میں نہیں پائی جاتیں۔ مثلاً لوازم بشری اور مردانگی وغیرہ پس جو صفات خود حضرت جبرئیلؑ میں نہ تھے ان کا علم انھیں کیسے ہو سکتا تھا۔ تیسرا نکتہ یہ ہے کہ انسان خیر و شر کا جامع ہے۔ لیکن فرشتے شر سے خالی ہیں۔ لہٰذا فرشتوں کو شر کی تفصیلات کا علم نہیں ہو سکتا۔ مزید برآں فرشتوں کو مقامات انسانی کی رفعت کا بھی علم نہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ سے آدمؑ کی خلافت کی خبر جو سُن پائی تو کہہ اُٹھے کیا آپ زمین میں ایسی مخلوق پیدا کرنا چاہتے ہیں جو فساد و خوں ریزی کرے (۱/۲) اس پر اللہ نے متنبہ فرمایا۔ تم جاہل ہو۔ تمھیں معلوم نہیں۔ وَعَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَاءَ كُلَّهَا (۱/۲) جملہ اسماء کا علم آدمؑ کو عطا فرمایا۔ اس سے ظاہر ہوا کہ فرشتوں کو آدمؑ کے سارے مقامات کا علم نہ تھا۔ حضور انورؐ انسانِ کلی ہیں جن میں جملہ اسماء کے مظہر تام بننے کی صلاحیت ہے۔ اَسْمَاءَ كُلَّهَا سے مراد نہ صرف اسماءِ الٰہیہ ہیں بلکہ اسماءِ کونیہ وغیرہ سب مراد ہیں۔ كُلَّهَا لفظ مطلق ہے۔ اس کو مقید کرنا جہل ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے قیاس آرائی پر فرشتوں کو تنبیہ فرمائی اور فرشتوں نے آدمؑ کی زبان سے علوم اسماء کا بیان سُنا تو اپنے جہل کا اعتراف کیا اور معذرت کر دی۔ سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَا

روابط و جذبات و احساسات کے ساتھ بوہلہٗ اولیٰ عرب جاہلیت جیسی اشد، جانی دشمن اور گمراہ قوم کی اصلاح کا فرض سپرد ہوا جس کی کامیابی سے انجام دہی جوئے شیر لانے سے کم نہ تھی۔

(۴۸) **خیر القرون قرنی** فرمایا حضورؐ کے زمانے کو محض حضورؐ کی موجودگی کی وجہ سے بہترین قرن کہتے ہیں اس کے بعد بہت سے ایسے ناگوار واقعات پیش آئے مثلاً جنگ صفین۔ جنگ کربلا وغیرہ کہ اللہ تعالیٰ کے جلال و غنا کے سامنے دم بخود رہنا پڑتا ہے۔ بات دراصل یہ تھی کہ اسم ہادی کی تجلی اس زمانے میں بہت قوی تھی اس لیے اس کے مقابل ضلالت کے اقتضاءات بھی بہت قوت و شدت سے ظاہر ہونے ضروری تھے۔ لہذا ایسی ساری شکلیں پیش آئیں۔

ہیں۔ اور اگر شر پہ آئے تو شیطنت کی انتہا کر دے۔ بعض اولیائے کاملین
پر اپنی شریعت اس درجے منکشف ہوتی ہے کہ اگر شیطان کو اس کا علم
ہو جائے تو اس شریعت کے سامنے سجدہ کر دے اور اپنی شریعت کو بھی
ہیچ جانے۔

**(۴۷) حدیث اذیت** | حضور انور صلعم نے ارشاد فرمایا۔ روئے زمین
پر مجھ سے بڑھ کر کسی کو اذیت نہیں دی گئی۔ اس
کا مطلب عام طور پر غلط سمجھا جاتا ہے اس سے مراد کھانے کپڑے، مال و
دولت اور دنیوی وسائل کی کمی اور تنگی یا دکھ درد کا اظہار نہیں ہے کہ بہت
سے کافروں کو بھی اس قسم کے مصائب کم و بیش پیش آتے ہیں۔ اس اذیت
کے معنی یوں سمجھو۔ کسی بڑے قابل انجینیر سے یہ کہا جائے کہ ہمالیہ پہاڑ کاٹ کر
ایک بڑی نہر نکالو۔ اور خود انجینیر بھی دریا دلی سے اُس نہر کو بنانے کے لیے بے چین
ہو کہ اس سے ملک گلزار ہو جائے گا۔ ایک طرف تو اس کو یہ حکم ملے اور
دوسری طرف اہلِ ملک جن کی فلاح و ترقی کے لیے اس نے اس اسکیم کا
بیڑا اُٹھایا ہے، خود اس اسکیم کے، بلکہ انجینیر کے مخالف بن جائیں۔ تو انجینیر
کہے گا کہ مجھے عمر بھر میں ایسی مصیبت عظمیٰ کبھی پیش نہیں آئی جیسی اس نہر
کے نکالنے میں آئی۔ یہاں اس بیان سے انجینیر کے کھانے کپڑے وغیرہ
کی تنگی کی مصیبت مراد نہ ہوگی۔ اسی طرح حضور صلعم کو اللہ تعالیٰ نے سارے
عالم کے لیے رسول بنا کر بھیجا اور ہدایت کے لیے مامور فرمایا۔ ایک طرف
آپ کو رَحْمَةٌ لِّلْعَالَمِيْنَ، بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَؤُوْفٌ رَّحِيْمٌ۔ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا
عَنِتُّمْ۔ رَسُوْلٌ كَرِيْمٌ جیسے صفات عطا فرمائے تو دوسری طرف اِنَّكَ لَا
تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ (۲۰/۹) بھی فرما دیا۔ اور ان تمام انتہائی نازک اعلیٰ

ہے۔ اور نزول کی پوری جامعیت رکھتی ہے۔ مٹی سے بڑھ کر کسی میں نزول نہیں
اللہ نے انسان کو مٹی سے کامل نزول کی حالت میں پیدا کیا تاکہ اُسے کامل عروج
عطا کرے اور اپنے اسماء کا مظہر بنائے۔ اور یہی اس کی فوقیت کی وہ جہت
ہے جس کے سامنے ملائکہ کو سجدہ کرنا پڑا۔ لیکن ظاہر بینوں کی نظر نزولی رُخ پر
ہے۔ عروجی رُخ پر نہیں۔

پھر یہ کہ اس بے وقوف کو سمجھنا چاہیئے تھا کہ رَبّ وہ ہے جو ایک لمحہ
میں خیر کو شر میں بدل سکتا ہے۔ اس نے کیسے سمجھا کہ وہ خیر ہی رہے گا۔ وہ رَبّ
ہی کیا جو کسی چیز کا پابند ہو۔ وہ ہر پابندی سے بالا ہے۔ غنی ہے۔ اسی وجوب
وغنا کی بنا پر اللہ تعالیٰ کو سجدہ فرض ہے۔ شیطان نے اللہ تعالیٰ کی تخلیق
اور اپنے ذاتی اقتضائے شر پر نظر نہ کی، جاہل تھا۔ لیکن حضرت آدمؑ جنھیں
کل اسماء کا علم عطا ہوا تھا انھوں نے اللہ تعالیٰ کی تخلیق، قدرت اور غنا
پر نظر کی۔ اور اپنے کسب واقتضائے ذاتی شر کو ملحوظ رکھتے ہوئے، اپنی
غلطی پر توبہ کی اور فرمایا۔ رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا
لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ (۲۳) ترجمہ: اے پروردگار، ہم نے اپنے نفسوں
پر ظلم کیا۔ اگر تو نے مغفرت ورحمت نہ کی تو ہم خسارہ میں رہیں گے۔

علاوہ ازیں جاہل شیطان کو سمجھنا چاہیئے تھا کہ اس میں خیر کی جہت
ہے ہی نہیں تو ادّعا کیسے۔ رب کا لفظ تو کہا مطلب نہیں سمجھا۔ توحید افعالی میں
خلق فعل وکسب فعل کی تمیز نہ کی۔ اور جہالت سے گمراہی کا فعل اللہ کی طرف
منسوب کر دیا۔ اگر کسب کا اعتبار لیتا تو سارا الزام اپنے سر لیتا۔ اس کے
برخلاف حضرت آدمؑ نے خلق وکسب میں فرق وتمیز کیا۔ اور اسے سمجھ کر
اپنی خطا پر توبہ کی۔ اور اسمائے الٰہی رَبّ، توّاب، غفّار، رحمٰن، رحیم کی طرف

# فصلِ سوم

## توحیدِ افعالی۔ رُبوبیّت

**(۱) آدمؑ اور شیطان خلق اور کسب**

سب سے بڑا امتحانی سوال جو اللہ تعالیٰ نے دیا تھا وہ رُبوبیّت کا مسئلہ تھا جو قرآن میں محفوظ ہے۔ اُس کے جوابات بھی محفوظ ہیں۔ اِسی امتحان میں شیطان ناکام اور آدمؑ کامیاب ہوئے۔ جب اللہ نے ملائکہ سے آدمؑ کو سجدہ کرنے کے لیے فرمایا تو شیطان نے غرور سے اس کی تعمیل سے انکار کیا اور کہا۔ اَنَا خَیْرٌ مِّنْہُ خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَہٗ مِنْ طِیْنٍ (۹/۸) میں اس سے بہتر ہوں۔ اِسی انکار پر جب وہ مردودِ بارگاہ ہوا تو کہہ دیا۔ فَبِمَا اَغْوَیْتَنِیْ (۹/۸) بہ سبب اس کے کہ تو نے ہی مجھے گمراہ کیا۔ اِس طرح گمراہ کرنے کے فعل کو اللہ کی طرف منسوب کر دیا۔ اور خیر کو اپنی طرف منسوب کر دیا۔ اس کے یہ دونوں اعتبارات جہل، شرک و کفر کے تھے۔ اللہ نے اُسے گمراہ نہیں کیا بلکہ اس کے اقتضائے ذات شر کو ظاہر کر دیا۔ جو مانگ تھی دے دی۔ آتَاکُمْ مِّنْ کُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْہُ (۱۳/۱۴) لیکن اس نے بحث شروع کر دی۔ میں آدم سے بہتر ہوں کیوں کہ تو نے آدمؑ کو مٹی سے بنایا اور مجھے آگ سے۔ لیکن اس جاہل کو کیسے معلوم ہوا کہ آگ مٹی سے بہتر ہے۔ کوئی وحی تو نہ تھی۔

**(۲) مٹی کی عظمت** وہ مٹی کی حقیقت کو سمجھ نہ سکا۔ مٹی جامد اور بے ارادہ

یہی علم رسالت ہے کہ فرمایا، وَ وَجَدَکَ ضَآلًّا فَهَدٰی۔ وَوَجَدَکَ عَآئِلًا فَاَغْنٰی (پ۳۰ ع۱۸) ترجمہ:۔ تجھ کو گمراہ پایا تو ہدایت کی۔ اور (وجود میں) فقیر و محتاج پایا تو غنی کر دیا۔ کتنی بڑی حقیقت ہے اور کتنی بڑی تجلّی۔ جب اپنی ذات کو جاہل، عدم اور گمراہ دیکھا کہ رائی برابر ہدایت ذاتًا مجھے حاصل نہیں تو عبدیّت کھل گئی۔ اور اُسی وقت ہدایت کی بشارت ملی اور توحید کھلی۔ گمراہی اپنی صفت اصلی ہے۔ ہدایت کا علم اضافی تفضلی ہے۔ ضال ہی میں ھُدیٰ کی تجلّی آرہی ہے ورنہ وہ عدم ضال کے سوا کچھ نہیں۔

**(۴) فجور و تقویٰ کا الہام** فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا (پ۳۰ ع۱۶) یعنی اللہ نے اُس (شَیٔ) کے ذاتی فجور و تقویٰ (شر و خیر) کو اس پر الہام کیا۔ الہام (خطرہ) کی تخلیق تو خیر ہے۔ لیکن اس تخلیق کے بعد مخلوق کے اندر وہ فجور بن جاتاہے یا تقویٰ۔ اِسی کا امتیاز و ادب ضروری ہے ورنہ الحاد ہے۔ ملحدین فجور و تقویٰ کی تمیز کے بغیر ہر خطرہ کو خیر سمجھ کر جہالت سے تعمیل کرتے ہیں جو مقامِ نفس ہے اور نفس فسق و فجور کا مولِد ہے شیطان کی طرح اقتضاءات کو ملحوظ نہیں رکھتے اور فجور ہی کو مِنْ خَلْقِ اللہ خیر محض کہہ کر معصیت میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور اِسے توحید افعالی کی تکمیل کی سند سمجھتے ہیں حالانکہ اسی آیت میں فجور و تقویٰ کا امتیاز ظاہر کیا جارہا ہے۔

بعض ملحد الہام کے معنی حکم کے لیتے ہیں اور کہتے ہیں۔ ہم تو حکم و الہام کے تحت عمل کرتے ہیں۔ سمجھنا چاہیئے کہ ہر الہام حکم نہیں ہوا کرتا فجور و تقویٰ کا علم اور اللہ کا منشا قرآن میں تفصیل سے محکمات کی شکل میں موجود ہے جس کا لحاظ فرض ہے۔

تخلیق کے بعد شَیٔ میں جو خیر ہے مِنَ اللہ ہے، اور جو شر ہے مِنَ النَّفس ہے۔

رجوع کر کے استفادہ کیا لیکن شیطان جہلِ مرکب اور ہٹ دھرمی پر اتر آیا اور ملعون ہوا۔ اس کے باوجود ایک باطل فرقہ شیطان کے موحد ہونے کا قائل ہے۔

## (۳) رسول اللہ اور شیطان خیرِ کثیر۔ شرِ کثیر

اسی ربوبیت و اقتضائے ذاتی، خیر و شر خلق و کسب کے مسئلہ کو اللہ تعالیٰ نے قرآن میں وضاحت سے سمجھا دیا۔ رسول اللہ معلم جملہ اسمائے الٰہی کے مظہر تام ہیں۔ اس لیے سب سے بڑھ کر خیر کثیر آپ کے حصے میں آیا کہ رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ہیں۔ اور آپ کے طفیل میں شیطان کو بھی کچھ خیر ملا کہ وہ آپ کی رحمت کے صدقے میں زندہ اور قائم ہے۔ البتہ وہ شر کثیر کا محل بنا۔ اور ذاتی شرِ کثیر کے باوجود وہی شیطان حکمتِ کلی میں انبیاء و اولیاء کے عروج کے لیے رحمت بن جاتا ہے۔ یہ گویا زہر سے تریاق کا کام لینے کا حکیمانہ اصول و کمال ہے۔ مثال کے لیے کوئلہ اور ہیرا دونوں میں کاربن ہے۔ دونوں کی حقیقت ایک ہے۔ کوئلہ میں سیاہی ہے۔ نور نہ ہونے کا نام سیاہی ہے۔ نور آیا تو ہیرا بنا۔ اسی طرح عدمیت و شریت نفس کا خاصہ ہے اور جس حد تک خیر ہے مِنَ اللہ ہے۔ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۔ وَمَا اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ۔ وَمَا اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ (۵/۸)

حضرت یوسفؑ نے فرمایا۔ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ (۱۳/۲) نفس کا شر اصلی ہے۔ البتہ رحم و خیر فضلِ ربی ہے۔ اسی لیے فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ (۲۷/۶) کا حکم ہے۔ یعنی اپنے کو پاکیزہ مت جتاؤ۔ کیونکہ تم شر ہو۔ البتہ جب ہم خیر دیں تو اولیاء اللہ کی طرح خیر کو ہماری طرف سے جانو اور اظہارِ نعمت کرو۔ شیطان کی طرح خیر کو اپنی طرف راجع نہ کرو۔

سینما کا نور تصاویر کو ظاہر کرنے والا ہے، نہ کہ نور تصویر ہے۔ اس لیے نور
کھا رہا ہے، نور چوری کر رہا ہے، نہیں کہتے۔ بلکہ ان افعال کو تصاویر کی طرف
منسوب کرتے ہیں جو نور سے نمایاں ہوتی ہیں۔ اسی لیے اللہ اور ہے، بندہ
اور ہے۔ سبحان اللہ، یعنی اللہ اشیا کے عیوب سے پاک ہے، البتہ اقامۂ
وجود (تخلیق) کی وجہ سے حق کا خلق سے ربط ہے۔ سر سے پیر تک اللہ کا نور ہے
الحمد للہ (یعنی سب حمد و خوبی اللہ کی ہے) یہی بصیرتِ محمدی کا ہے۔ اور بندہ
تصاویر کی طرح اپنے سارے لوازم و اقتضاءات کا مرجع ہے، بجز نور کے۔
نور (وجود) اس کے لیے زاید بر ذات (عدم) ہے۔ اسی مسئلہ کے غلط علم کی
وجہ سے بعضوں کے پاس معصیت عبادت بن گئی ہے کہ بلا لحاظ ماں، بہن،
بیٹی سب روا رکھتے ہیں۔ اور اسے توحیدِ وجودی کی تکمیل کی سند سمجھتے ہیں کہ
سب اللہ ہے۔ معاذ اللہ۔

**(۶) خلقِ موت و حیات** — خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا (۲۹/۱) (اللہ نے) موت و حیات
کو پیدا کیا تاکہ آزمائے تم کو کون تم میں سے عمل میں بہتر ہے۔ اس میں موت
کو پہلے کیوں بیان کیا گیا۔ اس پر فرمایا۔ اصل یہ ہے کہ موت و میت کوئی
ایجابی چیز نہیں ہے۔ حیات نہ ہونے کا نام موت ہے۔ البتہ اسم حی کا میت
کے ساتھ جو ربط آکر پڑا ہے وہی خلق (پیدا کرنا) کہلاتا ہے۔ جس کی وجہ سے
ہمارا اصلی میت پن (موت) پہلے نمایاں ہو رہا ہے۔ اور اسی کے ساتھ
اس کے لوازم جہل، نقص، صورت وغیرہ نمایاں ہیں۔ اس کے بعد اسی
موت میں حیات نمایاں ہے، عدم میں وجود نمایاں ہے۔ جہل میں علم
نمایاں ہے۔ اضطرار میں ارادہ نمایاں ہے، عجز میں قدرت نمایاں ہے وغیرہ۔

شی میں دراصل خیر ہے ہی نہیں۔ وہ تو شی کے لیے زاید بر ذات ہے۔ خیر وجود کا لازمہ ہے۔ اور شر بندے کی ذات کا لازمہ ہے، جس کو بعینہٖ اللہ نے ظاہر کر دیا۔ اسی لیے کہا گیا کہ خیر و شر دونوں کا ظہور مِنْ عِنْدِ اللّٰہ ہے۔ یعنی اللہ کی تخلیق سے ہے۔ شر (عدم اور اس کے لوازم جہل بیماری وغیرہ) اس کا ذاتی ہے۔ اور وہ شی ویسی ہی ہے اصلاً ذاتاً۔ البتہ اس میں حسنہ اور خیر کی جہت وجود کے فیضان کی وجہ سے ہے جو اس کے لیے زاید بر ذات ہے، فضل و عطا ہے۔ عدم کوئی شی نہیں اور نہ شر کوئی ایجابی حقیقت ہے۔ بلکہ وجود جو اللہ کی ذات بھی ہے خیر حقیقی ہے۔ وجود نہ ہونا عدم، اور خیر نہ ہونا ہی شر ہے۔

## ۵۱ خلق و کسب کے لیے سینما کی مثال

اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۲۴:۳۵)
اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔

نور کا خاصہ یہ ہے کہ خود ظاہر ہو کر دوسرے کو ظاہر کرے۔ اللہ خود ظاہر ہو کر اشیا کو نمایاں کر رہا ہے۔ اشیا کی حقیقت صرف معلوم ہے۔ صفتِ علم میں اُن کا ثبوت ہے۔ اس کے آگے ذات میں رسائی کہاں۔ لیکن چونکہ اسم صفت ذات سے جدا نہیں اس لیے ذات کا ایک اعتبار لیا جاتا ہے صفتِ نور کے متعلق ہونے کے بعد ہی، یعنی تخلیق کے بعد ہی اشیا نام پاتے ہیں۔ مثلاً "سینما کا نور تخلیقی کام انجام دیتا ہے۔ کالی نیلی پیلی تصویریں اندھ ظلمت میں ہیں۔ نور کا کام اقتضائے ذات کے مطابق ہر چیز کو ظاہر کر دینا ہے۔ جب نور آ جائے اور تصاویر کو من وعن ظاہر کر دے تو تصاویر پر کالی گوری کا حکم لگتا ہے، نہ کہ نور پر۔ اسی طرح تخلیق کے عمل سے پہلے نہ کوئی چیز اچھی ہے نہ بُری۔ جب نور سے اشیاء کا ظہور ہو جائے تو نیک و بد کا حکم اشیا پر لگتا ہے نہ کہ نور پر۔

دھوکا رہتا ہے۔

**(۸) فصوص الحکم** فرمایا۔ بعض جاہل جنھیں علم صحیح حاصل نہیں ہوتا فصوص الحکم کے بعض ابواب پڑھ کر بہک جاتے ہیں۔ اور غش قسم کے مراقبے کر کے اپنے ایمان کو ہلاکت میں ڈالتے ہیں۔ خلق افعال اور کسب افعال کے مسئلہ کو غلط ملط کر دیتے ہیں۔ احتیاط واجب ہے اس معرکۃ الآراء کتاب میں حضرت شیخ اکبر محی الدین عربیؒ نے جو معارف قلمبند فرمائے ہیں، بیشتر دقیق بلکہ اَدَق ہیں۔ اور پھر ان کا بیان بھی بے باک، بے دھڑک ہے۔ عارفین تو اس سے کامل فائدہ اٹھاتے ہیں، لیکن عام طور پر اس کے مطالعے سے لوگ غلط فہمی میں پھنس جاتے ہیں۔ معتقد اور معترض دونوں نقصان اٹھاتے ہیں۔ تاہم حضرت کا مسلک اسلم ہے۔

اَلْعَبْدُ عَبْدٌ وَاِنْ تَرَقّٰی　　　وَالرَّبُّ رَبٌّ وَاِنْ تَنَزَّلْ

**(۹) ہبوطِ آدمؑ** سوال۔ جنت گناہ کا محل نہیں۔ حضرت آدمؑ کی غلطی اور هُبُوطِ اِلَى الْاَرْضِ کا کیا مطلب ہے۔ فرمایا۔ قرآن میں آدمؑ اور ابلیس کا جو قصہ بیان کیا گیا ہے، اس کا تعلق عالمِ امر، عالمِ مثال سے ہے۔ اس عالم میں بھی تخلیق ہے۔ تصویر ہے۔ ارشاد ہے۔ وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ (۷/۱۱) عالم مثال وغیرہ میں بھی جبتیں ہیں یعنی خلقتیں ہیں جن کے آثار کبھی عالمِ شہادت میں آتے ہیں کبھی نہیں۔ حضرت آدمؑ کی تخلیق اور روئے زمین سے پہلے کی زندگی عالمِ امر میں تھی۔ فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ (۷/۲۲) یَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوْاٰتِهِمَا (۷/۲۷) ترجمہ: جب آدمؑ و حوا نے درخت کو چکھا۔ شیطان نے ان کا لباس اتروا دیا تاکہ دکھلا دیوے ان کو پردہ کا بدن (شرم گاہیں ان کی)۔ اس عالم میں جو غلطی ہوئی اس کی بنا پر

اِسی لیے اللہ کے لیے جامع صفتِ حیات کا اور بندے کے لیے جامع صفت موت کا اِس آیت میں ذکر فرمایا۔

**(۷) خلاصہ ۱ تا ۶** مختصر یہ کہ خلق فعل اللہ کی طرف سے ہے۔ اور کسب فعل بندے کی طرف سے۔ اللہ خالقِ فعل ہے تو بندہ کاسب فعل و عمل۔ وَاللّٰہُ خَلَقَکُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ (۲۳) ترجمہ: اللہ نے تم کو پیدا کیا اور جو کچھ تم عمل کرتے ہو۔ فاعلِ حقیقی اور فاعلِ مجازی کے الفاظ گمراہ کن ہیں۔ "اللہ ہی فاعل و منفعل ہے" کے الفاظ مزید گمراہ کن ہیں، غیرواقعی ہیں۔ ایسے لوگ بے ادبی اور جہل سے ساری معصیتوں کا مرجع حق کو بنا کر ایمان تباہ کر لیتے ہیں۔ اُن سے تو مجمل ایمان والا عامی بسا غنیمت ہے جس کو ایمان و ادب کی برکت سے اعلیٰ مقامات ان موحدین باطلہ کے مقابل حاصل ہو جاتے ہیں۔ سب افعال اکل و شرب، نکاح زنا، چوری وغیرہ ہمارے ذاتی ہیں۔ ہم ان کے فاعل ہیں۔ البتہ حول و قوت کے ذریعے تخلیق کر کے ان افعال کو نمایاں کرنا حق کا کام ہے لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ : $\frac{15}{12}$ حول و قوت اللہ ہی کی ہے۔ اللہ ان افعال کا نہ تو فاعل ہے، نہ منفعل ہے، بلکہ صرف خالق ہے، یعنی صفتِ نور وجود سے ظاہر کرتا ہے، سینما کے نور کی طرح۔

توحید افعالی سب سے بڑا نازک مقام ہے جہاں اچھے اچھے پھسل کر گرتے ہیں۔ یہیں رب اور عبد کی دو ذاتیں کھلتی ہیں۔ اس کے بغیر نہ تو ثنویت صاف ہوتی ہے اور نہ توحید وجودی کھلتی ہے۔ قلب میں ہمیشہ ضیق رہتی ہے اسی لیے حضرت غوث الاعظمؒ کی تعلیم کا سارا زور توحید افعالی پر ہے۔ اس کے بغیر نہ اوپر کے مقامات کھلتے ہیں اور نہ نیچے کے۔ سب وضو کا ہی

کھلانا ہے۔ حضرت عمرؓ کی بڑائی کا راز یہی تھا کہ حضورؐ نے فرمایا "اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو عمرؓ نبی ہوتا۔ عمر جس گلی سے گزرتا ہے شیطان بھاگ جاتا ہے"۔ اللہ نے ہر نبی کے لیے شَیَاطِیْنُ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ پیدا کیے ہیں جن سے مقابلہ لازمی ہے۔ اسی میں اُن کی قوتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ اسی لیے شیطان شناسی پر اکابر بہت زور دیتے تھے۔ میں بھی اسی کا قائل ہوں۔ آج کل مشائخ حق شناسی پر بہت زور دیتے ہیں۔ شیطان کے چکر سے واقف نہیں حالانکہ سلوک میں مجاہدہ کے لیے شیطان اور اُس کے داؤ پیچ سے واقفیت لازمی ہے۔ قرآن شیطان کو ہمارا سب سے بڑا کھلا دشمن بتاتا ہے۔ لہذا ہم کو سب سے پہلے اِس دشمن سے محفوظ ہونا چاہیئے تاکہ قرآن کھلے اور جملہ کام اطمینان سے ہوسکیں۔

ایک صاحب نے کہا۔ میں نے حضرت غوث اعظمؓ کی جناب میں متوجہ ہوکر عرض کیا۔ حضرت نفس و شیطان میرے بڑے دشمن ہیں۔ ان کو مار ڈالیئے۔ حضرت برنی صاحب نے فرمایا ٹھیک ہے۔ جو دشمن ہمارے قابو سے باہر ہیں اُن کے قتل کے لیے کہنا تو مناسب ہے۔ لیکن نفس و شیطان تو ہمارے قابو میں ہیں۔ اُن سے تو ہم کو ہر وقت جنگ و جہاد کا حکم ہے۔ ان کو بھی حضرت کے حوالہ کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ کہیں ہم کو کھانا کھلادو ہم کو چلادو وغیرہ۔ قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ امور غیر اختیاری کو سپرد کرنا مناسب ہے۔

(۱۴) شیطان کا شکار | جب تک اُنیّت (میں پن) باقی ہے شیطان حملہ کرتا رہتا ہے۔ ناچیز نے عرض کیا۔ کیا غوث اعظمؓ کی انیت مردہ نہیں ہوتی کہ شیطان اخیر وقت تک اُن کے ساتھ لگا رہتا۔

جنت سے نکال کر عالمِ شہادت میں منتقل کیا گیا۔ اور یہاں حکمت کے تحت زندگی شروع ہوئی۔ اسے مشکل کیوں سمجھا جائے جبکہ عالم امر و مثال کی مخلوق ملائکہ جبرئیل تک حضرت ابراہیمؑ، حضرت لوطؑ اور حضور انور صلعم کے پاس انسانوں کی شکل میں تجلی و تمثل کر کے عالمِ شہادت میں آتے تھے اور اب بھی شبِ قدر وغیرہ میں آتے ہیں۔

**(۱۰) حقیقتِ شیطان** | بعض جاہل کہتے ہیں کہ شیطان کا علم رسول اللہ کے علم سے بڑھ کر ہے۔ کیونکہ وہ ہر نفس کی حقیقت سے واقف رہتا ہے اور رگ رگ میں دوڑتا ہے۔ ان نادانوں کو یہ تک نہیں معلوم کہ رسول اللہؐ نے دنیا کو شیطان کی حقیقت سے واقف کرایا۔ شیطان تو آدمؑ کی حقیقت بھی نہ سمجھ سکا تو رسول اللہؐ کی حقیقت، رسالت، علم اور توحید کو کہاں پا سکتا ہے۔

**(۱۱) نفس و شیطان** | شرارت ہی شیطان ہے۔ اور نفس کا خاصہ شرارت ہے۔ شیطان شر کا سب سے بڑا تعین ہے۔ شیطان بہکانے والا ہے اور نفس بہکنے والا ہے۔ یہ ایک دوسرے کے مددگار ہیں یَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْٓءِ وَالْفَحْشَآءِ (۲/۵) وہ (شیطان) تم کو برائی اور بے حیائی کا حکم کرتا ہے۔ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْٓءِ (۱۲/۱۳) تحقیق نفس برائی کا حکم کرتا ہے۔ یہ تو ہر ایک کا خاصہ ہوا۔ شر شیطانی خطرہ سے اور خیر رحمانی خطرہ سے آتا ہے۔ اگر نفس نے شیطانی خطرے کو اختیار کیا تو شر ہوگا۔ اور رحمانی خطرے کو اختیار کیا تو خیر ہوگا۔ علم غلط کے محل کو نفس، اور علم صحیح کے محل کو قلب کہتے ہیں۔

گنہگار کا نفس بہ وجہ معصیت کمزور ہو جاتا ہے۔ اور عابد کا نفس اگر علم صحیح نہ ہو تو بہت موٹا بلکہ خطرناک ہو جاتا ہے۔ گویا سانپ کو دودھ پلانا ہے

دوسرے وہ لوگ ہیں جو شر ور اور اس کے ماحول و فضا کا پورا علم رکھتے ہیں۔ لیکن محفوظ رہتے ہیں۔ تیسرے وہ لوگ ہیں جو شر کی آگ میں جھلستے ہیں (ایسے علم و عمل سے پناہ مانگی گئی ہے) اور بدصورت ہو جاتے ہیں۔ حسن میں فرق آجاتا ہے۔ لیکن طبیب حاذق ہو، علاج اچھا ہو تو صحت ہو کر بدصوررتی دور ہو جاتی ہے۔ لیکن ایسا شخص اس شخص کا مقابلہ نہیں کرسکتا جو عمر بھر صحت مند، حسین رہا ہو۔

**(۱۵) دینی کام میں نفس کا چکر** ایک صاحب نے اپنے ایک فرد خاندان کی تیمارداری ملتوی کر کے ایک دینی خدمت انجام دی۔ فرمایا۔ اسلام نے اس عالم میں سب سے زیادہ وقت کی قدر بتائی ہے۔ لاابالی پن نہ دین میں پسندیدہ ہے اور نہ دنیا میں۔ پہلے فرض مقدم ہے۔ اس کے بعد نفل ہے۔ جسمانی تکلیفوں میں حق تیمارداری ادا کرنے میں نماز تک کی قضا جائز رکھی گئی ہے۔ مقصود کیا ہے۔ صرف موقع محل کا امتیاز ہے۔ اس کا خیال رکھنا چاہیئے۔ بعض وقت اس طرح دینی کام کو مقتضا کے خلاف مقدم کرنے میں نفس کا چکر رہتا ہے۔ بڑا ادیو (نفس) دل میں بیٹھا رہتا ہے۔ یعنی یہ کہ ہم دین کے ایسے کارگزار ہیں کہ اپنے دنیوی کام چھوڑ کر دینی کام کرتے ہیں۔ اگر اس طرح دینی کاموں میں بھی نفس نے بڑائی اختیار کی تو شیطنت پر آگیا۔ ایسی صورت میں فیضان رک جاتا ہے، جواب طلب ہو جاتا ہے۔

**(۱۶) عارفین کا نفس** ایک صاحب نے ایک عارف کامل کے بارے میں بیان کیا کہ انھوں نے فلاں معاملہ میں نفسانیت برتی۔ فرمایا۔ عارفین نے نفس کے باب میں لکھا ہے کہ بڑے بڑے

فرمایا۔ حالات اور محل مختلف ہیں۔ ایک وہ انسان ہے کہ جنگل میں جاکر شیر کا شکار کرتا ہے۔ اس کے برخلاف شیر گاؤں میں آکر انسانوں کا شکار کرتا ہے۔ دونوں میں بڑا فرق ہے۔ شیر اور انسان ہی کا تعلق دونوں محل پر کام کر رہا ہے۔ ایک میں شیر انسان کا شکار بنتا ہے، تو دوسرے میں انسان شیر کا شکار بنتا ہے۔ اگر انیت فنا نہ ہو تو شیر (شیطان) ہمیں شکار کرتا ہے۔ غوث اقطاب کی انیّت فنا ہو چکتی ہے۔ لہذا وہ شیطان کا شکار کرتے ہیں، بھگاتے ہیں مارتے ہیں۔ اسی جہاد میں انسان کی ترقی ہے، کمال ہے۔ ورنہ انیّت میں پستی ہے، تنزل ہے۔

**(۱۱۳) نفس کی مثال** بعض مشائخین اور علماء کے نفسیاتی مطالعہ سے اندازہ ہوا کہ یہ خدمتِ اسلام کے لیے بے نفسی کا دعویٰ کرتے ہیں۔ لیکن احساسِ برتری میں مبتلا رہتے ہیں۔ نفس و شیطان کے چکر میں ہیں۔ اَنَا خَیْرٌ مِّنْہُ ان کا مقام رہتا ہے۔ حضرت خلیل احمد پروفیسر علی گڑھ بڑے صاحب دل بزرگ تھے، فرماتے تھے۔ نفس کی مثال سوّر کی سی ہے۔ اس کو حلال دودھ بالائی کھلا کر، نہلا دھلا کر کتنا ہی پاک صاف بنائیں، سوّر کا ہر بال نجس رہتا ہے۔ اسی طرح نفس حرام کا حرام رہتا ہے نفس شر کا حکم کرتا ہے بجز اس کے کہ اللہ رحم کرے۔ اس کا شر صرف علم صحیح سے دفع ہوتا ہے۔ اللہ نفس و شیطان سے بچائے۔

**(۱۱۴) نفس کا شر اور مختلف گروہ** صرف علمِ صحیح سے نفس کے شر کی پہچان ہوتی ہے اور اس کا علاج بھی علمِ صحیح ہے۔ بعض لوگ ملکوتی صفت ہوتے ہیں جن کو شر کا علم نہیں ہوتا، جو شر کی آگ میں جھلستے نہیں اور خیر ہی خیر میں رہتے ہیں۔ اُن کی حالت تجریدی ہوتی ہے۔

ظاہر (خارج) سے باطن کو۔ اس لیے محفل میں بڑی جگہ حاصل ہونے کو اعز اللہ خیال کریں اور نہ اس کی تلاش میں رہیں۔

**(۱۸) شر کی کشش کی وجہ** ہماری ذات میں بوجہ عدمیت شریحا شر ہے۔ اسی لیے نفس شر (گناہ) سے اجنبیت محسوس نہیں کرتا بلکہ مجانست محسوس کرتا ہے اور خیر مقدم کرتا ہے۔ اور شیطان جو شر کا سب سے بڑا متعین ہے اس کا مددگار ہوتا ہے۔ نفس و شیطان کی شر کے ساتھ ہم مذاقی ہے۔ اس لیے طبیعت شر کی طرف مائل ہوتی ہے۔ دوسرے یہ کہ شر میں لذت فوری حاصل ہوتی ہے اور نفس کے مطابق ہے اس لیے بھی شر کی طرف میلان فطری ہے۔ اس کے برخلاف خیر کی طرف بڑھنے میں گرانی، تکلف اس لیے ہوتا ہے کہ وہ ایک زائد چیز ہے۔ خیر اضافی ہے، شر ذاتی ہے۔ خیر زاید بر ذات ہے۔ خیر میں عروج ہے، شر میں نزول ہے۔ چڑھنا مشکل ہے۔ گرنا آسان ہے۔ علاوہ ازیں خیر کا نتیجہ اور لذت آخرت کے ساتھ وابستہ ہیں۔ اس لیے نفس و شیطان کے ساتھ کشمکش کر کے، اللہ رسول ؐ کی خاطر، شر کو چھوڑنا اور خیر کو اختیار کرنا خاص درجات کا ضامن ہے اور فضل پر منحصر ہے۔ وَالعَاقِبَۃُ لِلمُتَّقِین سب سے بڑا عارف باللہ وہ ہے جو نفس و شیطان کی جبلتوں کو پہچانے۔

**(۱۹) خطرات کی تمیز اور اصلاح قلب** فرمایا۔ بچپنے سے بڑے تک ہر ایک پر پیدائش سے موت تک ہر آن، حتیٰ کہ خواب میں بھی خطرات و خیالات کا تسلسل بندھا رہتا ہے خطرات بندے کے اختیاری نہیں۔ خطرات کا ہر آن قلب پر تقاطر ہوتا رہتا ہے۔ خطرہ جھپ کے ساتھ دل میں اتر جاتا ہے اور آدمی اس کے تابع ہو جاتا ہے

مقامات پر پہنچ کر بھی وہ اپنی فطرت دکھاتا ہے۔ اس سے کبھی مامون نہیں ہونا
یہ بھی ہوتا ہے کہ عارفین بعض وقت امر کے تحت حضرتِ خضرؑ کی طرح کوئی ایسا عمل
کرتے ہیں جو بظاہر بدنما ہوتا ہے۔ اگر بالفرض نفسانیت کے تحت بھی ان کا عمل
ہو تو نفس بھی تو لطیف و کثیف ہوتے ہیں۔ کبھی نفس بہت کثافت دکھاتا ہے
اور کبھی لطیف طریقہ پر لغزشیں کرتا ہے۔ اگر نفس بھی مانا جائے تو اُن کا نفس
دوسروں کے مقابلے میں اصلاح یافتہ ہوتا ہے۔ ایک بات یہ ہے کہ ایسے
عمل کو ہمیشہ نفس کے تحت نہیں کہہ سکتے۔ البتہ اقتضائے ذات کہہ سکتے
ہیں جو نفس سے اعلیٰ ہے۔

## (۱۷) کان کی لذت

انسانی فطرت ہے۔ کان سے بہت لذت لیتا ہے
حتیٰ کہ سلوک میں سب کے آخر میں کان کی لذت
کا ازالہ ہوتا ہے۔ اس لیے تعریف وغیرہ سے بہت ہوشیار رہنا چاہیئے۔ اگر
کوئی میری تعریف کرے تو میں گھٹا دیتا ہوں۔ بُرائی کرے تو اُس میں خود
میں اضافہ کر دیتا ہوں۔ انسانی فطرت ہے۔ یا تو امیدوار ہوتی ہے یا خائف
اسلم طریق یہ ہے کہ ہمیشہ عدمیت ملحوظ رہے۔ سارے عالم کو میّت جانے
نہ کسی سے امید رکھے اور نہ تعریف سے متاثر ہو۔ اگر عند اللہ مقبول ہے
تو خوشی مناسب، ورنہ بے سود ہے۔ مخلوق کا کہنا سند نہیں۔ عارف خلق
کی خوشی، ناخوشی سے بالا ہوتا ہے۔ ہر امر میں اُسے رضائے حق مطلوب ہوتی
ہے۔ لہٰذا تعریف کو فضل جانے، اس کے پیچھے نہ پڑے۔ اگر کوئی ہماری
بُرائی کرے تو ہم ذاتاً برے ہی ہیں۔ مخلوق نہ اس میں اضافہ کر سکتی ہے
نہ کمی۔ لہٰذا مخلوق سے نہ گھبرائیں، اللہ ہی سے خائف رہیں۔ ذاتاً ہم کسی
عظمت و تعریف کے قابل نہیں۔ ہمیں باطن سے ظاہر کو متاثر کرنا چاہیئے نہ کہ

سوائے اس کے کہ چور ہی سے دوستی ہو جائے۔ ایسی صورت میں بھی
پولیس کے ذریعے پکڑے جانے کا خوف قلب پر طاری رہتا ہے۔

جس دل میں اللہ کا خوف ہو اس سے شیطان ڈر کر بھاگتا ہے۔ اور
جو شیطان کے دوست ہو جائیں تو وہ ان کو پچھاڑتا ہے۔ جب رحمانی و نفسانی خطرات
کی پہچان شروع ہوتی ہے تو جس طرح ٹیلیفون اٹھاتے ہی آواز یا طرز سے پہچان لیتے ہیں کہ فلاں
صاحب ہیں۔ اسی طرح رحمانی و نفسانی خطرات کی فوراً پہچان ہو جاتی ہے۔ اس کے پہچان کے لیے
کوئی قاعدہ کلیہ مقرر نہیں۔ یہ ذوق کی چیز ہے۔ اور دنیوی معاملات میں بھی، ذوق کی چیزیں
صحیح ذوق ہی سے سمجھ میں آسکتی ہیں۔ اللہ مجاہد کی محنت ضائع نہیں کرتا۔ رحمانی خطرہ کے بعد دلیل استدلال
کرنا شیطانی چکر ہے۔ اس سے بچیں ورنہ رحمانی فیض بند ہو جاتا ہے۔ غلطی ہو تو توبہ کریں اور اپنے عمل کو برا کہیں۔

**امر جلی۔ امر خفی**

امر کی دو قسمیں ہیں۔ امر جلی۔ امر خفی یعنی ظاہری احکام
باطنی احکام۔ مثلاً۔ فوج کا نظام جس میں دو قسم کے
احکام ہوتے ہیں۔ ایک موٹے موٹے احکام کہ صبح بگل کے ساتھ وردی پہن کر
وقت پر میدان میں آجانا۔ حکم کی تعمیل کرنا جس سے ڈسپلن رہتا ہے۔ اور
پچاس روپے کا سپاہی بنتا ہے۔ لیکن جب روزانہ کی تعمیلِ احکام سے اطمینان
ہوتا ہے تو اس کو اعلیٰ ٹریننگ دی جاتی ہے اور بڑے عہدہ پر ترقی دی جاتی
ہے اور راز کے احکام (امر خفی) دیئے جاتے ہیں۔ جب چند روپوں کے لیے، چند
روزہ زندگی میں، حکومت کے احکام کی تعمیل میں، اپنے وجود، مرضی اور فعل
کو حکومت کے احکام کے تابع کر دیتے ہیں۔ تو کیا اللہ کے احکام جلی نہ مانیں
جو ہم کو عدم سے وجود میں لایا۔ اس لیے ہمیں اذان سنتے ہی نماز کے لیے آنا
چاہیئے جو بمنزلہ بگل ہے۔ فرض نماز، روزے کے ساتھ حقوق العباد ادا کرنا
چاہیئے۔ جس کے بعد امر خفی یعنی خطرات رحمانی کا علم ملنا شروع ہوتا ہے۔ امر جلی

اس کے خلاف کوئی اسباب، اہتمام اور علم و ارادہ کام نہیں دے سکتے۔ مثلاً اچھی خاصی دوستی ہے۔ لیکن ایک خطرہ دل میں آیا تو لاکھ غلط فہمی دور کرنا چاہیں خطرہ ہٹتا نہیں۔ یہی حال محبت کا ہے۔ محبت دل میں آجائے تو پھر انسان سارے موانع کی پروا نہیں کرتا۔ خطرہ بڑا بے پناہ ہوتا ہے۔ بقول غالب۔

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد پر طبیعت ادھر نہیں آتی

کوئی کوئی خطرہ اتنا قوی ہوتا ہے کہ نیندیں حرام ہو کر خودکشی کی نوبت آتی ہے اس طرح اوّل خیال (خطرہ)، پھر قول، پھر عمل کا سلسلہ ہر انسان پر طاری رہتا ہے۔ یہ خیر ہوتا ہے یا شر، رحمانی یا شیطانی۔ عالم میں ہمارا ہر عمل و اثر محفوظ رہتا ہے۔ فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ الخ (۳۰/۹۹)

خطرہ (علم) کا تعلق قلب سے ہے۔ قلب کی اصلاح ہو جائے تو توابع (قول و فعل) خودبخود درست ہو جاتے ہیں۔ اس لیے تمام انبیاء، اولیا نے اصلاحِ قلب پر زور دیا۔ حضرت غوث اعظمؒ کی تعلیم کا خاص امتیاز یہ ہے کہ نفس و شیطان کی جنبشوں اور شیطان کے ایجنٹ، جن و انس کے وساوس و خطرات کی پہچان سکھاتے ہیں۔ اور اُن کے خلاف جہاد بتاتے ہیں۔ اور یہ تمیز سکھاتے ہیں کہ کون سے خطرات رحمانی ہیں اور کون سے شیطانی، نفسانی۔ ربوبیت سے ربط خطرات ہی کے ذریعے پیدا ہوتا ہے۔ رحمانی خطرہ کی پہچان یہ ہے کہ وہ معزز مہمان کی طرح شان و شوکت سے قلب پر آکر قائم رہتا ہے، جس سے لذت و سرور حاصل ہوتے ہیں۔ اس میں لطافت و رفعت ہوتی ہے گویا آسمانوں پر ہیں۔ یہ اسباب کا محتاج نہیں ہوتا۔ اسباب کو چاہیں تو فیضان رُک جاتا ہے۔ لیکن شیطانی خطرات میں پستی ہوتی ہے۔ اس میں اسباب کے چکر، دماغی فکر ہوتے ہیں چور کی طرح آتے ہیں۔ ان میں بے لطفی، کدورت، تذبذب رہتا ہے

## (۲۱) وساوس و خطرات

وسوسہ شیطانی ہوتا ہے۔ اور خطرات رحمانی اور شیطانی دونوں ہو سکتے ہیں۔ وساوس انسان کے قلب پر آتے ہیں۔ لیکن ان کی مثال چور کی سی ہے کہ ڈرتے ڈرتے سہمے ہوئے آتے ہیں۔ ان کی پہچان یہ ہے کہ ان کو قیام و قرار و قوت نہیں۔ اس کے برخلاف خطرات مخالف ہوں یا موافق، جم کر آتے ہیں۔ ان میں قیام و قرار ہوتا ہے۔ بعض وقت ایک خطرہ آتا ہے لیکن اپنا اثر و عمل دکھلائے بغیر غائب ہو جاتا ہے۔ سوال ہوتا ہے کہ آخر اس خطرہ کا مقصد کیا تھا۔ وہ دراصل انسان کا اقتضا تھا۔ اسی سے تو عالم میں ہلچل ہے۔ ان وساوس و خطرات کا واحد علاج علمِ صحیح (ایمان) ہے۔ اس کے بعد وہ ایسا بھاگتے ہیں جیسے نور سے ظلمت۔ بحث، حجت، تکرار کا کوئی حاصل نہیں۔ بعض وقت قلب پر کفر، شرک یا شیاطین کا زور ہوتا ہے، بڑی ضیق رہتی ہے۔ ان کے مقابلے میں ہمارا قلب کبھی غالب ہوتا ہے، کبھی مغلوب۔ خطرہ آتے ہی مسلح ہو جانا چاہئے۔ اس وقت قلب میں جو اعتبار آئے اس کے تحت مقابلہ کرنا چاہیے۔ سکنڈوں کی بات رہتی ہے۔ اتنی مہلت نہیں ملتی کہ نسبتوں دعاؤں کی طرف توجہ کر سکیں۔

بعض خطرے بے پناہ ہوتے ہیں جن کا علاج بظاہر ممکن نہیں۔ ایسی کشمکش صورت میں، دعا، توجہ اور نسبت سے استفادہ کر کے انھیں کالن پڑتا ہے۔ اوپر اولیاء اللہ کی نسبتوں کا جال لگا رہتا ہے جو بعضوں کے خطرات کو قلب انسانی میں داخل ہونے سے روک کر واپس کر دیتے ہیں۔ جیسے کوئی کسی چور کو کسی کے گھر میں داخل ہونے سے پہلے روک دیتا ہے۔ اس میں اس خطرے کو دوسرے کے بجائے اپنے پر وارد کرنا پڑتا ہے۔ اور اس کے بعد

کی تعمیل کے بغیر امرِ خفی نہیں کھلتا اور نہ امتیاز نصیب ہوتا ہے۔

**(۲۰) خطرات کا محاسبہ** ارشاد ہے۔ وَاِنۡ تُبۡدُوۡا مَا فِیۡۤ اَنۡفُسِكُمۡ اَوۡ تُخۡفُوۡهُ يُحَاسِبۡكُمۡ بِهِ اللّٰهُ (۳/۸) ترجمہ اور اگر ظاہر کرو جو کچھ تمھارے جی میں ہے یا اُسے چھپاؤ، اللہ اس کا تم سے حساب لے گا۔ یعنی صرف خطرات (علم) پر حکم و محاسبہ نہیں۔ لیکن ارادت کے بعد محاسبہ ہے۔ چاہے اظہار ہو یا اخفا ہو۔ خطرات کی دو قسم ہیں۔ رحمانی شیطانی۔ رحمانی خطرات کی ابتدا طبیعت کے خلاف ہوتی ہے، لیکن انجام نہایت اچھا ہوتا ہے۔ وَالۡعَاقِبَةُ لِلتَّقۡوٰی (۱۶/۱۴) شیطانی خطرات کی ابتدا بظاہر خوش آئند ہوتی ہے لیکن انجام خراب ہوتا ہے۔

خطرہ بندے کا اختیاری نہیں۔ پہلے خطرات آتے ہیں، اُن کے بعد ارادہ بنتا ہے۔ بعض وقت لاکھ ارادہ کرو خطرہ نہیں آتا۔ بعض وقت خطرات آتے ہیں، ارادہ نہیں بنتا۔ بعض وقت ایک بڑا خطرہ کسی قلب پر آتا ہے وہ لاکھوں آدمیوں کے خطرات کے برابر ہوتا ہے۔ اس لیے ایک آدمی لاکھوں پر غالب آ جاتا ہے۔

اہلِ عالم کا مدار خطرات پر ہے۔ قلب پر سارے معاملے چل رہے ہیں۔ جسمانی ڈھانچوں کی کوئی اہمیت نہیں۔ قرآن نے دو قسم کے آدمی بتائے بعض وقت نیکوں کی نیکی غالب آتی ہے تو بُرے بھی انعام پاتے ہیں۔ اُن پر فضل و رحمت ہوتی ہے۔ مثلاً توبہ، استغفار، درود پڑھنے والے اولیاء اللہ کے ذریعے۔ لیکن بعض وقت بُروں کا پلّہ بھاری ہو جاتا ہے تو بھلے بھی پس جاتے ہیں۔ گویا یہاں بھی خطرات کا غلبہ ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔ وَاتَّقُوۡا فِتۡنَةً لَّا تُصِيۡبَنَّ الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا مِنۡكُمۡ خَآصَّةً (۹/۱۴)

قوتِ دافعہ صرف ایمان سے پیدا ہوتی ہے۔ جہاں ایسی شکل آئے، کہے۔ یہ اللہ رسول کے حکم کے خلاف ہے جسے میں قبول نہیں کرسکتا۔ ساری اُلجھنوں اور وسوسوں کا حل ایمان کی قینچی ہے۔ جس سے قطع و برید ہوکر ان کی جڑ کٹ جائے گی۔ ورنہ وسوسوں کی خاصیت ہے کہ ایک کو ہٹایا تو دوسرا آیا۔ خود رَو جنگل کی سی کیفیت ہے۔

وسوسہ دیکھنے میں پہلے بہت چھوٹا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن جب وہ قائم ہوجائے تو اسی باطل اعتقاد پر عوالم کے عوالم کھڑے ہوجاتے ہیں۔ اس کو غذا نفس سے ملتی ہے۔ ہمیشہ نفس باطل کا خیر مقدم کرتا ہے چونکہ اس کے منشا کے مطابق ہوتا ہے۔ حق آئے تو نفس خندہ پیشانی سے نہیں ملتا۔ یہی وجہ ہے کہ اس عالم میں باطل کو بہت فروغ ہے۔ باطل کا خطرہ بہت قوت دکھاتا ہے۔ اوّلاً حق بظاہر دبا ہوا سا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن انجام کار فتح و غلبہ اُسی کو ہے۔ مثالیں ہیں۔ کہیں تو حق ایسا دبا کہ کہہ اُٹھے۔ وَ زُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِیْدًا ؕ مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗۤ اِلَّا غُرُوْرًا (۲۱/۱۲) اور کہیں۔ یُحِقَّ الْحَقَّ وَ یُبْطِلَ الْبَاطِلَ (۹/۸) ہوتا ہے۔ آیتوں میں تضاد نہیں۔ البتہ ہر محل کی گفتگو الگ ہے تعمیم نہیں تخصیص ہے۔ اگر تعمیم بھی ہو تو انجام کار حق کا غلبہ مُراد ہے۔

**(۲۳) مسئلہ تقدیر** | مسئلہ تقدیر کے متعلق ایک صاحب کے سوال پر فرمایا۔ منتہیوں کی چیز مبتدیوں کو کیسے بتائیں۔ پی۔ ایچ۔ ڈی اور پوسٹ گریجویٹ کے مسائل میٹرک و مڈل والوں کو کیسے سمجھائیں۔ جن میں صلاحیت نہ ہو ان سے بیان کرنا وقت ضائع کرنا ہے تقدیر کا مسئلہ توحید افعالی کا مسئلہ ہے۔ جس کے نہ سمجھنے سے جبری اور قدری فرقے بنے۔ یہ چیز ایمان کے بعد صبر، تسلیم، رضا پر عامل ہونے سے کھل جاتی ہے۔

علم صحیح نے اُسے دفع کیا جاتا ہے۔ بعض وقت وہ آچکتا ہے اور کشمکش شروع ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد اس کو نکالنا پڑتا ہے۔ لوگ نہیں جانتے کہ اولیاء اللہ کا اس عالم کے انتظامات میں کیا دخل ہے۔ عموماً یہ سمجھتے ہیں مشین کے موٹے پہیئے ہی کام کر رہے ہیں، حالانکہ مشین کا چلانے والا سب سے بڑا اہم حصہ نظر نہیں آتا اور وہ اندر ہوتا ہے۔ لوگوں کے قلوب کے خطرات کے متعلق معلومات حاصل کرنا سفلی اور علوی دونوں علوم کے ذریعے ممکن ہے۔ سفلی میں تو ارادۂ وسعی سے کام لیا جاتا ہے۔ لیکن علوی میں اولیاء اللہ بے ارادہ رہتے ہیں اُن کو دوسروں کے خطرات کا علم ہوتا ہے۔ مشاہدہ ہوتا ہے۔ قلب کے معرکے خوب چلتے ہیں۔

## (۲۲) وسوسہ کی قوت۔ شکلیں۔ علاج

امراض روحانی کی ابتدا شیطانی وسوسہ سے ہوتی ہے جو اللہ، رسول کے علم کے خلاف آتا ہے۔ اللہ ہر ایک کو بچائے کیونکہ یہ اتنی خطرناک چیز ہے کہ اس سے نجات کے لیے ایک سورۂ ناس اُتر چکی۔ وسوسہ کیا ہے۔ گویا ٹیوب میں باریک پنکچر ہے۔ یعنی سوئی کی نوک برابر خطرہ شروع ہو گیا۔ سمجھ دار آدمی کو فوراً اسی پر ہوشیار ہونا چاہیئے کہ پنکچر بڑھنے نہ پائے۔ اس کے بعد علمِ الٰہی کے خلاف ظن شروع ہوتا ہے۔ یعنی پائی برابر خطرہ ترقی کر کے چار آنے ظن کی شکل اختیار کرتا ہے۔ اس کے بعد ظن ترقی کر کے رَیْبْ (شک) میں بدل جاتا ہے۔ یعنی آٹھ آنے شک، آٹھ آنے یقین۔ اس کے بعد شک ترقی کر کے وہم بن جاتا ہے۔ گویا شک کا غلبہ ہو گیا۔ چودہ آنے پنکچر ہو گیا۔ اس کے بعد وہم ترقی کر کے کفر و شرک والحاد بن جاتا ہے۔ ایمان ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن گھبراؤ نہیں، ہمارے پاس قرآن میں کفر و شرک کا بھی علاج ہے۔

گرفتار ہیں۔ ظاہر بیں کی عقل تو اِسے نہیں پاسکتی۔ وہ یا تو جبر میں جا لگا یا قدر میں۔ کیونکہ علم کے غرور کا ڈاٹ شیشی میں لگا ہے۔ یہ چیز شرحِ صدر کی ہے۔ اس کو عقل سے تعلق نہیں۔ عقل استعمال کرو تو نورانی لیمپ پر دھواں آتا معلوم ہوتا ہے یہ بلند مقام والوں کی بات ہے۔ لیکن چھوٹے درجے والوں کو عقل ہی استعمال کرنی پڑتی ہے۔ اُن کے حدود و آثار الگ ہیں۔ اکثر لوگ تقدیر کہتے ہیں اور تعطّل کی طرف جاتے ہیں۔ کسبِ اختیار سے انکار کرتے ہیں جو کفرانِ نعمت ہے۔ اور تقدیر کے نام سے معطل اور احدی بن جاتے ہیں۔ حالانکہ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ ہمارے افعال میں ارادہ بھی ہے اور بے ارادگی بھی۔ ارادہ کی وجہ سے ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ بلند مرتبہ میں اقتضا و تقدیر پر نظر رکھنی پڑتی ہے اور وہی خیر ہے۔ لیکن نیچے کے مرتبے میں ایک دوسرے کا امتیاز دیکھ کر خیر و شر کا حکم لگتا ہے۔ ورنہ جنّت، دوزخ، حلال، حرام عبث ہو جائیں گے۔ مثلاً کسی فلم کا ایک بہت اچھا پلاٹ ہے۔ لیکن تفصیل میں جہاں گدھا ہے اُسے گدھا۔ اور جہاں گھوڑا ہے اُسے گھوڑا، اور جہاں بدکردار ہے اُسے بد اور جہاں نیک کردار ہے اُسے نیک ماننا پڑے گا۔ یہ تمام تضادیر نور سے ظاہر ہو رہی ہیں۔ اسی طرح حکمتِ کُلّی میں ہر چیز اپنے محل پر درست ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نورِ وجود سے خلق کر رہا ہے۔ لہٰذا حسنۃ من فضل اللہ ہے اور سیّئۃ ہمارا ذاتی ہے۔

یہ چیز شرحِ صدر سے کھلتی ہے۔ عبادات و ریاضات سے بھی نہیں کھلتی علمائے ظاہر کی سمجھ سے باہر ہے۔ مولویوں کا وجود بھی اپنے محل پر ضروری ہے کہ ان کا کام پولیس کا ہے یعنی احتساب کا۔ انھیں اور تفصیلات سے

ایمان یہ ہو کہ اللہ ظالم نہیں، ہم ظالم ہیں۔ وَمَا ظَلَمْنَاهُمْ وَلٰكِنْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ (۱۲/۱۹) یعنی ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ انھوں نے خود ہی اپنے اوپر ظلم کیا۔ تمام اشیا جوں کے توں اللہ کے علم میں ہیں۔ لیکن اس عالم میں انسان کی جنبش کو بہت اہمیت ہے۔ مقصود ہل چل، سعی، جنبش، انابت و دعا ہیں۔ ہر وقت بندہ اللہ کی طرف متوجہ رہے اور دعا کی گھنٹی لگی رہے۔

اصل میں جب تک اقتضائے ذاتی کا مسئلہ سمجھ میں نہ آئے تقدیر کا مسئلہ کھل نہیں سکتا۔ ہر چیز کی تخلیق اقتضائے ذات کے مطابق ہو رہی ہے اور اس کا اپنے محل پر ہونا لازمی ضروری ہے، جس پر اعتراض، خالق کی حکمت پر اعتراض ہے۔ ایک کموڈ اور اگالدان اپنے محل پر اتنے ہی ضروری ہیں جتنا دیوان خانے کا فرنیچر اور گلدان۔ بلکہ ڈرائنگ روم اور چمن کے بغیر کام چل سکتا ہے لیکن بیت الخلا اور اگال دان کے بغیر گھر میں بیٹھنا مشکل ہو جاتا ہے۔

ایک بڑے مرشد نے کہ بادشاہ وقت تک ان کا مرید تھا، ایک کریہہ المنظر لڑکے کو دیکھا اور اعتراضاً کہا۔ ایسے کو بھی کیا بنانا تھا۔ نتیجہ یہ کہ فوراً اُس کے عشق میں گرفتار کر دیئے گئے۔ وہ موچی کا لڑکا تھا۔ چھ مہینے تک مرشد صاحب ذلت کے ساتھ اس کی دکان کے سامنے پڑے رہے۔ بالآخر توبہ کی جو قبول ہوئی۔ خالق عالم کا ارشاد ہے۔ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا۔ مصنوع پر اعتراض صانع پر اعتراض ہے۔ اس سے بچنا چاہئے۔

**(۲۴) جبر و قدر** ہر چیز ادھر سے آتی ہے۔ پتا بغیر حکم کے نہیں ہلتا۔ لیکن لوگ حکمت کو نہیں سمجھتے۔ جبر و قدر کے مسئلہ میں

ارشاد ہے۔ اِنَّ لَکَ فِی النَّهَارِ سَبْحًا طَوِیْلًا (پ۲۹) اب اشغال [illegible]
اور ساتھ ہی اپنے مقامِ معلومیت کا استحضار چاہیے۔ یعنی معلوم [illegible]
اس کے آگے کوئی علم نہیں۔ معلوم کی حیثیت یا صفتِ علم [illegible]
رسائی ہے۔ اس کے آگے صفتِ حیات ہے۔ پھر اس کے بعد ذات [illegible]
علم ہی حقیقتِ محمدیؐ ہے۔ اور وہی علمِ قرآن ہے۔ اس لیے ہماری رسائی [illegible]
انورِ الٰہی تک ہے۔ وہی ذریعہ و توسط ہیں۔ وہ جو چاہیں جتنا چاہیں [illegible]
اور دکھائیں۔

ہمارا اصل عروج و کمال اسی میں ہے کہ ہم اپنے کو معلوم [illegible]
عروج کی حالت میں ہوں یا نزول کی حالت میں۔ چاہے خاموش [illegible]
یا ہم سے بڑے سے بڑے افعال قدرت، علم وغیرہ ظاہر ہوں۔ مطلب [illegible]
تصور سے یافت و شہود کو تمام نہ کریں۔ اور اپنے علم و ارادہ سے [illegible]
صادر نہ ہوں۔ جیسا کہ بعض اشراقی یا جاہل لوگ تصورات قائم کر کے اللہ [illegible]
رسول کی ذات کو احاطہ کرنا چاہتے ہیں۔ یہ بالکل غلط اعتبار ہے۔ شہود نہیں۔
شہود کا دھوکا ہے۔ البتہ ارادت و بے ارادتی دونوں حالتوں میں [illegible] ہر
محل (عروج و نزول) پر اپنے کو معلوم دیکھنا چاہیے۔ ایسا معلوم جسے ذاتی علم
و ارادہ وغیرہ نصیب نہیں۔ اس اعتبار میں اور یافت و شہود کے تصور [illegible]
اعتبار میں زمین، آسمان کا فرق ہے۔ اس میں ضبق، تکلف، بار [illegible]۔ اس کیا
بار ہے۔ ورنہ اکثر جاہل ذہنی تعطل، نیند اور غفلت ہی کو یافت و شہود محض
و استغراق کہتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ معلوم کا رخ بعلمِ عالم۔ عالم کی جانب رہے تو [illegible]
ہے۔ اور اگر معلوم نے بعلمِ عالم عالم کو پا لیا اور اس میں محو ہو گیا

مطلب نہیں۔ لیکن عارف کے پاس عدالت ہوتی ہے۔ وہ منشا، محل اور حکمت پر نظر رکھ کر حکم لگاتا ہے اولیاء اللہ میں بعض پولیس اور عدالت دونوں کی جامعیت رکھنے والے ہوتے ہیں۔ اسی لیے عارفین ہر ایک کو اپنے محل پر کام کرتا دیکھ کر معذور بھی رکھتے ہیں۔ اور سمجھتے ہیں کہ ہر شخص اپنی اقتضا کے تحت عمل کر رہا ہے۔ دلی کے قاضی القضاۃ شریعت پناہ مولوی ضیاء الدین صاحب حضرت نظام الدین محبوب الٰہیؒ کو بدعتی کہا کرتے تھے اور آپ کچھ نہ فرماتے۔ وسیع القلبی کا عالم یہ کہ حضرت نظام الدینؒ اُن کی عیادت کو گئے اور کہلایا۔ ایک بدعتی ملنے آیا ہے۔ تڑپ گئے اور اپنا عمامہ بچھانے کو حکم دیا۔ لیکن حضرت نے عمامہ اُٹھا کر سر پر رکھ لیا اور فرمایا۔ یہ شریعت پناہ کا عمامہ ہے۔ یہ تھا شریعت کا احترام جو کاملین اولیاء اللہ کے دلوں میں تھا۔

(۲۵) معلوم | هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ۔ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (۵۷/۳) ہم اپنے علم کا کیا دعویٰ کریں۔ ہم تو معلوم ہیں۔ معلوم کو علم ہے ہی نہیں۔ اس لیے ہم کس طرح اللہ کو جان سکتے ہیں۔ احاطہ کر سکتے ہیں۔ اگر ہم نے ایسا کیا تو وہ اللہ نہ رہا۔ اللہ خود اپنا آپ عالم ہے۔ استرداد علم یہی ہے۔ ہمارا انتہائی عروج یہی ہے کہ ہم معلومیت کے مقام پر رہیں۔ یعنی ہم صرف ایک معلوم ہیں جو وجود و علم سے عاری ہے۔ البتہ ہمارا اقتضا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات وھویّت کو کیسے پا سکتے ہیں جب ہم معلوم ہیں۔ علم بھی ہماری صفت نہیں معلوم کا قیام صرف علم الٰہی میں ہے۔ اس طرح ہم ثابتۃ الذات ہیں مسلوب الوجود ہیں عدم اضافی ہیں۔ معلوم کے اوپر علم کی صفت ہے اور اس کے اوپر ھویّت ہے۔ هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ۔ البتہ اس عروج (معلومیت) کے بعد ہوش آتا ہے تو نزول ہوتا ہے۔ اور نزول کی حالت میں علم، ارادہ، فعل وغیرہ عطا ہوتے ہیں۔

## (۲۷) اقتضاءات کی رعایت

بڑا مزہ اس میں ہے کہ ہر ایک کا اقتضا دیکھیں اور اسمائے الٰہی کے مظاہر دیکھیں اور لطف اٹھائیں۔ ہر شیٔ کا اقتضا پورا ہو رہا ہے۔ برتن میں جو ہے وہی چھلکتا ہے۔ تیل ہو تو تیل، عطر ہو تو عطر۔ اس پہ ایک صاحب نے کہا۔ پھر تو کسی کو گلہ شکوہ ہونا ہی نہ چاہیئے۔ فرمایا۔ گلہ بھی تو اقتضا میں داخل ہے۔ فرق یہ ہے۔

کوئی گلہ میں، اقتضا کو دیکھ کر، قلب کو بچا کر، عقل و حکمت کا مقتضا پیدا کر دیتا ہے۔ گویا بات حلق کے اوپر ختم ہو جاتی ہے۔ بعض گلہ میں نفسانیت برت کر قلب کو غارت کر دیتے ہیں۔ گویا پیٹ بھر گلہ کرتے ہیں۔ گلہ کو غذا بنا لیتے ہیں حضرت غوث اعظمؓ کے صدقے میں غلاموں کو ایک اندازہ اور ذوق نصیب ہوتا ہے کہ کسی کام میں کتنا ٹھیریں یا کتنی جلدی کریں۔ ہر محل کا اقتضا دیکھ کر اسی کے لحاظ سے عمل کرنا مناسب ہے۔ البتہ ہر کام میں اس بات کی تمیز ضروری ہے کہ نفس کا منشا ہے یا اللہ کا۔

قرآنی مسائل کے طے کرنے میں ائمہ کے اقتضا و طبیعت کو بھی دخل ہے جو باطل نہیں ہو سکتا اور نہ نکل سکتا مثلاً ایک امام کی رائے ہے۔ آدمی عمداً ترک نماز پر کافر ہو جاتا ہے، دوسرا اس کے خلاف ہے۔

## (۲۸) فطرت اقتضا کی قوت

آج کل کے بعض مرشدین دن، رات نامحرم عورتوں میں اٹھتے بیٹھتے ہیں۔ اگر کوئی اعتراض کرے تو کہتے ہیں۔ اگر میرے نفس پر اعتبار نہیں تو مرید ہونے کی ضرورت نہیں۔ لیکن کتنے بڑے نبی حضرت یوسفؑ عورتوں کے سلسلے میں فرماتے ہیں۔ وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ۔ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَۃٌ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ (۱۳ پ) ترجمہ: میں اپنے نفس کو بری نہیں ٹھیراتا کیونکہ نفس برائی کا حکم دیتا ہے، الّا یہ کہ اللہ رحم کرے۔

**(۲۶) اعیانِ ثابتہ** اشیا کے ذوات اور لوازم کو اعیان کہتے ہیں جسے اللہ بخوبی جانتا ہے۔ مثلاً فرعون کی شخصیت مع لوازم عینِ ثابتہ کہلائے گی۔ ثابتہ سے مطلب یہ ہے کہ ہر شئی اللہ کے علم میں ثابت ہے وجود سے محروم ہے۔ اللہ کے سوا کسی کا وجود نہیں۔ اب جب اس عالم میں ان اعیان کا ثبوت ہُوا تو وہ اللہ کے وجود سے ہُوا۔ بندے کا تعیّن اللہ کے علم میں ہے۔ بندے کی حقیقت معلوم ہے۔ بندے کو چاہیے کہ اپنے کو معلوم دیکھے اور فنا کے مقام پر رہے۔ عبدیت عدم و جہل کا نام ہے۔ رَبَّنَا کہا تو استغراق حاصل ہُوا۔ اور بقا حاصل ہوئی۔ عبدیت و ربوبیت کا ہر آن صحیح ربط قائم رہے کہ رَبّ اپنے مربوب کی ساری مقتضیات کی تکمیل کرتا ہے۔ عینیت میں اجمال ہے اور غیریت میں تفصیل۔ غیریت محبوب خداوندی ہے۔

در اصل کوئی شخص (معلوم) اپنے طور پر کچھ نہیں کرتا۔ بلکہ وہ کسی خاص اسم یا چند اسماء کا مظہر بنتا ہے تو اضطراراً اس سے اُن افعال کا سرزد ہونا لازمی ہے۔ اس حکمت کو ہمیشہ ملحوظ رکھیں۔

ہر چیز اپنی اَنیت (میں پن) کا مظاہرہ چاہتی ہے۔ پاندان کہتا ہے میں پاندان ہوں۔ اگال دان کہتا ہے۔ میں اگال دان ہوں۔ اگر آپ اس کی انیت نکال دیں تو پھر وہ شئی وہ شئی نہ رہے گی۔ ہر ایک کا اقتضائے ذاتی مختلف ہوتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ ایک شخص دوسرے کے اقتضا کا تابع ہو۔ بلکہ ہر شخص کو سمجھ کر اپنا اقتضا پورا کرنا چاہیئے۔

المختصر یہ اختیار و کسب اس کے عینِ ثابتہ کے تابع ہے کہ عینِ ثابتہ جو غیر مجعول ہیں ان کے مقتضیات کے مطابق خلقِ الٰہی واقع ہوتا ہے۔ اس کی تفصیل کسی عارفِ کامل سے معلوم کریں۔

موقوف ہے۔ کوئی کلیہ نہیں۔

## (۳۰) انسانی فطرت کی پستی و بلندی

صحیح علم و نظر اللہ کا خاص فضل ہے کہ عطا ہو جائے۔ ایک شخص زنا کو برا نہیں سمجھتا بلکہ مفید اور صحت بخش بتاتا ہے۔ اور دوسرا اُس کے مرتکب کو سنگسار کرنے کے قابل سمجھتا ہے۔ انسانی فطرت کی پستی و بلندی دونوں کی انتہا نہیں۔ فطرت میں بے انتہا لچک ہے۔ اَسْفَلَ سَافِلِیْنَ (نیچے سب نیچوں کے) اور اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ (۹۵-۴) (بہت خوبصورت سانچہ) دونوں طرف امکانات حد درجے ہیں۔ بعض سفلی عمل کرنے والے جسم پر ہمیشہ غلاظت لگائے رہتے ہیں۔ اور مُرکیوں کے کمرے سنڈاس کی طرح غلیظ رہتے ہیں۔ انھیں اسی میں لذت و سرور ہے۔

## (۳۱) مُقَدّرات

ایک معاملہ میں سارے اسباب موافق تھے لیکن اثر اُلٹا ہوا۔ فرمایا۔ یہاں آکر ماننا پڑتا ہے مقدرات کو۔ اپنی بے بسی اور کسی کے قبضہ و قدرت، مشا و حکمت کو۔ بعض وقت آسان سے آسان کام مشکل بنا دیا جاتا ہے۔ اسی طرح بعض وقت مشکل سے مشکل کام آسان کر دیا جاتا ہے۔ انسان کے ہاتھ میں کچھ نہیں ہے۔ لیکن وہ پھر بھی سعی پر مامور ہے یہ عالم عالمِ سعی ہے۔ جس میں اسماء کی تجلیاں ظاہر ہوتی ہیں اور حول و قوت تو من اللہ آتی ہے۔

ایک مسلمان صاحب نے ایک بڑے عہدہ کے لیے دعائیں مانگیں، نمازیں پڑھیں، درگاہوں پر حاضریاں دیں۔ لیکن ایک دوسرے صاحب کا تقرر ہوا تو وہ اللہ میاں سے بہت برہم ہوئے۔ میں نے کہا۔ دعائیں ضائع نہیں جاتیں، کوئی حکمت ہوگی اور اگر اسے نہ مانو تو عہدہ کے ساتھ ایمان بھی چلا جائے گا۔ ایک مہینہ کے بعد ایک فساد ہوا۔ اُس افسر کو بھیجا گیا اور وہ جاتے ہی مارا گیا۔ اس

جو فطرتِ انسانی کو سمجھتا ہے وہی اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیؕ کہہ سکتا ہے۔ یاد رکھو۔ عبدیت ہی میں امن و سلامتی ہے اور دعوی میں شر و فساد۔

بعض وقت تعجب ہوتا ہے کہ فلاں نے ایسا کام علم و مرتبہ کے باوجود کیسے کیا۔ اس کے متعلق قرآن کا فیصلہ موجود ہے گو علم و تربیت زندگی میں اہم ہیں، لیکن فطرت اور اقتضا سب پر غالب آتے ہیں۔ فطرت، علم، تربیت تینوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے انبیا تو فطرت کا آئینہ ہوتے ہیں۔ اُن کا کوئی فعل نفسانیت کے تحت نہیں ہوتا۔ البتہ اُن کی فطرت اللہ کے منشا کو پورا کرتی ہے۔ مثلاً حضرت موسیٰؑ کا اقتضائے فطرت یہ تھا کہ اللہ پر ناز کیا، اور فرمایا۔ یہ سب آپ کا فتنہ ہے۔ کافروں کو مال نہ دیجئے۔ تباہ کیجئے۔ یہاں تک کہ ایک موقع پر غصہ سے کتاب (الواح) پھینک دی۔

**(۲۹) حکمت کی بات** اسلام دینِ فطرت ہے۔ قرآن عملی کتاب ہے۔ رسول اللہؐ کی تعلیم کی خصوصیت یہ ہے کہ اقتضا کو دبایا نہیں جاتا۔ بلکہ ہر ایک کے اقتضاءات کو خیر و حق کے حدود میں اظہار کا موقع دیا جاتا ہے۔ چنانچہ حضورِ انورؐ اور حضرت عمرؓ کے درمیان چند موقعوں پر اختلاف رائے ہوا۔ ہر پھول پھل اپنا رنگ، بو، مزہ دکھائے گا۔ ہر پھول کو گلاب اور ہر پھل کو آم نہ بنا دیا جائے اسی لیے حضرت صدیقؓ کی نرمی، رحم و حلم اور حضرت عمرؓ کی سختی و شدت کو عبادت و عبدیت بنا دیا گیا۔ وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ (۲/۲ ترجمہ ہر کسی کے واسطے ایک طرف ہے جس کی طرف وہ منہ پھیرتا ہے، پس نیکیوں میں سبقت کرو۔ ہر ایک کو اپنا اقتضا نیک نیتی سے پورا کرنا چاہیئے۔ کیونکہ مرضی الٰہی میں ہمارا اقتضا دوسروں کے اقتضا سے معارض ہو سکتا ہے۔ اسی لیے کسی ولی کے اقتضا کی ریس مناسب نہیں۔ دینی اور علمی نقطۂ نظر سے معلوم کے مقام پر ہر ایک کو اپنا اقتضا پورا کرنے کا موقع دینا چاہیئے۔ اس کی میعاد اور طریق کی پہچان فراست کے

اسی کا قیام، تمکن و عمل مطلوب ہے۔ بعضوں پر بے ارادتی فطری، پیدائشی طور پر طاری رہتی ہے، اس لیے تعطل و توکل میں فرق سمجھنا ضروری ہے۔

**(۳۳) ارادہ کی تین قسمیں** ایک حیوانی ارادہ ہے۔ ایک انسانی ارادہ ہے اور ایک ماموریت ہے یعنی ارادۃ اللہ۔ ایک اپنی حرکت ہوتی ہے۔ ایک مُردہ کو حرکت دی جاتی ہے۔ اور ایک یہ کہ بِحَوْلِ اللّٰہِ وَاَمْرِ اللّٰہِ مُردہ حرکت کرتا ہے۔ ان تینوں میں بڑا فرق ہے۔ حیوان سے بازپرس نہیں عامی مسلمان امرِ جلی کی تعمیل کرنے والے مزے میں ہیں کیونکہ امرِ جلی صاف ہیں۔ لیکن خواص یعنی امرِ خفی والوں کو مرضی پہچان کر عمل کرنا پڑتا ہے۔ ورنہ جواب طلب ہوتا ہے۔ ماموریت والے سے کبھی ٹکر نہ لیں۔ حضرت موسیٰؑ تک نے حضرت خضرؑ کے سامنے سکوت کیا۔

حضرت شاہ عبدالحق محدث دہلوی کو شروع میں حضرت مجدد الف ثانیؒ سے بعض مسائل میں اختلاف تھا۔ حضورِ انورؐ نے خواب میں فرمایا، شیخ احمد (مجدد) ماموریت کے مقام پر ہے اُن کی مخالفت نہ کرو۔ صبح شاہ صاحب نے اپنے صاحبزادے کو حضرت کی خدمت میں مُریدی کے لیے پیش کر کے بیعت میں داخل کرا دیا۔

**(۳۴) بے ارادتی اور عزت** بعض مشائخ اپنے عمل کی تاویل کر کے اپنی عزت و شان کی حفاظت کرتے ہیں، جو شرک فی الربوبیت ہے۔ عزت اپنی چیز نہیں۔ آپ اس کی حفاظت کرنے والے کون۔ جب اللہ نے عزت دی ہے اور یہ اُسی کی مِلک ہے تو وہی حفاظت بھی فرمائے گا اگر ہم اس کی حفاظت کے لیے نفسانی لوازم اختیار کریں تو انانیت آجائے گی۔ پس عزت کو اپنی چیز جان کر اس کی حفاظت اپنی ارادت سے کرنا نامناسب ہے۔

اطلاع پر ان صاحب نے نمازِ شکرانہ پڑھی اور نیازیں دلائیں۔

(۳۴) اِرادہ۔ بے ارادتی | فرمایا: فرشتے اور دیگر مخلوق صرف ایک ارادہ رکھتے ہیں۔ اس کے خلاف نہیں کر سکتے۔ انسان دو ارادے لایا ہے۔ اس میں ایک ارادۂ اللہ ہے اور ایک اپنا ارادہ یعنی چاہے تو خطرہ کی تعمیل کرے یا خلاف کرے۔ اس تعمیل کرنے یا خلاف کرنے میں اگر امرِ الٰہی کی موافقت ہو تو اس نے اپنے کو ارادۂ اللہ کے تابع کر دیا اور بے ارادہ ہو گیا۔ ایسی صورت میں عروج ہی عروج ہے۔ لیکن اگر اپنے ارادہ پر قائم رہا اور امرِ الٰہی کے خلاف کیا تو تنزول ہی تنزول ہے۔ بے ارادتی کا نکتہ اللہ کا خاص فضل ہے جو حضرت غوث اعظمؒ کے صدقے میں سمجھ میں آتا ہے۔ بظاہر بے ارادتی اور تعطل میں فرق کرنا مشکل ہے۔ الفاظ سے دھوکا نہ کھائیں۔ بے ارادہ ارادے سے نہ بنئے۔ عبدیت کا علم آتا ہے تو خود بے ارادہ ہو جاتا ہے۔ یہ علم وظائف و ریاضات سے نہیں ملتا بلکہ فضل و اجتبیٰ سے ملتا ہے۔ کھلتا ہے۔

اولیاء اللہ کی زندگی میں بھی ارادہ اور بے ارادتی کے مختلف واقعات پیش آتے رہتے ہیں جس سے لوگوں کو دھوکے ہوتے ہیں۔ کسی ولی اللہ کو خاص حالات میں تھوڑی دیر کے لیے بے ارادتی طاری رہی اور اس کے آثار نمایاں ہوئے۔ لیکن بعد میں ارادے والے واقعات ہوئے تو لوگ تمیز نہ کر سکے۔ بعض پر کئی دن بے ارادتی کا عالم رہا۔ بعض کی ساری زندگی بے ارادتی میں گزری۔ جس طرح بہت سے لوگ ساری عمر ارادہ میں گزار دیتے ہیں، اسی طرح یہ ممکن بلکہ واقعہ ہے کہ بعض اولیاء، غوث، اقطاب نے کل عمر بے ارادتی میں گزار دی۔ اصل میں علمِ صحیح چاہیئے کہ ارادہ اپنا ہے ہی نہیں۔ بلکہ ہم میت بحالِ مضطر، عاجز ہیں۔

## (۳۶) تحتِ امر زندگی

زندگی تحتِ امر بسر ہو تو بے ارادتی کی اعلیٰ زندگی کا لطف ہے۔ ہر شخص کا کام در اصل امر اللہ ہی کے تحت ہو رہا ہے لیکن بندہ غافل ہے۔ ہر ایک کو مجمل ایمان ہے کہ خلقِ فعل ہو رہا ہے۔ لیکن کسی پہ علم و ارادت، حول و قوت کی تفصیل کھلنے لگتی ہے۔

سعی کوشش محمود ہیں بلکہ مقصود ہیں لیکن ہر ایک کا ایک محل ہے۔ یہ نیچے مرتبہ کی چیزیں ہیں۔ لیکن اونچے مرتبے والوں کو سعی اور اپنی ارادت چھوڑنی پڑتی ہے۔ اُن کی سعی اور ترکِ سعی دونوں تحتِ امر ہوتے ہیں۔ جس طرح ہمارے اعضا، جوارح اس وقت تک کچھ نہیں کر سکتے جب تک ہماری رُوح ارادہ اور قدرت کا اظہار نہ کرے۔ اِسی طرح ہمارا کل تعین (جسم دل، روح) اللہ کے ارادے اور قدرت کے تابع ہیں، اِسی علم میں رہیں۔

حضرت غوث اعظمؓ کی زندگی قربِ فرائض کی ہے۔ فرماتے ہیں۔ سپاہی بن جا۔ یَفۡعَلُوۡنَ مَا یُؤۡمَرُوۡنَ (۱۴/۱۲) (جو حکم ہو اس کی تعمیل کرتے ہیں) میں آجا۔ فَاسۡتَقِمۡ کَمَاۤ اُمِرۡتَ (۱۲/۱۲) پر جم جا۔ فرض کے تحت جو عمل ہوتا ہے اُس کی اہمیت وعظمت اپنے ارادے کے عمل سے کہیں بڑھ کر ہے۔ مثلاً جب ایک سپاہی وردی پہن کر لڑتا ہے فیر کرتا ہے۔ جان لیتا ہے تو انعام ملتا ہے۔ اگر کوئی اُس سے ٹکر لے تو حکومت کی پوری قوتیں اس کی مدد کو آتی ہیں۔ بات یہ ہے کہ اس کا فعل بظاہر اُس کے ہاتھ پیر سے سرزد ہو رہا ہے لیکن وہ حکومت کا فعل ہوتا ہے کیونکہ حکومت کے منشا و حکم کے تحت ہے۔ اس لیے اس سے ٹکر حکومت سے ٹکر سمجھی جاتی ہے۔ لیکن اگر وردی اُتار کر کسی گھر میں وہ گھسے تو عورتیں تک پیٹ دیں گی اور اُسے پولیس گرفتار کرلے گی اور اس کا کوئی حمایتی نہ ہوگا۔ صورتاً فعل ایک ہی ہے لیکن احکام و آثار مختلف ہوتے ہیں۔ اِسی طرح ایک ڈاکٹر دواخانے میں مریضوں کے سر پیٹ چیرتا

البتہ یہ چیز تحتانی مرتبے والوں کے لیے مناسب ہے۔

اکابر اولیاء اللہ بالکل بے ارادتی کے مقام پر رہتے ہیں۔ لیکن اُن کی توجہ الی الخلق دیکھ کر دھوکا ہوتا ہے۔ وہ تحتِ امر مخلوق کی کاربراری میں لگ رہتے ہیں تو لوگ کہتے ہیں۔ یہ بھی دُنیادار ہیں۔ ان میں ہم میں کیا فرق ہے حالانکہ زمین آسمان کا فرق ہے۔ مثلاً حضرت نظام الدینؒ اور حضرت پیران کلیرؒ دونوں بے ارادتی کے مقام پر ہیں۔ ایک مخلوق میں لگے ہوئے اور ایک خالق میں ایسے کہ لوگ سلام کو ترس جائیں۔

**(۳۵) بے ارادتی اور اقتضا**

سوال۔ کیا بے ارادتی کے مقام والے عقل و غور و فکر سے کام نہیں لیتے اور اپنے معاملات محض فضل پر چھوڑ دیتے ہیں۔ فرمایا۔ ایسا کہنا نادانی ہے۔ جو ایسا کہے اس نے بے ارادتی کو سمجھا ہی نہیں۔ آخر ہر انسان کا اقتضا کہاں جائے گا۔ کوئی غور و فکر اقتضا لایا۔ کوئی عقل کا لایا۔ کوئی غور و فکر و عقل سے عاری ہونے کا اقتضا لایا در اصل ان اقتضاءات مختلفہ کا ظہور یا تو ارادت سے ہوگا یا بے ارادتی سے ہوگا۔ البتہ فرق صرف نفسانیت و للّٰہیت کا رہے گا۔ اور بے ارادتی میں بھی اپنی طبیعتوں، اقتضاؤں کے لحاظ سے فرق رہے گا۔ بڑی غلط فہمی بلکہ جہل ہے کہ لوگ طبائع و اقتضاءات کا فرق نہ سمجھ کر اولیاء اللہ کے طبائع کی تقلید کرنا چاہتے ہیں جو ناممکن ہے۔ ہر ایک کا اقتضا مختلف ہوتا ہے۔ البتہ ہر محل پر صرف بے ارادتی حاصل ہونی چاہئے۔ ایک شخص بے ارادہ ہوتا ہے لیکن بے ارادتی میں خوب لڑنے کا اقتضا لایا ہے۔ دوسرا بے ارادہ ہے مگر صبر و خاموشی کا اقتضا لایا ہے۔ ایک میں سختی گرمی ہے۔ ایک میں نرمی۔ اس کے بھی بے شمار مدارج ہیں۔

اور نہ اُن کو مطلقیت حاصل ہے۔ بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کے تابع ہیں۔ پس جہاں اُن سے اعراض کرنا درست نہیں، وہاں اُن سے مرعوب ہونا بھی نادانی اور حرمانی ہے۔ صحیح مسلک وہی ہے کہ دل بہ یار، دست بہ کار۔ چنانچہ مومنین و متقین اللہ تعالیٰ کی حکمت و قدرت دونوں سے ربط رکھتے ہیں۔ کیونکہ عالمِ اسباب میں کثرت و قوت، اسباب و وسائل سب کچھ جمع ہوں تو بھی وہ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے بالا نہیں ہو سکتے۔ اس لیے مومن ادباً حکمت کے تقاضوں کے تحت اسباب تو اختیار کرتے ہیں۔ لیکن قدرت کے فیضان کے امیدوار رہتے ہیں۔ بہرصورت اُن کی امید اور ہمت کا مرجع اللہ تعالیٰ رہتا ہے۔

لیکن بعض سالکین توکل کا علم صاف نہ ہونے کی وجہ سے اسباب اختیار کرنے سے گھبراتے ہیں۔ اور اسباب اختیار کرنے کو توکّل کے منافی سمجھتے ہیں۔ تعطل میں رہتے ہیں۔ کچھ لوگ ایسے ہیں جو اللہ کو اسباب کا پابند سمجھتے ہیں۔ بعض ایسے ہیں جو اسباب کو موثر سمجھ کر اسباب سے مرعوب رہتے ہیں، اسباب کی پیروی کرتے ہیں۔ لیکن حکمت کی آڑ لے کر اُسے توکل سے تعبیر کرتے ہیں حالانکہ توکل کے بعد اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهُ بلکہ اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ (۶۵/۳) اللہ امر سے کام لے کر اسباب کے قطع نظر قدرت سے تکمیل کرنے والا ہے۔ اس کے معنی تساہل و تغافل نہیں کہ قصداً ترکِ اسباب کریں۔ البتہ بقدرِ ضرورت اسباب اختیار کریں۔ اسباب کے تابع نہ رہیں۔ دل و دماغ پر اللہ مسلط رہے نہ کہ اسباب۔

ایک معاملے کے متعلق ناچیز نے عرض کیا۔ قلب میں تقاضا ہے۔ اپنی ارادت کو دخل نہ دو۔ اسباب چھوڑ دو۔ فرمایا۔ بالکل درست ہے۔ لیکن یاد رکھو اس میں بال برابر فرق بھی ہے جو دوسروں کی سمجھ سے باہر ہے۔ ایک طرف نفس کے تحت

پھاڑتا ہے تو انعام ملتا ہے۔ لیکن اگر وہی باہر کسی کے سوئی چبھو دے تو گت بنتی ہے۔ کیوں؟ محل بدلا، منشا بدلا۔ اِسی طرح جب ہم اللہ کے حکم (امرِ جلی۔ امرِ خفی) کے تحت کام کرتے ہیں تو ہمارا علم، قول و فعل الٰہی ہو جاتا ہے۔ اور اللہ کی حمایت و نصرت و معیت حاصل ہو جاتی ہے اور کسی کا ڈر نہیں ہوتا۔ اگر اس کے حکم کے خلاف کریں تو سارے عالم کی تائید بے فائدہ ہے۔

اس کا راز یہ ہے کہ تحتِ امر کام کرنے والے کی ذاتی مرضی نہیں۔ بلکہ وہ حق کی مرضی کے تحت ہے۔ رسول اپنی مرضی نہیں رکھتے۔ اِس لیے اللہ نے فرمایا جس نے تم سے بیعت کی مجھ سے کی۔ تمھاری اطاعت میری اطاعت۔ تمھارا فعل میرا فعل۔ مَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ جب قلب کی کامل اصلاح ہو جاتی ہے تو اپنی مرضی، علم و ارادہ نہیں رہتے۔ اور امرِ خفی کا امتیاز ہو کر ہر فعل تحتِ امر ہو جاتا ہے۔ کافر و مومن کے فعل میں بظاہر فرق نہیں لیکن یہ باطن بے انتہا فرق ہے۔ لہٰذا قلب کی گھڑی (یعنی خطرات) کو قرآن کے ستارہ سے ملا لیں۔

## (۳۷) توکّل کی حقیقت

فرمایا۔ جملہ عالم اللہ تعالیٰ کی حکمت کے تحت اسباب و وسائل سے بھرا ہوا ہے۔ لیکن یہ سب اپنی ذات سے موثر نہیں۔ بلکہ اللہ کے حکم کے تابع ہیں۔ اللہ موثر ہے نتیجہ اللہ کے ہاتھ ہے اس لیے توکّل یہ ہے کہ اللہ کی وکالت و کارسازی پر نظر رہے۔ اسباب پر نظر نہ رہے۔ حکمت کے تحت اسباب سے کام لیں، لیکن مسبب پر نظر رکھیں۔ الحاصل اسباب و تدابیر بھی بے شک تحتِ حکمت اپنے محل پر بڑی چیز ہیں۔ ان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور ان میں عمداً کوتاہی کرنا درست نہیں ہو سکتا۔ بلکہ حتی الوسع ان کا حق پورا کرنا واجب ہے۔ البتہ اسباب و تدابیر اپنے احکام و آثار میں قطعی نہیں۔

اور نہ اُن کو مطلقیت حاصل ہے۔ بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کے تابع ہیں۔ پس جہاں اُن سے اعراض کرنا درست نہیں، وہاں اُن سے مرعوب ہونا بھی نادانی اور حرمانی ہے۔ صحیح مسلک وہی ہے کہ دل بہ یار، دست بہ کار۔ چنانچہ مومنین و متقین اللہ تعالیٰ کی حکمت و قدرت دونوں سے ربط رکھتے ہیں۔ کیونکہ عالم اسباب میں کثرت و قوت، اسباب و وسائل سب کچھ جمع ہوں تو بھی وہ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے بالا نہیں ہو سکتے۔ اس لیے مومن ادباً حکمت کے تقاضوں کے تحت اسباب تو اختیار کرتے ہیں۔ لیکن قدرت کے فیضان کے امیدوار رہتے ہیں۔ بہرصورت اُن کی امید و ہمت کا مرجع اللہ تعالیٰ رہتا ہے۔

لیکن بعض سالکین توکل کا علم صاف نہ ہونے کی وجہ سے اسباب اختیار کرنے سے گھبراتے ہیں۔ اور اسباب اختیار کرنے کو توکل کے منافی سمجھتے ہیں۔ تعطل میں رہتے ہیں۔ کچھ لوگ ایسے ہیں جو اللہ کو اسباب کا پابند سمجھتے ہیں۔ بعض ایسے ہیں جو اسباب کو مؤثر سمجھ کر اسباب سے مرعوب رہتے ہیں، اسباب کی پیروی کرتے ہیں۔ لیکن حکمت کی آڑ لے کر اُسے توکل سے تعبیر کرتے ہیں حالانکہ توکل کے بعد اللہ کافی ہے۔ ارشاد ہے: وَمَنْ یَّتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ فَھُوَ حَسْبُہٗ بلکہ اِنَّ اللّٰہَ بَالِغُ اَمْرِہٖ (پ۲۸) اللہ امر سے کام لے کر اسباب کے قطع نظر قدرت سے تکمیل کرنے والا ہے۔ اس کے معنی تساہل و تغافل نہیں کہ قصداً ترکِ اسباب کریں۔ البتہ بقدرِ ضرورت اسباب اختیار کریں۔ اسباب کے تابع نہ رہیں۔ دل و دماغ پہ اللہ مسلط رہے نہ کہ اسباب۔

ایک معاملے کے متعلق ناچیز نے عرض کیا۔ قلب میں تقاضا ہے۔ اپنی ارادت کو دخل نہ دو۔ اسباب چھوڑ دو۔ فرمایا۔ بالکل درست ہے۔ لیکن یاد رکھو اس میں بال برابر فرق بھی ہے جو دوسروں کی سمجھ سے باہر ہے۔ ایک طرف نفس کے تحت

پھاڑتا ہے تو انعام ملتا ہے۔ لیکن اگر وہی باہر کسی کے سوئی چبھو دے تو گت بنتی ہے۔ کیوں ؟ محل بدلا، منشا بدلا۔ اسی طرح جب ہم اللہ کے حکم (امر علمی۔ امر خفی) کے تحت کام کرتے ہیں تو ہمارا علم، قول و فعل الٰہی ہو جاتا ہے۔ اور اللہ کی حمایت و نصرت و معیت حاصل ہو جاتی ہے اور کسی کا ڈر نہیں ہوتا۔ اگر اس کے حکم کے خلاف کریں تو سارے عالم کی تائید بے فائدہ ہے۔

اس کا راز یہ ہے کہ تحتِ امر کام کرنے والے کی ذاتی مرضی نہیں۔ بلکہ وہ حق کی مرضی کے تحت ہے۔ رسول اپنی مرضی نہیں رکھتے۔ اس لیے اللہ نے فرمایا جس نے تم سے بیعت کی مجھ سے کی۔ تمھاری اطاعت میری اطاعت۔ تمھارا فعل میرا فعل۔ مَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ جب قلب کی کامل اصلاح ہو جاتی ہے تو اپنی مرضی، علم و ارادہ نہیں رہتے۔ اور امر خفی کا امتیاز ہو کر ہر فعل تحتِ امر ہو جاتا ہے۔ کافر و مومن کے فعل میں بظاہر فرق نہیں لیکن یہ باطنی بے انتہا فرق ہے۔ لہٰذا قلب کی گھڑی (یعنی خطرات) کو قرآن کے ستارہ سے ملا لیں۔

## (۱۳۷) توکل کی حقیقت

فرمایا۔ جملہ عالم اللہ تعالیٰ کی حکمت کے تحت اسباب و وسائل سے بھرا ہوا ہے۔ لیکن یہ سب اپنی ذات سے موثر نہیں۔ بلکہ اللہ کے حکم کے تابع ہیں۔ اللہ موثر ہے نتیجہ اللہ کے ہاتھ ہے اس لیے توکل یہ ہے کہ اللہ کی وکالت و کارسازی پر نظر رہے۔ اسباب پر نظر نہ رہے۔ حکمت کے تحت اسباب سے کام لیں، لیکن مُسبب پر نظر رکھیں۔ الحاصل اسباب و تدابیر بھی بے شک بہ تحت حکمت اپنے محل پر بڑی چیز ہیں۔ ان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور ان میں عمداً کوتاہی کرنا درست نہیں ہو سکتا۔ بلکہ حتی الوسع ان کا حق پورا کرنا واجب ہے۔ البتہ اسباب و تدابیر اپنے احکام و آثار میں قطعی نہیں۔

دولت چھوڑ کر دُنیا کو ٹھوکر مار رہی ہے۔ اور اسی میں سکون و شانتی محسوس کرتے ہیں۔ اگر ان کو ایمانی اعتبارات کے بغیر سکون مل رہا ہے تو آخر یہ فیض کہاں سے آرہا ہے۔ اور اُن کی حالت تو ترکِ اسباب کے بعد بلحاظ مال و دولت آپ سے بدرجہا بہتر ہے۔ پھر آپ کو کیا امتیاز حاصل ہے۔ آپ جواب دیں گے۔ ہم نے ایمان کے ساتھ توکل کو اختیار کیا ہے۔ اگر توکل ایمان کے ساتھ ہے تو آپ کی نظر حق پر ہے یا مریدین و اسباب پر۔ آپ کی زندگی کا مقصد تمتع ہے یا مفادِ ملت۔

حضورؐ کی زندگی دیکھئے۔ آپ نے گلہ بانی کی، تجارت اختیار فرمائی۔ دیگر انبیاء نے بھی پیشے کئے۔ اس لیے دین سے بدگمانیوں کے موجودہ دَور میں حکمت کے تحت، دین کے وقار کے لیے، مرشدین کو پیشہ یا ملازمت اختیار کرنا مناسب ہے۔ چاہے ان کو ایمانی اصلی توکل ہی کیوں نہ حاصل ہو۔ دراصل توکل علم کی تصحیح کا نام ہے۔ چاہے ملازمت ہو یا ترکِ ملازمت و اسباب۔ ایسے متوکلین سے دین پر زد پڑتی ہے اور لوگ دین سے بدگمان ہو جاتے ہیں۔ یہ لوگ توکل کے فیوض کو ذاتی تمتع، عمدہ لباس، غذا، سفر، فرش فرنیچر اور بیویوں کے زیورات میں صرف کرتے ہیں۔ ان کو حضورؐ کی زندگی میں ملت کے لیے خرچ کرکے فاقے رہنے کا نمونہ نہیں ملتا۔

**(۴۰) توکل کے آثار**

جب بغداد شریف میں ہمارے چھ ہزار کی ہمیونی گم ہوئی تو میں سیدھا حضرت کے آستانے پر حاضر ہوا اور عرض کیا۔ ہمارا ایمانی نقص تھا کہ اتنی بھی رقم لی۔ صرف آپ کا نام ہی لے کر نکلتے تو اس سے بہتر سامان ہو سکتے۔ ہم آپ کے غلام ہیں۔ اگر آپ کی مرضی یہ ہے کہ غلام ناکام ہوں اور حج نہ ہو تو مرضی مولیٰ از ہمہ اولیٰ۔ تھوڑی دیر میں گم شدہ رقم مل گئی۔

سہل انگاری ہے، اپنے بچوں کے لیے اسباب اختیار نہ کرنا بدترین گناہ ہے۔ دوسری طرف اللہ کے منشا کے تحت تفویض و توکل میں اسباب کا ترک لازمی ہے۔ اس میں اور اس میں زمین، آسمان کا فرق ہے۔ دوسرے کے لیے اس میں فرق نہیں بلکہ تعجب کی بات ہے۔

**(۳۸) توکّل اور تعطّل کا فرق** لوگ توکل کا مفہوم غلط سمجھتے ہیں۔ کہتے ہیں۔ اللہ سب دے گا۔ قرآن میں بڑی تمیز بتائی گئی ہے۔ اسماء کا حق ادا کرنا ضروری ہے ورنہ اسماء باطل ہو جائیں گے۔ اگر مومن بے ارادتی کی حالت میں ہے اور امر کے تحت توکل کر کے ایسا کہتا ہے تو اس میں حفاظت ہوتی ہے اور آثار و اسباب غیب سے پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن اگر وہ اپنے ذاتی ارادہ اور نفس کی تجویز کی وجہ سے ایسا کہتا ہے تو اس میں توکل کا خاص فیضان نہیں آسکتا گویا وہ اپنے کو تکاسل کی وجہ سے معذور و معطل بنا لیتا ہے۔ اور اس تعطل، کاہلی، معذوری کا نام بے ارادتی رکھتا ہے۔ رہی یہ بات کہ بعض لوگ اس طرح توکل کر کے ذاتی ارادہ سے بیٹھ جاتے ہیں اور اُن کو مختلف فتوحات حاصل ہوتی ہیں ایسی صورت میں یہ توکل کا فیضان نہیں۔ اور نہ وہ مرتبہ حاصل ہوتا ہے۔ بلکہ دیگر اسماء (رحمانیت وغیرہ) کام کرتے ہیں۔ چنانچہ غیر مومن بھی بیٹھ جاتا ہے تو رزق ملتا ہے۔ لہٰذا سلوک میں بے ارادتی کا مقام ہونا چاہیئے۔

**(۳۹) توکل اور پیشہ** عام طور پر توکل کی غلط توجیہیں کی جاتی ہیں۔ اگر ترکِ اسباب ہی کا نام توکل ہے۔ اور اس کے فیوض و برکات مال و دولت فرش فرنیچر، سواری موٹر اور طبیعت کا سکون ہیں۔ تو میں پوچھتا ہوں کہ یورپ، امریکہ کے بڑے بڑے دولت مند اہلِ علم ترکِ اسباب کر کے بعض آشرموں میں آپڑے ہیں۔ اُن کے پاس لاکھوں کی دولت بھی ہے لیکن سب مال و

دولت چھوڑ کر دُنیا کو ٹھوکر مار رہی ہے۔ اور اسی میں سکون و شادمانی محسوس کرتے ہیں۔ اگر ان کو ایمانی اعتبارات کے بغیر سکون مل رہا ہے تو آخر یہ فیض کہاں سے آرہا ہے۔ اور اُن کی حالت تو ترکِ اسباب کے بعد بلحاظ مال و دولت آپ سے بدرجہا بہتر ہے۔ پھر آپ کو کیا امتیاز حاصل ہے۔ آپ جواب دیں گے۔ ہم نے ایمان کے ساتھ توکل کو اختیار کیا ہے۔ اگر توکل ایمان کے ساتھ ہے تو آپ کی نظر حق پر ہے یا مریدین و اسباب پر۔ آپ کی زندگی کا مقصد تمتع ہے یا مفادِ ملت۔

حضورؐ کی زندگی دیکھئے۔ آپ نے گلہ بانی کی، تجارت اختیار فرمائی۔ دیگر انبیاء نے بھی پیشے کئے۔ اس لیے دین سے بدگمانیوں کے موجودہ دَور میں، حکمت کے تحت، دین کے وقار کے لیے، مرشدین کو پیشہ یا ملازمت اختیار کرنا مناسب ہے۔ چاہے ان کو ایمانی اصلی توکل ہی کیوں نہ حاصل ہو۔ دراصل توکل علم کی تصحیح کا نام ہے۔ چاہے ملازمت ہو یا ترکِ ملازمت و اسباب۔ ایسے متوکلین سے دین پر زد پڑتی ہے اور لوگ دین سے بدگمان ہو جاتے ہیں۔ یہ لوگ توکل کے فیوض کو ذاتی تمتع، عمدہ لباس، غذا، سفر، فرنش فرنیچر اور بیویوں کے زیورات میں صرف کرتے ہیں۔ ان کو حضورؐ کی زندگی میں ملت کے لیے خرچ کر کے فاقے رہنے کا نمونہ نہیں ملتا۔

**(۴۰) توکل کے آثار** جب بغداد شریف میں ہمارے چودہ ہزار کی ہمیونی گم ہوئی تو میں سیدھا حضرت کے آستانے پر حاضر ہوا اور عرض کیا۔ ہمارا ایمانی نقص تھا کہ اتنی بھی رقم لی۔ صرف آپ کا نام ہی لے کر نکلتے تو اس سے بہتر سامان ہو سکتے۔ ہم آپ کے غلام ہیں۔ اگر آپ کی مرضی یہ ہے کہ غلام ناکام ہوں اور حج نہ ہو تو مرضیِ مولیٰ از ہمہ اولیٰ۔ تھوڑی دیر میں گم شدہ رقم مل گئی۔

سہل انگاری ہے، اپنے بچوں کے لیے اسباب اختیار نہ کرنا بدترین گناہ ہے۔ دوسری طرف اللہ کے منشا کے تحت تفویض و توکل میں اسباب کا ترک لازمی ہے۔ اس میں اور اُس میں زمین، آسمان کا فرق ہے۔ دوسرے کے لیے اس میں فرق نہیں بلکہ تعجب کی بات ہے۔

## (۳۸) توکّل اور تعطّل کا فرق

لوگ توکل کا مفہوم غلط سمجھتے ہیں۔ کہتے ہیں۔ اللہ سب دے گا۔ قرآن میں بڑی تمیز بتائی گئی ہے۔ اسماء کا حق ادا کرنا ضروری ہے ورنہ اسماء باطل ہو جائیں گے۔ اگر مومن بے ارادتی کی حالت میں ہے اور امر کے تحت توکل کر کے ایسا کہتا ہے تو اِس میں حفاظت ہوتی ہے اور آثار و اسباب غیب سے پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن اگر وہ اپنے ذاتی ارادہ اور نفس کی تجویز کی وجہ سے ایسا کہتا ہے تو اِس میں توکل کا خاص فیضان نہیں آسکتا گویا وہ اپنے کو تکاسُل کی وجہ سے معذور و معطل بنا لیتا ہے۔ اور اِس تعطل، کاہلی، معذوری کا نام بے ارادتی رکھتا ہے۔ رہی یہ بات کہ بعض لوگ اس طرح توکل کر کے ذاتی ارادہ سے بیٹھ جاتے ہیں اور اُن کو مختلف فتوحات حاصل ہوتی ہیں ایسی صورت میں یہ توکل کا فیضان نہیں۔ اور نہ وہ مرتبہ حاصل ہوتا ہے۔ بلکہ دیگر اسماء (رحمانیت وغیرہ) کام کرتے ہیں۔ چنانچہ غیر مومن بھی بیٹھ جاتا ہے تو رزق ملتا ہے۔ لہٰذا سلوک میں بے ارادتی کا مقام ہونا چاہیئے۔

## (۳۹) توکل اور پیشہ

عام طور پر توکل کی غلط توجیہیں کی جاتی ہیں۔ اگر ترکِ اسباب ہی کا نام توکل ہے۔ اور اس کے فیوض و برکات مال و دولت فرش فرنیچر، سواری موٹر اور طبیعت کا سکون ہیں۔ تو میں پوچھتا ہوں کہ یوروپ، امریکہ کے بڑے بڑے دولت مند اہلِ علم ترکِ اسباب کر کے بعض آشرموں میں آپڑے ہیں۔ اُن کے پاس لاکھوں کی دولت بھی ہے لیکن سب مال و

مولانا روم فرماتے ہیں:۔

چیست دُنیا از خدا غافل بُدن نے قماش و نقرہ و فرزند و زن و

بندہ مجبور، معذور، حاجت مند پیدا ہوا ہے۔ طلب کرے تو اقتضائے فطرت ہے۔ البتہ عدمِ طلب یعنی ترکِ اسباب استغنیٰ اور کِبر کو ظاہر کرتا ہے جو حق کی صفت ہے۔ بندے کے لیے یہ محمود نہیں بلکہ جسارت ہے۔ ترکِ لذت ترکِ نعمت، ترکِ اولاد میں نفس ہے۔ حتیٰ کہ اگر ترکِ معاصی کا دعویٰ کرے گا تو پکڑا جائے گا۔ کیونکہ اس میں اپنی قوت کا ادّعا ہے جو شرک ہے۔ لہذا ایسے ناپسندیدہ ترک کے خیال کو ترک کرنا چاہئے۔ نفس کے تحت ایسا عمل قابلِ بازپرس ہے۔ البتہ اللہ کے حکم و توفیق سے معاصی کے ترک کا خیال درست ہے۔ لہذا طلبِ معاش علم صحیح کے تحت احسن ہے جس کا مقصد عزت، صحت، دولت وغیرہ ہو۔

**(۴۲) تارکُ الدنیا، متروکُ الدنیا** جب کھانے کو نہیں ملتا اور دَمڑی کو کوئی نہیں پوچھتا تو بعض بناوٹی پیر اپنے آپ کو تارک الدنیا بنا لیتے ہیں اور گوشہ نشینی اختیار کر لیتے ہیں تاکہ لوگ اُن کی طرف رجوع ہوں اور وہ تمتع حاصل کر سکیں۔ ایسی صورت میں وہ تارکُ الدنیا کہاں، دراصل متروکُ الدُّنیا ہوئے۔ قوت، دولت علومِ دینی و دُنیوی اور دیگر اسباب کے ہوتے ہوئے تارک الدّنیا ہونا کمال ہے۔ بلکہ عین تمتع کے زمانے میں، بلکہ دعوتِ تمتع ملنے کے باوجود، محض اللہ کے لیے ان تمام اسباب کو چھوڑنا اور تارک الدّنیا ہونا خاص اولیاءاللہ کی شان ہے۔

**(۴۳) تمتع کی امید** مخلوق سے امید بڑی ابتلا ہے۔ قرآن کہتا ہے۔ اگر ہم

اصل میں توکل اسباب سے بالا ہے۔ تعقل میں خشکی ہے اس کی کھڑکی الگ ہے اور توکل کی کھڑکی الگ ہے۔ اگر مگر کی یہاں گنجائش نہیں۔ ہر محل کا اقتضا الگ ہے یہ توفیق کی چیز ہے۔ قلب میں علم صحیح اور ربوبیت جم جائے تو خوف و حزن نہیں آتا۔ لیکن نتائج کا منتظر نہ رہے۔ جو ہوا اس پر راضی و صابر رہے۔ کتنے پڑھے لکھے بحثیں خوب کرتے ہیں لیکن انھیں توحید و توکل کی ہوا نہیں لگتی۔ اور کتنے بے پڑھے لوگ علم صحیح پر استقامت رکھتے ہیں۔ توکل کے بعد اپنی ارادت کو دخل نہ دیں۔

(۱۴۱) طلب، ترک، ترکِ ترک — حکمت میں اسماء کے روابط کا ظہور ہوتا ہے سعی اس کے آداب میں داخل ہے۔ مومن کو کثرتِ کار اور دشواریوں سے نہیں گھبرانا چاہیئے۔ دراصل دشواریوں پر غالب ہونے کی کوشش ہی اصل مجاہدہ ہے اور اس پر جمنا ہی اصل استقامت ہے۔ سورۂ مزمل میں کثرتِ کار اور دشواریوں پر غلبہ حاصل کرنے کی مردانہ کوشش کا ذکر ہے۔ کسبِ معاش کے لیے حکمِ خداوندی ہے کہ انسان حاجت مند پیدا ہوا ہے۔ لیکن انسان کا عام رجحان یہ ہے کہ بغیر محنت کے معاش حاصل ہو جائے تو لطف ہے۔ یہ کم ہمتی ہے اسلام نے اس کی مذمت کی اور اس کا نام رہبانیت رکھا جس کی اجازت نہیں۔ پست ہمتی سے کسبِ معاش کو چھوڑ کر اس کا نام توکل رکھتے ہیں۔ ایسا عمل نفس کے تحت ہوتا ہے اس لیے حق کی تائید نہیں ہوتی۔

ترک و طلب کے اسرار کا علم حضرت غوث اعظمؓ کی نسبت کا خاص فیضان ہے۔ حضرت کی تعلیم کے لحاظ سے ترک و طلب کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تحت نفس ایک تحتِ امر۔ اس کا علم عبدیت و خلافت کی جان ہے۔ اگر کوئی تحتِ امر طلب و ترک کر رہا ہے تو محمود ہے۔ ورنہ تحتِ نفس مذموم ہے۔ تحتِ امر بھی ترک کرنے کے معنی علم غلط کا ترک اور علم صحیح کا حصول ہے۔

کرتے رہیں۔ اور کبھی یہ نہ کہیں کہ ایسا مخالفانہ عمل کیوں ہو رہا ہے۔
یاد رکھو علم صحیح کے بعد جو دقتیں آتی ہیں اُن کا منشا مقام بنانا اور ٹریننگ دینا ہوتا ہے۔ اور علم باطل کے بعد جو دقتیں آتی ہیں اُن کا منشا اُن کو تباہ کرنا ہوتا ہے۔

**(۴۵) مصائب میں استقامت**

ایک سرکاری ملازم کا تنزل ہوا تو فرمایا۔ اسما عالم کے اقتضاآت بے حد و حساب ہیں۔ حکمت کی حد نہیں۔ البتہ قرآن کے لحاظ سے اتنا اطمینان ہے کہ متقیوں کا انجام بخیر ہے۔ درمیانی مراحل بے حساب ہیں۔ آثار پر نہ جائیں۔ اگر سب کام ہمارے حسبِ منشا ہوتے رہیں تو اللہ میاں بیمہ کمپنی بن جائیں گے کہ ایمان کے بعد کسی آزمایش کی ضرورت نہ ہو۔ حالانکہ ایمان کے بعد کسی کا سلوک بذریعہ نقصانات اِنَّا لِلّٰہِ (۲/۳) سے طے کرایا جاتا ہے۔ تو کسی کا مَتٰی نَصْرُ اللہِ سے، اور کسی کا اِذْ تَسْتَغِیْثُوْنَ رَبَّکُمْ (۹/۱۵) سے۔ جیسا جس کا اقتضا ہے۔ مطلوب علم صحیح ہونا کہ غیرتِ دینی، خودداری اور آزادی سے زندگی بسر ہو۔ ورنہ روپیہ کی کمی بیشی کوئی چیز نہیں۔ قرآن میں ہے۔ ہم سو میں ہزار کی برکت دیتے ہیں یہ ہر محل پر صحیح ہے۔

**(۴۶) پریشانیوں میں حکمت**

اللہ کی مصلحتوں کو سمجھنا مشکل ہے۔ کامیابی کے لیے دعا رہنی چاہیے۔ لیکن غلبہ و نصرت حاصل کرنے کے لیے باطنی اصلاح ضروری ہے جس کے نتیجے میں نصرت حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ آیت کی ترتیب ملاحظہ ہو۔ وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا اَنْتَ مَوْلٰنَا فَانْصُرْنَا عَلَی الْقَوْمِ الْکٰفِرِیْنَ (۳/۸) ترجمہ: معاف کر ہم سے۔ بخش ہم کو۔ اور رحم کر ہم پر۔ تو دوست، کارساز ہے پس ہم کو کافروں پر غالب کر۔

نعمت دینا چاہیں تو کوئی چھین نہیں سکتا۔ اور اگر ہم چھیننا چاہیں تو کوئی دے نہیں سکتا (۱۲/۱) اس لیے ظاہری آثار و اشکال سے کبھی دھوکا نہ کھائیں، امید نہ باندھیں چاہیے کامیابی کے نقطہ ہی پر کیوں نہ ہوں۔ جب تک ہمیں عطا نہ ہو، وہ چیز اپنی نہیں ہے اور نہ قابل توجہ ہے۔ مثلاً اگر کباب تلے بھنے جائیں اور خوش بو بھی دینے لگیں تو کتے کو چاہیے کہ اسے نہ سونگھے ورنہ اس کی اصالت میں فرق ہے پس مالک کے حکم و عطا پر نظر رہے عطا کے بعد بھی جب کھانے کا حکم دیں تو اپنی چیز ہے۔

بعض لوگ مجھ سے کہتے ہیں کہ بادشاہِ وقت اور عمائدینِ سلطنت کے ربط سے آپ نے کوئی فائدے نہیں اٹھائے۔ ان کی نظر میں تعلقات برائے تمتع ہیں۔ حالانکہ یہ سماجی تعلقات ہیں۔ دوستی اور خصوصاً مذہبی دوستی کا مقصد ذاتی تمتع نہ ہونا چاہیے۔

## (۴۴) دعا اور استقامت

قَدْ اُجِيْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا فَاسْتَقِيْمَا (۱۰/۱۱) ترجمہ بے شک قبول کی گئی دعا تمھاری، پس استقامت دکھاؤ۔ مصیبتوں میں ہمارا صبر و استقامت مقصودِ الٰہی ہے۔ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت موسیٰؑ کو کامیابی سے قبل کافی انتظار کرنا پڑا۔ دشمنوں کی ریشہ دوانی کی گئی۔ آگ وغیرہ کے سامان ہونے دیئے۔ جلال کی تجلیاں پوری ہو گئیں تو حفاظت کے ساتھ نصرت عطا ہوئی۔ اس میں کوئی دم نہیں مار سکتا نہ معاملہ واجبیت، معقولیت، حق و صداقت کا بھی ہو تو بعض وقت تجلی مخالف ہو جاتی ہے۔ پھر موانعات کے باوجود کامیابی عطا ہوتی ہے۔ جو قابلِ تشکرانہ و نیاز ہوتی ہے۔ جب مومن کا کام بن رہا ہو تو شیاطین مخالفت پر پڑا زور دکھاتے ہیں۔ ان کی قوتوں کا کچھ ٹھکانا نہیں۔ اس لیے امید کے ساتھ حفاظت کی دعا

اس میں اور اسلامی استغنا میں کیا فرق ہے۔ فرمایا۔ چونکہ ان کے پاس اللہ، رسول پر ایمان نہیں۔ اس لیے راہبوں وغیرہ کے استغنا میں نفس کی آمیزش ہوتی ہے۔ اُن کا مذہبی کتابی علم انسانی علم سے خلط ملط ہو چکا، اس لیے للّٰہیت باقی نہ رہی اور وہ اعلیٰ ایمانی آثار جو عبدیت کا لازمہ ہیں اُن میں پیدا نہیں ہو سکتے۔ علاوہ ازیں کسی کو سکون و اطمینان حاصل بھی ہو جائے تو دھوکا نہ کھانا چاہیے کیونکہ بعض لوگوں کو اپنے اقتضا کے تحت گندی سے گندی چیزوں میں سکون و لطف ملتا ہے۔ بعض بھنگ، مدک پینے والوں کے کمرے سنڈاس کی طرح غلیظ رہتے ہیں لیکن اس کی بدبو کا لطف اُٹھانے کے لیے دُور دُور سے مدکی، چرسی آتے ہیں۔ ادنیٰ سے ادنیٰ، اعلیٰ سے اعلیٰ چیزوں میں لوگوں کو سکون ملتا ہے۔ لیکن دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ کس اعلیٰ علم و ایمان کے تحت یہ سکون و اطمینان نصیب ہو رہا ہے۔ قرآناً حقیقی اطمینان و سکون وہی ہے جو ایمان کا نتیجہ ہو۔ ارشاد ہے: اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ تَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ (۱۳/۱۰) ترجمہ: جو ایمان لائے اور اُن کے دل اللہ کی یاد سے آرام و اطمینان حاصل کرتے ہیں۔ یہ اللہ کا فضل ہے ورنہ سارے عالم کی حکومت، جاہ و حشمت ہم میں سکون و محبت نہیں پیدا کر سکتے۔ ملاحظہ ہو: لَوْ اَنْفَقْتَ الخ (۸/۱۰)

**(۴۸) ملکیت و استغنا:** ایک بزرگ کے متعلق روایت ہے۔ اُن کا تموّل مشہور تھا۔ ایک دن حضرت اپنے گھوڑوں کے لیے سونے چاندی کے ساز و سامان تیار کرا رہے تھے۔ ایک شخص نے خیال کیا۔ اللہ والے ہو کر دُنیا میں کتنے لگے ہیں۔ حضرت کے قلب پر یہ بات آئی تو فرمایا۔ ایں چوب در گِل زدہ ام نہ بر دل۔ یعنی میرا دل اس سے بندھا نہیں ہے۔ میں بے ہمہ با ہمہ ہوں۔ اطمینان و استغنا محض فضلِ الٰہی ہے جو دولت بلکہ عبادات سے بھی حاصل نہیں ہوتا۔ اللہ چاہے تو شر میں خیر اور خیر میں شر ظاہر ہوتا ہے۔

نصرت یوں ہی نہیں آیا کرتی بلکہ اس سے قبل مصائب و آفات کی بھٹی میں سے گزارا جاتا ہے تاکہ صبر و استقامت کا مقام حاصل ہو جائے۔ گو مصیبت نہ آنے کی خواہش اور فوری نصرت حاصل ہونے کا خیال فطری ہے۔ لیکن منشائے الٰہی کے تحت اِن مصائب سے گزرنا لابُد ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔ اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰہَ یَنْصُرْکُمْ الخ اگر تم اللہ کے واسطے مدد کرو، جو تو اللہ تمھاری مدد کرے گا اور ثابت قدمی عطا کرے گا۔ بہرحال مصائب کا آنا اِس عالم میں قطعی ہے۔ قانونِ عُسر و یُسر عام ہے۔ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا (۳۰/۱۹) الخ اس کے بعد مَتٰی نَصْرُ اللّٰہِ کی دعا پر نصرتِ قریبہ کی بشارت ملتی ہے۔ وقت کا تعیّن نہیں۔

## (۱۴۷) حقیقی اطمینانِ قلب

بے نیازی اور اطمینانِ قلب کے الفاظ عموماً بہت غلط استعمال کئے جاتے ہیں۔ بعض لوگ راہبوں، جوگیوں کی طرح ترکِ علائق کر کے بیٹھنے والوں کے متعلق کہتے ہیں کہ اِن کو کیسی بے نیازی اور اطمینانِ قلب حاصل ہے۔ ایسے آثار سے نتیجہ اخذ کرنا غلط ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اِن چیزوں کا اصل محرّک کیا ہے۔ ایمان ہے یا ہوائے نفسانی۔ علم ہے یا جہل۔ ورنہ ایسا بھی دیکھا جاتا ہے کہ ایک مایوسی آپڑے، یا اعصاب خراب ہو جائیں، یا دماغ اُلٹ جائے۔ تو انسان بال بچوں، جائداد وغیرہ کو چھوڑ بیٹھتا ہے جس کے پیچھے کوئی اعلیٰ علم نہیں ہوتا۔ اس کے برخلاف توحید کی وجہ سے جو بے نیازی و استغنیٰ حاصل ہوتا ہے وہ اعلیٰ علم و ایمان کا نتیجہ ہوتا ہے جس میں پایا جاتا ہے سکون و اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ اِس لیے مرض اور صحت دونوں کے آثار و نتائج ایک سے نہیں ہو سکتے۔

اِس سوال پر کہ کافر بھی اپنے اعتقاداتِ مذہبی کے تحت بے نیازی دکھاتے ہیں۔

ایمان کی حالت میں باطل سے ربط رکھنا مہلک ثابت ہوتا ہے۔ تین خلفاء کے دورِ خلافت کے واقعات سے ثابت ہے کہ کس طرح بعض مسلمان شیطان کے چکر میں پھنس کر تباہ ہو گئے۔

حضرت صدیقِ اکبرؓ کے زمانے میں مانعینِ زکوٰۃ نے نماز، روزہ، حج کی ادائی کا اقرار کیا۔ لیکن زکوٰۃ سے انکار کیا۔ فراستِ صدیقی نے ان کا وجود ملت کے لیے مہلک جان کر جہاد کا حکم فرمایا اور کسی نے اختلاف نہیں کیا۔ حدیث میں ہے۔ کسی معاملے میں ایک یہودی اور ایک مسلمان میں اختلاف ہوا۔ یہودی نے کہا۔ رسول اللہؐ کے پاس چلیں۔ آپ جو تصفیہ فرمائیں اُسے ہم دونوں قبول کر لیں گے۔ حضورؐ نے تصفیہ فرمایا۔ لیکن وہاں سے نکلنے کے بعد، اس نام نہاد مسلمان نے انحراف کیا اور کہا۔ میں حضرت عمرؓ کو حَکَم بنانا چاہتا ہوں۔ یہودی اس پر بھی رضامند ہوا۔ اور دونوں حضرت عمرؓ کے پاس پہنچے اور واقعہ بیان کیا۔ حضرت عمرؓ اندر گئے اور تلوار لا کر اس مسلمان کو قتل کر دیا۔ اس فراستِ فاروقی پر کسی نے اعتراض نہیں کیا کیونکہ یہ منافق تھا۔ شیطان کے زیرِ اثر تھا کہ حضرت عمرؓ کو رسول اللہؐ کے مقابلے میں حَکَم بنانا چاہتا تھا۔ تیسری مثال حضرت علیؓ کی ہے۔ خارجی کثرت سے قرآن پڑھا کرتے تھے۔ نمازی اتنے کہ پیشانیوں پر گھٹے پڑ گئے تھے۔ لیکن حضرت علیؓ نے ان کے خلاف جہاد کا حکم دیا۔ کیونکہ ان کا وجود ملت کے لیے سمِ قاتل تھا اس پر آج تک کسی نے اختلاف نہیں کیا۔ مطلب یہ کہ ان تینوں گروہوں نے اللہ، رسول اور قرآن سے ظاہری ربط رکھا تھا۔ لیکن باطنی روح و حیات کا پتہ نہ تھا۔ حزبُ الشیطٰن تھے اس لیے قتل کئے گئے۔ اس کی سمجھ کے لیے بصیرتِ محمدی، فراستِ صدیقی، سیاستِ فاروقی اور حکمتِ علوی کی ضرورت ہے۔

## (۴۹) نفسیاتِ ہدایت

ہدایتِ انسانی دنیا کا مشکل ترین مسئلہ ہے۔ انبیاء کا موضوع انسان رہا۔ ہدایت کے لیے انسانی نفسیات، جذبات، ماحول کا مطالعہ ضروری ہے۔ لیکن اکثر مرشدین اس میں کورے رہے ہیں۔ یورپ کے ماہرین علیم نفسیات کا مطالعہ کرتے ہیں اور تعلیم کو ترقی دیتے ہیں۔ محض احکام و ہدایات مسلط کرنے کا طریقہ ناقص ہے۔ البتہ حالات کے مطالعے کے بعد، مناسب طریق پر اشارے دینا، ایما کرنا، دیرپا موثر ثابت ہوتا ہے۔ کسی پر اپنا خیال عائد کرنا اور اپنے اقتضا کے تابع کرنا مفید نہیں۔ وَمَا عَلَيْنَا إِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ (۲۲/۱۹) نہیں ہے ہم پر مگر ظاہر کا پہنچانا۔ اس کا مطلب حکمت کے ساتھ، اقتضاءات و حالات کے لحاظ سے کوشش کرتا ہے۔ البتہ نتیجہ کے ہم ذمہ دار نہیں۔ اللہ ہادی ہے۔ دعا کریں۔ محل کے لحاظ سے مہلت بھی لازمی رہتی ہے۔

بعض لوگ اولیاء اللہ سے ربط رکھتے ہیں لیکن اس محل کا اقتضا پورا نہیں کرتے۔ بلکہ شیطانی لوازم پورے کر کے عمدہ نتائج کے متوقع رہتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہاں کا فیض بند ہو جاتا ہے اور وہ شیطان کا فٹ بال بن جاتے ہیں۔ مثلاً بجلی سے ربط پیدا کرنے کے بعد، اگر ذرا سی غفلت یا غلطی ہو تو دھماکا ایسا ہوتا ہے کہ بالکل اندھیرا ہو جاتا ہے۔ اس لیے یہ خیال غلط ہے کہ مومن ہونے اور اولیاء اللہ سے ربط کا دعویٰ کرنے سے کوئی بچ سکتا ہے۔ یہ شیطانی چکر ہے شیطان شر کا بڑا لعین ہے۔ اس کے زیر اثر نہ صرف کافر ہیں بلکہ وہ فاسق مسلمان بھی جو غلط علم و عمل میں مبتلا رہتے ہیں۔ ارشاد ہے: وَمَا يُضِلُّ بِهِ إِلَّا الْفَاسِقِينَ الَّذِينَ يَنْقُضُونَ عَهْدَ اللَّهِ الخ (۱/۳) قرآن میں الفاظ مطلق استعمال ہوئے ہیں ایسا زہر جسم میں پھیلے تو جان جاتی ہے۔ ورنہ زہر کے مقام کو قطع کرنا ضروری ہے۔

اِنْ شِئْتُ (اگر میں چاہوں) ہو جائے گا جو نفس و شرک ہے۔

(۵۲) اچھی۔ بری
ہر چیز اپنے محل اور ربط کی بنا پر اچھی، بری، بڑی، چھوٹی کہلاتی ہے۔ ہر ایک کے احکام الگ ہیں۔ زمین پر چلنے والوں کے احکام ہوا میں اُڑنے والوں سے مختلف ہوتے ہیں۔ نیچے کی لغزش سے زیادہ نقصان نہیں پہنچتا لیکن اوپر کی لغزش سے سر کے بل نیچے گرے گا۔ بزرگوں کا قول ہے حَسَنَاتُ الْاَبْرَارِ سَیِّاٰتُ الْمُقَرَّبِیْنْ صالحین کی نیکیاں مقربین کی برائیاں ہیں۔ اہلِ نفس کے مقام کے احکام الگ ہیں اور اہلِ دل کے اعلیٰ مقامات کے احکام الگ۔ اعلیٰ مقام پر رہ کر نیچے والوں کے کام کریں تو مار پڑ جاتی ہے۔

بعض وقت انسان پر تحکّم اور تعزّز کی تجلّی ہوتی ہے تو خوب حکم چلتا ہے۔ عزت ملتی ہے۔ لیکن تبختر (فخر اور اکڑ) کرے اور سمجھ لے اور اسباب ظاہری (عزت تعلقات) پر بھروسہ کرے۔ یعنی انیّت و انانیت آجائے، جو نادانستہ طور پر تحت الشعور میں پڑے رہتے ہیں تو تحکّم و تعزّز کی تجلّیاں رُک جاتی ہیں۔ ایسے موقع پر مقامِ عبدیت میں رہیں۔ نیچے کے مقام پر صبر کریں۔ نفس کے مقام پر رہ کر لے نفسی و لے ارادتی کے لوازم چاہنا مناسب نہیں۔ اصلاح کی خاطر نعمت روکی جاسکتی ہے۔ اس محل پر توبہ کے ذریعے توفیق طلب کرے۔

(۵۳) عقل و قلب
انسان میں دو قسم کی حرارت ہوتی ہے۔ ایک بخار کی حرارت جو مرض و کمزوری کی علامت ہے۔ اور ایک صحت کی حرارت جو قوت کی نشانی ہے۔ اسی طرح ایمان کے تعلق سے ایک حرارت نفسانیت کی ہوتی ہے اور ایک توحید کی۔ مطلب یہ کہ ہم قلب کے اعتبار کے تحت رہیں۔ اور عقل کو قلب و قرآن کے تابع رکھیں تو ہدایت ملے گی۔ ورنہ محض عقل و دماغ کے تحت رہیں تو حیرانی رہے گی۔ اس کی مثال ایسی جانو کہ طوفانی بارش ہو رہی ہے۔ گھر گر رہے ہیں۔ تو قلب

**(۵۰) خیر و شر کی بصیرت** عام مسلمان اور علماء بھی قرآن پڑھتے ہیں اور اولیاء اللہ بھی۔ لیکن قرآن سے علماء ظاہر اور اولیاء اللہ کو جو بصیرت ملتی ہے اس کی کیفیت میں فرق ہے۔ اولیاء اللہ پر شرح صدر اور علم لدنی کی وجہ سے قرآن مجید کی آیات جو خیر سے متعلق ہیں، اُن میں خیر کی مقدار کا تناسب کھل جاتا ہے کہ کس عمل میں خیر کی مقدار کا تناسب کیا ہے۔ اسی طرح قرآن کی آیات جو شر سے متعلق ہیں اُن میں شر کی مقدار کا تناسب بھی کھل جاتا ہے کہ کس عمل میں شر کی مقدار کا تناسب کیا ہے۔ اس کے برخلاف عام علماء خیر و شر کا تقابل تو جانتے ہیں لیکن تناسب کا انھیں صحیح علم نہیں ہوتا کہ وہ خیر کثیر اور خیر قلیل میں کما حقہ تمیز کر سکیں۔ اسی طرح خیر و شر کی باریکیوں پر بھی علمائے ظاہر کی نظر نہیں جاتی تو عمل کہاں کریں گے۔ اس کے برخلاف اولیائے کاملین کے پاس ایسی میزانِ بصیرت ہوتی ہے جس میں رائی برابر خیر و شر بھی تل جاتے ہیں

**(۵۱) حسنِ ظن** یہ اصول یاد رکھو۔ ہر کسی سے خیر کی توقع رکھیں، لیکن اس سے شر ظاہر ہونے پر تعجب نہ کریں۔ اکثر لوگ اسی میں حیران رہتے ہیں کہ فلاں صاحب سے ایسی امید نہ تھی۔ میاں! اُمید ہی کیوں رکھی۔ اس میں خیر فرض ہی کیوں کیا۔ ہر ایک اپنا اقتضا ظاہر کر رہا ہے۔ دیکھتے رہو۔ جہاں تک خیر کا تعلق ہے وہ اللہ کا فضل ہے۔ اور جہاں تک شر کا تعلق ہے اُس کا ذاتی ہے۔ اللہ کے فضل کی امید پر ہر ایک سے حسنِ ظن رکھنا چاہیئے اور بدظنی نہ کرنی چاہیئے۔ اِنَّ اللّٰہَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَی النَّاسِ (۲/۱۱) تحقیق اللہ لوگوں پر فضل کرنے والا ہے۔ البتہ خیر ظاہر نہ ہو اور شر ظاہر ہو تو تعجب نہ کریں کہ یہ اس کے اقتضائے ذاتی کے مطابق ظاہر ہو رہا ہے۔ اسلام کی تعلیم میں عمل کے ارادے پر اِنْ شَاءَ اللّٰہُ (اگر اللہ نے چاہا) کہنے کا حکم ہے۔ اس کا منشا یہی ہے کہ تمام خیر اللہ تعالیٰ کے فضل پر منحصر ہے۔ ورنہ

عقل کے ذریعے انسان ایٹم بم، ہائیڈروجن بم بنا کر اپنی قوت کو ہزاروں گنا بڑھاتا ہے۔ جب عقل میں اتنی قوت ہو تو ایمان میں کتنی قوت ہوگی۔ اور ہماری دُعاؤں کے آثار کتنے قوی ہوں گے۔ ایک مومن کی دعا چھوٹے سے چھوٹے لشکر کو بڑے سے بڑے لشکروں پر فتح و غلبہ دلاتی رہی ہے۔

**(۵۵) عدل و فضل** قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ کو ذو عدل (عادل) کہیں نہیں کہا گیا۔ بلکہ اس سے بڑھ کر ذو فضل (فضل والا) کہا گیا عدل تو اس وقت ہوگا جبکہ بندے کا کوئی حق ہو۔ ہم رائی برابر کا حق نہیں رکھتے تو بغیر حق کے عدل کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔ البتہ اللہ فضل فرماتا ہے کہ بندے کو حق نہ ہونے کے باوجود نعمت عطا کرتا ہے۔ اعمال کا مدار وجود پر ہے اور وہ ہمارا ذاتی نہیں۔ زاید بر ذات ہے۔ محض فضل ہے۔ هٰذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّیْ (۱۹/۸)

**(۵۶) اَن پڑھ اور فضل** قرآن فہمی اور سلوک میں ترقی کے لیے پڑھنا لکھنا لازم نہیں۔ بلکہ ایک ایسا محل آتا ہے جہاں علوم مکسوبہ کو بھولنا پڑتا ہے جس کے بغیر علمِ حق قلب میں نہیں آتا۔ وہ اعلیٰ علم ہے، کسبی نہیں۔ اِس کو شرحِ صدر، علمِ لَدُنّی کہتے ہیں جو خاص فضل ہے۔ اللہ جسے چاہتا ہے دیتا ہے۔ چنانچہ مولانا رومؒ، حضرت غزالیؒ اور حضرت سہروردیؒ نے بھی اِس کی وضاحت فرمائی ہے۔

صد کتاب و صد ورق در نار کن      روئے خود را جانبِ دلدار کن

اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلعم کی خصوصیتِ اُمّی (اَن پڑھ) بیان کی۔ آپ پڑھے لکھے نہ تھے۔ لیکن اتنا عظیم الشان علم (قرآن) لائے اور سب عالم کو سکھا گئے۔ اور بڑے بڑے صحابہ پیدا کئے جن میں اکثر اَن پڑھ تھے۔ بعض اکابر اولیاء اللہ بھی ایسے ہوئے ہیں کہ اُن کا ظاہری علوم میں کوئی خاص مقام نہ تھا جس پر سب کو حیرت ہے۔

کا کام یہ ہے کہ وہ سمجھے۔ بارش کا برسانے والا اللہ ہے۔ اس کے حکم سے بارش ہو رہی ہے۔ لہذا اُس سے دُعا کئے جائیں کہ بارش رُکے اور ہم نقصان سے بچیں۔ یہ تو قلبی اعتبار ہوا۔ اسی کے ساتھ ساتھ عقل کے تقاضوں کو بھی پورا کریں۔ اور گھر کے ٹپکے وغیرہ درست کرائیں۔ اِس طرح قلب ہی کے زیرِ ہدایت عقل کو استعمال کریں۔

دین کے لیے قلب و دماغ دونوں کی ضرورت ہے۔ ہر ایک اپنے محل پر ضروری ہے۔ عہدِ جدید کا اقتضا علمی تحقیقات ہے۔ جس میں دماغی لحاظ سے دارالمصنفین اعظم گڑھ اچھا کام کر رہا ہے۔ دُنیا پر دماغی عظمت ظاہر کر رہا ہے۔ لیکن بڑا کام قلبی ہے جو اولیاء اللہ کا ہے۔ حضرت غوثِ اعظمؒ نے قلبی و دماغی دونوں خدمات انجام دیں۔

**(۴۵) عقل و فضل**

ہر روز تجربہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم کل تک بے وقوف تھے، محض فضل پر بچے۔ لوگ عقل و فضل کے فرق کو نہیں سمجھتے۔ ناچیز نے عرض کیا، عقل بھی تو فضل ہی ہے۔ فرمایا۔ بے شک۔ لیکن عقل کے حدود ہیں اور فضل لامحدود ہے۔ عقل کی چمک جگنو کی چمک ہے جو تھوڑی دیر کے لیے ہوتی ہے لیکن فضل تو نور ہے، لامحدود ہے۔ اِس امتیاز کو اہلِ عقل بھی دیکھتے ہیں لیکن سمجھتے نہیں۔ جب فضل ہوتا ہے تو اُلٹی بات بھی سیدھی بیٹھ جاتی ہے جس کی توجیہہ ممکن نہیں۔ فضل نہ ہو تو عقل سے جتنے بھی جوڑ بٹھا لو، زاویے بنا لو، لیکن جوڑ بیٹھتا ہی نہیں۔ اس لیے ہر آن ہم فضل کے محتاج ہیں۔ وَاسْئَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ (پ۵) یعنی اللہ سے اس کا فضل مانگو۔ ہمارے معاملات میں عقل برائے نام ہوتی ہے لیکن ہم اللہ کے فضل سے بڑے عقل مند سمجھے جاتے ہیں۔

ہر معاملے میں فضل کا اعتبار رہے۔ تفاخر کا اعتبار نہ آئے۔ اپنی ذاتی اہمیت و عظمت محسوس نہ کریں۔ واٹر پروف بنے رہیں۔ جس پر تعریف و مقبولیت کے قطرے تو گرتے ہیں لیکن دل میں رطوبت نہیں پہنچتی۔ یہی حفاظتِ الٰہی ہے۔

اسلام لایا جس پر آج حیرت کی جاتی ہے۔ اور پنڈوہ کے بزرگ حضرت علاؤالحق والدین جن کا آج سارا بنگال معتقد ہے ان ہی اخی سراج عثمانؒ کے تراشیدہ ہیں۔

(۵۸) خشیت و شکر

ناچیز کی ایک کامیابی پر فرمایا۔ قلب لذت نہ لے بیٹھے تا آئے۔ یہ ادعا نہ ہو کہ ہم نے کچھ کیا۔ کسی چیز کا مدعی نہ سمجھو۔ لادعویٰ رہو۔ نہ تو کسی کے کہنے سے خوش ہو، نہ خائف و مغلوب ہو۔ عشق شکر ادا کرکے خشیت کے مقام پر رہو۔ غیب پر ایمان لانا فرض ہے۔ ورنہ شہود و شہادت کے بعد، احکام، آثار دیکھ کر تو کافر، فرعون تک ایمان لاتا ہے۔ اب تو تجلی موافق رہی۔ کیا معلوم کہ دوسری تجلی کیا ہوتی ہے۔ ہمارے گناہ کیا کم ہیں۔ اسی لیے اولیاء استغفار میں لگے رہتے ہیں۔ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا کہتے رہتے ہیں۔ قرآن میں مختال اور فخور نہ بننے کی تعلیم ہے۔

قرآن نے فرح سے منع فرمایا۔ لَا تَفْرَحْ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْفَرِحِیْنَ (۲۰/۱۱) ترجمہ: مت خوش ہو۔ تحقیق اللہ نہیں دوست رکھتا بہت خوش ہونے والوں کو۔ و نیز حکم ہے: لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ یَفْرَحُوْنَ بِمَا اَتَوْا وَّیُحِبُّوْنَ اَنْ یُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ یَفْعَلُوْا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ (۴/۸) یعنی اللہ کی عطا کے باوجود فرح (اترانا) نہیں کر سکتے حمد اپنی طرف منسوب نہیں کر سکتے۔ اگر ایسا کریں تو عذاب سے نہیں بچ سکتے۔ انبیاءؑ کی زندگی اسی خشیت پر ہے۔ وَیَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَیَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ (۱۵/۵) یعنی عذاب کو ہر وقت حاضر جانیں اور ہر وقت خائف رہیں۔ رحمت کی امید من اللہ آتی ہے۔ وہ مقام نہیں ہے۔ اسی لیے یوسف علیہ السلام کی دعا تھی تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا (۱۳/۲) (یا اللہ) مجھے مسلمان مار یو۔ نبی کریم صلعم رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ، بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ہونے کے باوجود خشیت سے فرماتے۔ وَمَا اَدْرِیْ مَا یُفْعَلُ بِیْ وَلَا بِکُمْ (۱۶/۲) یعنی نہ معلوم میرے اور تمھارے ساتھ کیا کیا جائے گا۔

قرآنی معارف کا حصول ڈگریوں پر نہیں۔ لکھنے پڑھنے کو شرح صدر اور فضل الٰہی سے کوئی تعلق نہیں۔ دُور کیوں جائیں۔ خود ہمارے بڑے حضرت قبلہ کمال اللہ شاہ ؒ ہی کو لو۔ وہ کیا پڑھے لکھے تھے۔ عربی کے اعراب تک ٹھیک نہ پڑھ سکتے تھے۔ لیکن معارف قرآنی کا دریا بہتا تھا۔ پروفیسر مولوی مناظر احسن گیلانی ؒ تو آپ پر فدا ہی تھے۔ لیکن ان کے استاد مولانا حکیم برکات احمد ٹونکی ہندوستان کے مشہور عالم، فلسفی، متکلم اور ادیب تھے۔ ستر برس کی عمر میں آدھ گھنٹے کی تعلیم میں حضرت کے قدموں پر گر پڑے۔ بیعت و خلافت حاصل کی۔ اور فرمایا۔ اگر یہ علم توحید حضرت سے نہ ملتا تو میں دُنیا سے مُلحد چلا جاتا۔ اِسی طرح بڑے عالم مولوی صفی الدین صاحب نے، جو حرمین شریفین میں مدتوں رہے۔ بڑھاپے میں حضرت کے قدموں پر علم حاصل کیا اور مجھ سے فرمایا۔ ایک پھانس تھی جو دل میں لگی ہوئی تھی لیکن حضرت کی صحبت میں نکل گئی اور علم حق نصیب ہُوا۔

**(۵۷) مبلغ اعظم بنگال** اِسی سلسلے میں مولوی مناظر احسن صاحب کی کتاب "مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت" کے حوالے سے حضرت اخی سراج مبلغ اعظم بنگال کا بھی ذِکر فرمایا۔ حضرت نظام الدین محبوب الٰہی ؒ نے دِلّی میں عظیم الشان تبلیغی نظام قائم فرمایا تھا۔ آپ نے سیکڑوں اولیاء اللہ کو دکن، بنگال، پنجاب اور سارے ہندوستان میں تبلیغ کے لیے بھیجا۔ ان میں حضرت اخی سراج عثمان ؒ مبلغ اعظم سمجھے جاتے ہیں اور صاحبِ بنگالہ مشہور ہیں۔ آپ سلطان جی کے مرید و خلیفہ تھے۔ بڑھاپے تک بالکل ناخواندہ رہے۔ لڑکپن سے حضرت کے خدمت گاروں میں پرورش پائی۔ سلطان جی کے حکم پر استاد مولانا فخر الدین نے اخیر عمر میں چھ مہینے تعلیم دی۔ اس کے بعد سلطان جی ؒ نے آپ کو بنگال بھیجا اور تبلیغ کا فرض سپرد فرمایا۔ آپ کے فیض سے تقریباً سارا بنگال

رہے۔ رَضِیَ اللّٰہُ عَنۡھُمۡ وَ رَضُوۡا عَنۡہُ ذٰلِکَ لِمَنۡ خَشِیَ رَبَّہٗ (۳۰ / ۲۳) خشیت کے بعد ہی اجر و مغفرت عطا ہوتے ہیں۔ اِنَّ الَّذِیۡنَ یَخۡشَوۡنَ رَبَّھُمۡ بِالۡغَیۡبِ لَھُمۡ مَّغۡفِرَۃٌ وَّ اَجۡرٌ کَبِیۡرٌ (۲۹ / ۱) غیب پر خشیت و ہیبت ہونی چاہئے۔ حاضر پر کیا ہوگی۔ اسی لیے تقویٰ (خوف) کا انحصار ایمان بالغیب پر ہے جتنا بڑا فضل ہو اتنا ہی خوف لازمی ہے۔ فضل و مراتب کی جتنی بلندیاں نصیب ہوں گی اتنا ہی فطرتاً اس امر کا خوف ہوگا کہ اس بلندی کے نیچے شر و عذاب کی کتنی گہرائیاں ہیں جن میں گرنے کا خوف لگا ہوا ہے۔ لہذا "ایاز قدر خود بشناس۔ قرب سلطانی مخدوش باشد" ملحوظ رہے۔

## (۵۹) خشیتِ الٰہی اور خوفِ غیر اللہ

ناچیز نے عرض کیا۔ حضرت موسیٰؑ عصا کے اژدہا بننے سے ڈر گئے۔ اولیاء اللہ کے "لَا خَوۡفٌ وَّ لَا حُزۡنٌ" کا کیا مطلب ہے۔ فرمایا۔ خوف کی دو نوعیتیں ہیں۔ ایک وہ جس کے محرک انسانی زندگی کے طبعی تقاضے ہوتے ہیں جو انسانی فطرت اور حکمتِ الٰہی کے مطابق ہیں۔ جیسے کسی شخص کا ہاتھ ناواقفیت میں آگ پر پڑ جائے تو وہ بے اختیار گھبرا کر ہاتھ ہٹا لے گا۔ دوسری نوعیت کا خوف و خشیت وہ ہے جس کا تعلق اللہ تعالیٰ کی ذات سے ہے۔ یعنی بندہ غیر اللہ کو عدم اور میتِ محض جانتا ہے اور اللہ کے سوا کسی کو موثر، نافع، ضار نہیں جانتا۔ تمام نعمتوں کو اللہ کی طرف سے جانتا ہے۔ اور کسی نعمت کا قیام ایک لحظہ کے لیے بھی لازمی نہیں سمجھتا۔ داخل و خارج میں کتنے ہی موافق آثار ظاہر ہو جائیں، نہ وہ فرح کرتا ہے اور نہ اس کی نیت میں فرق آتا ہے کہ نہ معلوم دوسری آن کیا تجلی آ جائے۔ اسی طرح اگر مخالف آثار جمع ہو جائیں تو ان کو قطعی نہیں سمجھتا کہ وہ اپنی ذات سے موثر نہیں۔ بلکہ اللہ کے حکم کے تابع ہیں۔ اللہ سے امید رکھتا ہے کہ ممکن ہے وہ خیر و فضل کی صورتیں

اللہ اکبر۔ خشیت کی حد ہے۔ حضورؐ کا عام میلان حُزن کی طرف تھا۔ ممالکِ عرب کے فتوحات کے باوجود حضورؐ ہر آن کانپتے تھے۔ روتے تھے۔ استغفار فرماتے تھے۔ کبھی آپ کو ہنستے نہیں دیکھا گیا۔ صرف مُسکرا دیتے تھے۔ حدیث میں ہے۔ جو میں جانتا ہوں تم جانتے تو بی بی بچوں کو بھول جاتے۔ اِسی مقامِ حُزن و خشیت پر لَا تَحْزَنْ (۹/۴۰) کا انعام مِلتا ہے۔

چاہے کتنا ہی فضل ہو نفس کے تحت کوئی خوشی نہ ہو۔ البتہ قرآن میں صرف ایک بات پر فرح کی اجازت ہے اور وہ ناقابلِ تبدیل حقیقت قرآن ہے۔ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِ اللّٰهِ (۶/۳۴) صرف قرآن کو استحکام ہے۔ باقی سب حالات ہر آن بدلنے والے ہیں۔ ان کو مستقل جان کر کیسے خوشیاں منائی جا سکتی ہیں۔ اللہ کے الطاف و عنایات پر بھی نہ خوش ہوں اور نہ اترائیں بلکہ صرف شکر کریں۔ الحمد للہ کہیں۔ صرف قرآن اور قرآن کے علم کے انفتاح کے لحاظ سے فرح کی اجازت ہی نہیں بلکہ امر ہے۔ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا (۱۰/۵۸) ترجمہ (کہہ اللہ کے اس انعام اور رحمت پر خوش ہونا چاہئے) اللہ نے ہم کو قرآن کے قابل سمجھا۔

قرآن کا تقاضا دوسری جگہ یوں بیان ہوا ہے۔ لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ (۵۹/۲۱) ترجمہ۔ اگر ہم اس قرآن کو پہاڑ پر اُتارتے تو اُس کو دیکھتا کہ خدا کے خوف سے دب جاتا اور پھٹ جاتا۔ قرآن جن پر اُترے اللہ کی خشیت طاری ہو جاتی ہے خشیت پر کیسے فرح ہو گی۔ چونکہ ترو تنزل ہمارا مقام ہے نہ معلوم دوسری آن کس معصیت کے غار میں گریں۔ اپنے کو کبھی مامون نہ سمجھیں۔ خوف و خشیت کا مقام ہی عبدیت ہے۔ خشیت اور نعمت میں تضاد نہیں۔ رجائیت (امید) رب کا فضل ہے جو سنبھال کر ہمیں زندہ رکھتی ہے۔ رضا کا مقام و انعام بھی اُسی کو ملتا ہے جو خشیت کے مقام پر

لہذا اُن پر "لا تفرح" کا اطلاق ہوگا اور اُن کے مقام کے لحاظ سے سزا ہوگی البتہ خشیت کے علم کے بعد توازن ٹھیک ہو جاتا ہے۔ میرے علم میں ہے کہ بعض موجودہ اولیاء نے خوشی کی تو ایسی گت بنی کہ شی ہی جان لیوا ثابت ہوئی۔ اکثر سالکین مُخْتَالٌ فَخُوْرٌ (اترانے والا، فخر کرنے والا) اور وَاَمَّا بِنِعْمَتِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ (۳۰/۱۸) میں تطبیق نہیں دے سکتے۔ نفس کے تحت خوب بڑائیاں کرتے ہیں اور نعمت بیان کرنے کے حکم سے اس کی سند لیتے ہیں۔ عقیدہ کا نام لے کر بداعمالیوں کے لیے بہانے تلاش کرتے ہیں۔ الحمد للہ کہتے جاتے ہیں، لیکن دراصل الحمد لی ہوتا جاتا ہے۔

**(۶۱) فرح اور شکر کا فرق** لوگ فرح اور شکر میں فرق نہیں کرتے حالانکہ فرح کی بنیاد انیّت پر ہے جو شرک ہے۔ اور شکر کی بنیاد بے ارادتی پر ہے جو توحید ہے۔ ہر مقام اور ہر محل کا ایک عمل ہے جو عمل مقربین کا ہے وہ اصحابِ یمین سے متوقع نہیں اور اصحابِ یمین کا علم و عمل مقربین کے لیے سیئات بن جاتا ہے چونکہ وہ اس محل کے خلاف ہے۔ بلکہ سزا ہوکر تنزل ہو جاتا ہے۔ ہر محل کی ٹریننگ کے بعد مقام بنتا ہے۔ اعلیٰ مقام پر رہ کر نیچے والوں کی طرح فرح کرنا چاہو تو غلطی ہے۔ اگر خوشیاں کرنی ہوں تو نیچے آؤ۔ وہاں اس کی اجازت بلکہ تائید و تقویت ہے۔ اوپر رہنا چاہو تو ہوائی جہاز کی فضا کے تابع رہنا پڑے گا۔ اگر زمین پر موٹر یا پنڈی کا سفر مطلوب ہو تو یہاں کے اعتبارات الگ ہیں۔ ہر محل کے خطرات، انعامات، احکام علیحدہ ہیں جن کی تعمیل وہاں کے محل کا اقتضا ہوگی۔

**(۶۲) آمد و آورد** خشیت کی نعمت بعضوں کو آورد سے ملتی ہے، بعضوں پر آمد رہتی ہے۔ بعض آورد سے آمد کی طرف آتے ہیں،

پیدا کر دے۔ اس کی نظر ہمیشہ حق پر لگی رہتی ہے کہ وہ کیا کرتا ہے اور اس کا کیا منشا ہے۔ اور وہ اپنی جنبشوں کو منشائے الٰہی کے تابع بنا لیتا ہے۔ اس طرح مخلوق کے تعلق سے اس کا قلب "لا خوف و لا حزن" کے مقام پہ رہتا ہے۔ نہ غیر اللہ سے خوف کرتا ہے نہ امید رکھتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے تعلق سے اس پر ہر آن خوف و رجا کا حال طاری رہتا ہے۔

حضرت موسیٰؑ نے امرِ الٰہی کے تحت عصا پھینکا۔ وہ اژدہا بن گیا۔ عصا کے اژدہا بننے میں حضرت کے علم و ارادت کو دخل نہ تھا۔ حکمتِ الٰہی کے تحت آپ ڈر کر پلٹے۔ لیکن اللہ نے امر فرمایا، مت ڈرو۔ میرے پاس رسولوں کو خوف سے سروکار نہیں، جب اُن کے ساتھ امر و قدرت کا معاملہ ہوتا ہے تو کوئی مخالف آثار کام نہیں کرتے۔ اژدہا میں نے پیدا کیا اور میں ہی اس کے شر سے محفوظ رکھ سکتا ہوں۔ اس سے حضرت موسیٰؑ کی تعلیم مقصود تھی۔

**(۶۰) اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ یا اَلْحَمْدُ لِیْ**

سوال۔ لَا تَفْرَحْ (۲۰/۱۱) اور قُلْ بِفَضْلِ اللّٰہِ وَ بِرَحْمَتِہٖ فَبِذٰلِکَ فَلْیَفْرَحُوْا (۱۱/۱۱)، ان دو آیتوں میں کیا تطبیق ہے۔ فرمایا۔ عوام کی خوشیوں میں اور عارفین کی خوشیوں میں بڑا فرق ہے ہر دو کے احکام جدا ہیں۔ خوشیاں منانے پر عوام قابلِ بازپرس نہیں۔ لیکن عارف قابلِ بازپرس ہو جاتے ہیں۔ اس آیت میں اللہ کے فضل و رحمت کے علم پر خوشی منانے کو کہا جا رہا ہے جو اشیا کے اوپر کی چیز ہے۔ لیکن بعض مرشدنیا جس پر خوشی کرتے ہیں وہ "شی" ہوتی ہے۔ یعنی شی کے حصول پر وہ خوشیاں کرتے ہیں، نہ کہ فضل و رحمتِ الٰہی پر۔ اُن کا دل گواہی دے سکتا ہے کہ ان کے دل پر شیئیت غالب ہے یا فضل و رحمت۔ اسی پر تصفیہ ہو جائے گا۔ اگر شی کے تحت ہو تو نفس ہے۔ لیکن مریدین کو سمجھانے کے لیے فضل و رحمت کہہ دیتے ہیں۔

کی بشارت دی گئی۔ یعنی ہم نے تم کو کھلم کھلا فتح عطا کی تاکہ تمھارے
اگلے پچھلے گناہ معاف فرمائیں۔ نہ صرف یہی بلکہ وَيُتِمَّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكَ (۲۶/۹)
کی بشارت عظیم بھی ملی کہ اللہ تم پر اپنی نعمت تمام کر دے۔

ناچیز نے عرض کیا حضرت سلیمانؑ نے حکومت مانگنے سے پہلے مغفرت
کی استدعا کی ہے۔ حضور انورؐ کو اتمام نعمت کی عطا سے پہلے مغفرت گناہ (ذَنْبِكَ)
کی بشارت ملی ہے۔ لیکن انبیاؑ تو معصوم ہیں۔ گناہ سے پاک ہیں تو پھر ذَنْبِكَ
کا کیا مطلب ہے۔ فرمایا سمجھنے کی بات یہ ہے کہ رسول کے مرتبے کا گناہ کیا چیز ہے۔
بعض لوگ جہالت سے یہ سمجھتے ہیں کہ رسول بھی دوسرے لوگوں کی طرح اقتضائے
بشری کے تحت گناہ کرتے ہیں۔ یہ غلط ہے۔ رسول تو معصوم ہوتے ہیں
یہاں عام گناہ کا اعتبار نہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ عبدیت سبحان اور
عبد کے مابین حد فاصل ہے سبّوحیت میں تو کسی قصور، نقص اور عیب کا
گزر نہیں۔ لیکن عبدیت وجہ فاصل ہے۔ ذات عبد مرجع ہے قصور کا، نقص
اور عیب کا۔ چنانچہ ذَنْبِكَ فرماکر عبدیت کے اسی فرق کو ظاہر کیا جا رہا ہے
پس رسول کے مرتبے کا ذنب، یہی ہے کہ عبد ہے، فقیر ہے، سراپا نقص و
عدم ہے۔ کوئی کمال ذاتی نہیں۔ یہ ربط اللہ تعالیٰ کو حد درجے محبوب ہے
اور محبوبیت تامہ ہی کا نتیجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ رسول اللہؐ کے اگلے پچھلے گناہ
معاف فرمانا چاہتا ہے اور اپنے محبوب میں کوئی نقص اور عیب کا پہلو دیکھنا
نہیں چاہتا۔ ہر وقت درود اور رحمت بھیجتا ہے اور محامد و مکارم سے زینت
دینا چاہتا ہے اور محمدؐ بنا دیتا ہے۔ لیکن ازلاً ابداً عبدیت کی حد فاصل رسول اللہ
(عبد) صلعم اور سبحان (اللہ) میں قائم و دائم ہے۔ سُبْحَانَ الَّذِي أَسْرَىٰ
بِعَبْدِهِ (۱۵) اس پر دال ہے۔ یہ وہ نکتے ہیں کہ بیان ان کا متحمل نہیں۔

یہ بھی مناسب ہے۔ البتہ آمد ہی آمد ہے، فوراً خشیت کا علم کھلے تو کیا کہنا۔ اس کا فضل ہے۔ ماشاء اللہ۔ خشیت کہنے کی چیز نہیں۔ کھلنے اور گزرنے کی چیز ہے۔ جب تک یہ حاصل نہ ہو قرآن کھلتا نہیں۔ محض الحمد للہ کہنے اور نعمت میں گم رہنے سے محظوظیت و توازن نہیں پیدا ہوتے۔ گویا ہوا کے گھوڑے پر سوار ہیں جس میں قطعیت و قرار نہیں۔ البتہ خشیت کے علم کے بعد توازن ٹھیک ہو جاتا ہے۔ اور یہ علم بھی ایک قطرہ ہے بحرِ زخار کا۔

## (۶۳) استغفار اور شکر کا قرآنی سلوک اور ذنبک کی تشریح

فرمایا۔ قرآن نے دو باتیں بہت بڑی بیان کی ہیں۔ استغفار اور شکر۔ یہ ایمان و ترقی کی جان ہیں۔ یہ بہت نازک اور اعلیٰ اعتبار ہے۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ گناہ پر استغفار کر لیا اور کھانا ملنے پر شکر، تو بڑا کام کر لیا۔ لیکن یہ بہت بلند چیز ہے۔ اللہ کھولے تو سمجھ میں آئے حضرت سلیمانؑ نے دعا فرمائی۔ رَبِّ اغْفِرْ لِیْ وَھَبْ لِیْ مُلْکًا الخ (۲۳/۱۲) حضرت کس درجے کی حکومت مانگتے ہیں۔ لیکن اس سے پہلے استغفار فرماتے ہیں۔ کیا یہاں جرائم گناہ مقصود ہے، ہرگز نہیں۔ اگر جرائم گناہ مقصود ہوتا تو اس عفو طلبی کے ساتھ ملک و حکومت مانگنے کا یہاں موقع نہ تھا۔ لیکن یہاں استغفار اور ملک مانگنا لازم و ملزوم ہیں۔ اللہ سمجھائے تو سمجھ میں آئے۔

یاد رکھو دیگر انبیاءؑ نے اپنے لیے جن نعمتوں کی دعائیں کیں، حضور انور صلعم کو ان نعمتوں کی عطا کی بشارتیں دی گئیں۔ مثلاً حضرت موسیٰؑ نے شرح صدر کے لیے دعا فرمائی۔ لیکن حضورؐ کو اَلَمْ نَشْرَحْ کی بشارت ملی۔ اسی طرح حضرت سلیمانؑ نے رَبِّ اغْفِرْ لِیْ وَھَبْ لِیْ مُلْکًا عرض کیا تو حضور انورؐ کو اِنَّا فَتَحْنَا لَکَ فَتْحًا مُّبِیْنًا۔ لِیَغْفِرَ لَکَ اللّٰہُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِکَ وَمَا تَاَخَّرَ وَ

جس کے پاس کتاب آسمانی کا علم تھا کہا میں پلک جھپکتے لے آؤں گا چنانچہ لاکر پیش کر دیا۔

**(۶۵) عبدیت و فلاح** | بعض لوگ عبادات و تقدس پر بھروسہ کرتے ہیں مشیخت کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن قرآن کہتا ہے۔ وَمَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَعَسٰى اَنْ يَّكُوْنَ مِنَ الْمُفْلِحِيْنَ (پ۲۰) یعنی جنھوں نے توبہ کی، ایمان لائے اور عمل صالح کیا۔ ممکن ہے فلاح پائیں۔ دل لرز جانے کی بات ہے کہ ایمان و عمل صالح کے باوجود فلاح کا دعویٰ نہیں کر سکتے کیسی عبدیت ظاہر فرمائی ہے۔ پھر فوراً ارشاد ہے۔ وَاللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ وَيَخْتَارُ (پ۲۰) یعنی اللہ جسے چاہے پیدا کرے اور فلاح کے لیے منتخب کرے۔ مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ (پ۲۰) ان کو کوئی اختیار پسندیدگی نہیں۔ فلاح اللہ کا محض فضل ہے اس لیے ہر آن خشیت میں رہیں۔

**(۶۶) مقبولیت کی روح** | ایک نازک بات یہ ہے کہ تقویٰ و ریاضت اور عبادتیں اور اوراد کیے جاتے ہیں، وہ گویا بمنزلہ جسم تو بنا دیتے ہیں لیکن یہ لازمی نہیں کہ اس میں روح بھی ہو۔ یہ تو محض فضل الٰہی ہے اللہ تعالیٰ اس جسم میں قبولیت کی روح بھر دے۔ نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ (پ۱۴) اس پر دال ہے۔ اسی لیے اولیاء اللہ آخیر وقت تک عبادات کے باوجود یہی فرماتے ہیں اگر اللہ قبول کرے اور رحم کرے یا بخشش کرے تو ہمارے لیے خیر ہے۔ وہ ذات تو غنی ہے۔ اس کے سامنے سب عبادات و ریاضات کے بعد نہ ادعا ممکن اور نہ حق ثابت کر سکتے ہیں۔ اللہ خشیت مقام رکھے (آمین)

بلکہ بیان کرنے سے بھی سمجھ میں نہیں آتے۔ محض فضل سے کھلے تو سمجھ میں آ لے جب حضورِ انورؐ کی عبدیت کا یہ عالم ہے تو آپ کی عبادات کا کیا ترفع ہوگا۔ قیاس سے باہر ہے۔

یاد رکھو۔ قرآنی سلوک یہ ہے کہ درخواست (دعا) پر استغفار کا اسٹامپ لگایا جائے کہ اس اسٹامپ کے بغیر درخواست قابلِ پیش رفت نہیں۔ علاوہ ازیں حضورؐ کا توسط (درود) اللہ تعالیٰ کی عطا کی کشش کے لیے خاص راز ہیں یہ قرآنی سلوک فطرت کے مطابق ہے۔ استغفار و شکر کا یہ قرآنی سلوک ابتدائی قرونِ میں کثرت سے ملتا تھا۔ چنانچہ ارشاد ہے۔ ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ وَقَلِيْلٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ (۵۶/۱۴) یعنی پہلے زمانے میں مقربین کی کثرت ہوگی۔ بعد میں ان کی تعداد کم ہوگی۔ لیکن ہر زمانے میں ان کی قوت اسی اصولِ تعلیم کی بنا پر ہوگی۔ آج کل لوگ قرآنی سلوک بھول گئے۔ اور اس کے استاد بھی کم نظر آتے ہیں۔

**(۶۴) ملکِ سلیمانی اور مقامِ کُنْ**

ناچیز نے عرض کیا۔ حضرت سلیمان کی یہ دعا تو مقبول ہے کہ مجھے ایسا ملک و حکومت عطا کیجئے کہ میرے بعد کسی کو نہ ملے۔ لیکن بعد کو دوسروں کو اس سے بڑی بڑی سلطنتیں عطا کی گئیں۔ اس کی کیا توضیح ہے۔ فرمایا۔ یہاں ملک و حکومت کیفیت کے لحاظ سے ہے، نہ کہ مقدار و وسعت کے لحاظ سے۔ حضرت کی حکومت جن و انس بلکہ ہوا تک پر تھی۔ نہ صرف یہی بلکہ حضرت "کُنْ" کے مقام پر حاکم وقت تھے کہ صدیقین تک کو بارگاہِ ربوبیت سے لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ (۴۲/۲۲) کی شان عطا ہوتی ہے۔

آپ کا تو کیا کہنا۔ آپ کے ایک جن اور ایک (انسان) وزیر کی قوت و حکومت کا قرآن میں ذکر ہے۔ جن نے کہا۔ دربار برخاست ہونے سے قبل بلقیس کے تخت کو لا حاضر کروں گا۔ لیکن قَالَ الَّذِيْ عِنْدَهٗ عِلْمٌ مِّنَ الْكِتٰبِ الخ (۲۷/۴۰) وزیر نے

نہیں ہے۔ رسالت کے اعلان و وضاحت کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد اُس ایمانی توحید کا لطف ہے جو رسالت کے طفیل سے حاصل ہوتی ہے۔ اور جو اسلام کے باہر میسّر نہیں آسکتی۔ رسالت میں ہر کوئی سُنّت پر زور دیتا ہے اور زور دینا بجا ہے کہ قرآنِ کریم میں اتباع کی تاکید ہے۔ لیکن بہت سے اِس راز سے بے خبر ہیں کہ محبت اور تعظیم اتباع کی جان ہیں۔ ان ہی دونوں کے صحیح امتزاج سے حقیقی اتباع پیدا ہوتی ہے۔ محبت میں قوت ہے اور تعظیم میں تعدیل۔ جس اتباع کی بنیاد محبت و تعظیم نہ ہو وہ محض ایک رسمی تقلید ہے۔ اتباع نہیں ہے اور نہ اس میں اتباع کی خیر و برکت ہے۔ اتباع کے واسطے محبت و تعظیم کس قدر لازم ہے، اہلِ علم اس کی اہمیت سے بخوبی واقف ہیں۔ چنانچہ قرآنِ کریم میں توحید کے پہلو بہ پہلو حضور رحمۃ للعالمین کی محبت و تعظیم کی جو تعلیم ہے وہ دنیا میں بے نظیر ہے کہ عبدیت میں انتہائی محبوبیت و رفعت درج ہے۔

**(۴) دُعا** آپ کے ابتدائی طرزِ عمل نے مسلمانانِ عالم کو سخت متوحش اور مایوس کر دیا کہ گویا آپ کے عہدِ حکومت میں رسولِ کریم کی محبت اور تعظیم کے واسطے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ بعد کو تشدد گھٹنے لگا۔ حکومت کا مسلک رُو بہ اصلاح معلوم ہوتا ہے۔ گو رفتار سست ہے۔ . . . . ہم خدا سے دعا کرتے ہیں کہ وہ آپ کو رسول کریم کی محبت و تعظیم سے سرشار کر دے کہ اتباع زندہ ہو جائے۔ اور اتباع کی برکت سے توحیدِ نبوی کا رنگ چڑھ جائے . . . . اس کے بعد میں نے صلاۃ تنجینا اور قرآنی دعا پڑھ کر تقریر ختم کر دی۔

(اقتباس از صراط الحمید جلد دوم البرنی صفحہ ۹۳ تا ۹۶)

**(۲) مدارسِ مدینۂ طیبہ** مدینہ منورہ میں بچوں کے متعدد مدارس ہیں۔ مدارس تو اور بھی زیادہ کھل جاتے لیکن حکومت نے دینیات میں

# فصل چہارم

## تعبد۔ تعظیم شعائر اللہ۔ تکریم مقربین

(۱) سلطان عبد العزیز بن سعود کی فرمائش پر مکہ معظمہ کے شاہی جلسہ میں فی البدیہہ تقریر ۵ ذی الحجہ ۱۳۵۰ھ

فرمایا۔ آپ نے جو امن و امان قائم کیا ہے اس کا ہم اعتراف کرتے ہیں۔ اس کی قدر کرتے ہیں۔ اس کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ لیکن ہم سابقہ ترکی حکومت کا بھی احسان فراموش نہیں کر سکتے کہ اس نے اپنی عقیدت مندی سے حجاز میں دولت کے دریا بہا دیئے۔ اوقاف کی حد نہ تھی۔ داد و دہش کی حد نہ تھی۔ . . . . . . . . . . . .

(۲) رسالت کا معرکہ

یہ تو انتظامی امور تھے۔ اب دینی امور کو لیجئے۔ توحید پر جو بار بار زور دیا جاتا ہے، بہت خوب ہے۔ اسلام تو اسلام، اسلام کی برکت سے دوسرے مذاہب بھی توحید کا دعویٰ کر رہے ہیں۔ اللہ ایک ہے۔ وہی خالق ہے۔ وہی رازق ہے۔ وہی قادر ہے۔ وہی حاکم ہے۔ یہ عقائد آج بہت عام ہو گئے ہیں۔ کسی تاکید کے محتاج نہیں ہیں۔ آج اسلام اور دیگر مذاہب کے مابین جو بحث ہے۔ جو معرکہ ہے وہ رسالت پر ہے۔ ورنہ توحید پر سب راضی ہیں۔ اس لیے اسلام و کفر میں اس وقت ما بہ الامتیاز جو عقیدہ ہے، وہ رسول اللہ کی رسالت ہے۔ ورنہ عقلی اور قولی توحید تو بطفیل اسلام آج کم و بیش سب مذاہب میں عام ہو رہی ہے۔

(۳) توحید ایمانی کی روح حب نبوی

پس خالی توحید دوہرانا چنداں کارگر

چاہتا تھا۔ یہ غلط ہے۔ بلکہ اس نے کہا۔ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ (۹) میں آدم سے بہتر ہوں تو نے مجھے تو آگ سے بنایا اور اُسے مٹی سے۔ دراصل وہ رفعتِ انسانی سے انکار کر رہا تھا۔ اور آدم کے مقابلے میں اپنی رفعت ثابت کر رہا تھا۔ پس ہر وہ شخص جو مقاماتِ انسانی کی رفعت و عظمت کا انکار کرے، تم ہی بتاؤ کہ اس کے قلب پر رحمٰن کی تجلّی ہے یا شیطان کی۔

(۲) مغضوبین | انسان کی فضیلت و کرامت کے تعلق سے شیطان دو حربے استعمال کرتا ہے۔ ایک تو یہ کہ انبیاء، اولیا کی عظمت کا انکار کراتا ہے۔ جیسے آج کل کے مادہ پرست ہیں۔ معترضین میں بھی مادیت کا ایک رنگ ہے۔ انبیاءؑ اولیاء کی رفعت و عظمت کا انکار کرتے ہیں کہ وہ ان کی نظر میں گویا مٹی ہیں۔ یا مٹی کے پتلے۔ ہیچ ہیں۔ مُردہ ہیں۔ اور امانت، ولایت، خلافت کے خوبصورت الفاظ استعمال کر کے بھی اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ کے بجائے بَشَرٌ مِّثْلُنَا کہتے ہیں۔ یعنی یہ ہماری طرح ہیں۔ یا زیادہ سے زیادہ بڑے بھائی ہیں۔ اتنا فرق تو تابع و متبوع کی ہمتو میں ہونا عجب نہیں۔ لیکن باطنی طور پر ان کے قلوب پر اولیا اللہ کی عظمت ایسی مسلط رہتی ہے کہ وہ اس کو ہٹانے کے لیے اعتراض و توہین کے مرض میں ہر وقت مبتلا رہتے ہیں۔ اس طرح شیطان ان کو ان فیوض و برکات سے محروم کر دیتا ہے جو انبیاءؑ اولیاء کے ربط، رفاقت، ادب و توسّل سے حاصل ہوتے ہیں۔

(۳) ضالّین | اس کے برخلاف شیطان کا دوسرا حربہ یہ ہے کہ وہ انسانوں کی عظمت و رفعت میں غلو اور مبالغہ کراتا ہے کہ غلو کرنے والے لوگ بعض انسانوں کو خدا، خدا کا بیٹا، نبی یا اوتار ماننے لگتے ہیں۔ اور شرک میں مبتلا ہو جاتے ہیں افسوس ہے کہ بعض مرشدین بھی اس قسم کے غلو کا شکار ہیں۔ ان دو طبقوں میں سے ایک طبقہ مغضوبین کا ہے، تو دوسرا ضالّین کا۔

اپنے عقائد کا نصاب لازم کردیا ہے۔ جو لوگ اس نصاب کو قبول کرتے ہیں اُن کے مدارس جاری ہیں۔ جنہیں کچھ بھی عذر ہے اُن کے مدارس بند ہوگئے۔ فی الحال مولانا سید احمد صاحب فیض آبادی (برادر بزرگ مولانا حسین احمد صاحب دیوبندی) کا مدرسہ بہت ترقی پر ہے (حرم نبوی کے قریب) یہ مدرسہ گویا دیوبند کی ایک شاخ ہے چنانچہ اس تعلق کی یادگار میں مدرسے کے سامنے لب سڑک مولسری کے پودے بھی وہاں سے لاکر نصب کئے گئے ہیں کہ جو پھل وہاں آتے ہیں یہاں بھی آئیں۔ مدرسہ پر حکومت کی خاص عنایت ہے۔ اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ علمائے دیوبند میں اشاعت و تعلیم کا جو حوصلہ اور سلیقہ ہے اس کی مثال ہندوستان کے دیگر علماء میں کم نظر آتی ہے البتہ عقائد کی بحث جدا ہے۔ یہ ایک قدیم بحث ہے۔ نئی نہیں۔ مذہبی جماعتوں میں قدرتاً دیوبندیوں کا بڑا عروج ہے۔ حکومت سے گہرا ربط ضبط ہے۔ شیر و شکر کا معاملہ ہے۔ مولانا سید احمد صاحب سرگروہ ہیں (ص۱۳۷ تا ۱۳۹)

(مکہ معظمہ کے شاہی جلسہ میں) کل دوران میں بعض ہندوستانی مولوی صاحبان بڑے فخر سے اور بے تکلفی سے اِدھر اُدھر پھر رہے تھے کہ گویا اپنا ہی مکان ہے۔ اپنا ہی دالان ہے۔ (ص۹۳ سفر الحجاز جلد دوم للبرنی)

## (۳) مقربین کے بارے میں افراط تفریط

### (۱) رفعت انسانی اور شیطان

قرآن میں ہے۔ وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا (پ۱) اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو جملہ اسماء کا علم عطا فرمایا۔ اسماء میں اسماءِ الٰہیہ بھی ہیں اور اسماءِ کونیہ بھی۔ انسان اِن اسماء کا مظہر ہے۔ ظہور کے مراتب ہیں۔ مدارج ہیں۔ انبیاءؑ اور اولیاء میں ان کا ظہور بہ مراتب اعلیٰ ہے۔ اسی رفعت انسانی کا مشاہدہ کر کے ملائکہ نے حضرت آدمؑ کو سجدہ کیا۔ شیطان نے سجدے سے انکار کیا۔ جاہل کہتے ہیں کہ وہ "موحد" تھا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کو سجدہ نہیں کرنا

ہے۔ اور رسول اللہؐ صفات، افعال، آثار میں اس کے کامل ترین مظہر ہیں۔ عبد ہیں ذاتاً غیر ہیں۔ یہی فرق سمجھنے کا ہے کہ کائنات میں سب سے زیادہ مکرم و معظم اور رحمت ہونے کے باوجود وہ اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں فقیر ہیں یعنی کچھ بھی نہیں حضورؐ نے فرمایا۔ اَلْفَقْرُ فَخْرِیْ۔ آپ عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے مقابل میں کچھ بھی نہیں ہیں، یہ درست کہ یہ غیریت ہے۔ اور پھر اللہ کے فضل و عطا اور امانت سے سب کچھ ہیں، یہ بھی درست کہ یہ قرب ہے، اقربیت ہے، عینیت ہے۔ لہٰذا ذاتاً کچھ نہیں اور وجوداً اللہ کی عطا سے سب کچھ۔ یہ عبدیت ہے۔ یہی وہ ممتاز علم ہے جو دیگر ادیان کو کما حقہٗ نصیب نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے الوہیت، وجوب و غنائے ذاتی کے سوا رسول اللہؐ کو جملہ صفات کا مظہر بنایا، قرآن عطا فرمایا اور قرآن میں سب کچھ ہے۔ حتیٰ کہ فَاَوْحٰٓی اِلٰی عَبْدِہٖ مَآ اَوْحٰی سے سرفراز فرمایا جو عبد و رب کے درمیان خاص راز ہے کہ مقربین و ملائکہ کو بھی اس کا علم نہیں۔ اس کا ایما سمجھنے کو بھی حوصلہ چاہیئے۔

**(۴) نام کی توحید** فرمایا۔ میں نے حج کے موقع پر سلطان بن سعود کے شاہی جلسہ میں بیان کیا تھا۔ توحید کی کنجی رسالت ہے۔ اور اتباعِ رسالت کی روح حُب و ادب و تعظیم نبویؐ ہیں۔ اسے شرک کہیں تو حقیقی توحید کیسے ملے گی۔

**(۱) کاغذ کے پھول** ایسے لوگوں کی توحید کی مثال کاغذ کے پھولوں کی ہے کہ پھول کا دھوکا ہو۔ لیکن ڈالی پر کھلے ہوئے پھول کی بات کہاں آسکتی ہے کہ پھلتا، پھولتا اور چمن کو مہکاتا ہے۔ اُسے سونگھیں تو معطر ہو جائیں۔ اسی طرح یہ لوگ توحید اور حق پرستی کے نام سے خوشنما رنگین باتیں تو خوب کرتے ہیں لیکن اس راست گوئی کے پردے میں اُن کا منشا کچھ اور ہوتا ہے۔ یعنی مقربینِ الٰہی اور اولیاء اللہ کی تحقیر و توہین۔

یہودیوں اور عیسائیوں میں کیا فرق ہے۔ یہودی توموحد ہیں۔ حضرت موسیٰؑ کو پیغمبر مانتے ہیں۔ ان میں تھوڑے ہی ہیں جو حضرت عزیرؑ کو اللہ کا بیٹا مانتے ہیں لیکن ان کا بڑا قصور یہ ہے کہ عظمتِ انبیاءؑ کے قائل نہیں۔ انبیاء اور محبوبانِ الٰہی کی شان میں گستاخیاں کرتے ہیں اِس لیے وہ غضبِ الٰہی کے مستحق بنے۔ اس کے برخلاف عیسائی شرک تو کرتے ہیں لیکن محبوبانِ الٰہی سے محبت کرتے ہیں۔ تاہم قرآن اُن کو مومنین سے قریب کہتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے: لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوا الْیَهُوْدَ وَالَّذِیْنَ اَشْرَكُوْا وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوا الَّذِیْنَ قَالُوْۤا اِنَّا نَصٰرٰى (پ ۷) ترجمہ: تو پائے گا عداوت میں سب سے زیادہ شدید مومنین کے لیے یہود و مشرکین کو، اور سب سے نزدیک محبت میں مومنین کی ان لوگوں کو جو کہتے ہیں کہ ہم نصاریٰ ہیں۔ حضرت عیسیٰؑ نے نزولِ قرآن سے پہلے نصاریٰ کے لیے مغفرت تک کی گنجائش بتائی کہ جنابِ باری میں عرض کریں گے۔ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ (پ ۷) اور اگر تو ان کو بخش دے تو زبردست حکمت والا ہے۔ غرض یہ دونوں افراط و تفریط میں مبتلا ہیں۔

**(۴) مومنین اور صراطِ مستقیم**

اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سب سے بڑا ہے۔ اس نے اپنی تمام مخلوق میں انسان کو سب سے بلند مرتبہ اور رفعت عطا فرمائی ہے۔ اور محمد رسول اللہ صلعم کامل ترین انسان اور سارے عالم میں سب سے زیادہ مکرم و معظم ہیں۔ آپ کی رفعت و علو مرتبت کی کوئی انتہا نہیں۔ ع بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو کھلے کھلے اپنی صفات کا مظہر بنایا کہ وہ جملہ عوالم کے لیے اسمِ رحمٰن کے مظہر ہیں، یعنی رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ ہیں۔ تو مومنین کے حق میں اسماء رؤف و رحیم کے مظہر، یعنی بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ہیں۔ اسم کریم کے مظہر ہیں یعنی رسولِ کریم ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی شان اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ

ساتھی خارجیوں نے حضرت علیؓ کے خلاف خروج کیا تو حضرت علیؓ نے ان کے خلاف جہاد فرمایا۔ خارجیوں کے مقابلے کے لیے جب حضرت علیؓ نے فوج بھیجی تو حضرت جندبؓ نے خارجیوں کی نماز، روزہ، قرآن خوانی اور عبادت گزاری دیکھ کر ان سے لڑنے میں پس و پیش کیا۔ لیکن حضرت علیؓ کے ارشاد سے آپ پر خارجیوں کی گمراہی واضح ہوگئی اور آپ نے ان سے جنگ فرمائی۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا بھی بیان ہے کہ ایسے زاہد و عابد میں نے کبھی نہیں دیکھے۔ ریاضات و عبادات سے اور زیادہ جاگنے سے ان کے چہروں پر خشکی نظر آتی اور ہاتھ پاؤں شل۔

اگر یہ لوگ حضرت علیؓ کے مقابلے میں نہ آتے تو بادی النظر میں اولیاء اللہ سمجھے جاتے۔ اور ان کے مخالفین کو نہ معلوم لوگ کیا سمجھتے۔

## (۵) تعظیم شعائر اللہ تکریم مقربین

### (۱) ادب کی اہمیت

قرآن شریف میں ادب و تعظیم نبویؐ پر بے انتہا زور دیا گیا ہے۔ ارشاد ہے۔ لَا تَرْفَعُوْا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ ۔ ۔ ۔ ۔ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ (۲۶) یعنی اگر تم نبی صلعم کی آواز سے اپنی آواز بلند کرو گے تو تمھارے سارے اعمال حبط ہو جائیں گے اور تم کو خبر بھی نہ ہوگی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ محبوبانِ الٰہی کے ادب میں ذرا سی کوتاہی پر غیرتِ الٰہی کس درجے جوش میں آتی ہے۔ اور یہ کہ کتنا اعلیٰ معیارِ ادب مطلوب ہے۔ دوسری جگہ ارشاد ہے۔ وَتُعَزِّرُوْهُ وَتُوَقِّرُوْهُ (۲۶) یعنی تم اس (رسول) کی مدد کرو اور ادب رکھو۔

### (۲) اولیاء اللہ کی شانیں

اولیاء اللہ کی شان یہ بتائی گئی ہے۔ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ (۲۶) اَلَا اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۔ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ لَهُمُ الْبُشْرٰى

ان مطالب کے بیان کے سلسلے میں حضرت اکثر دو واقعات کا ذکر فرماتے تھے ان دونوں واقعات کو حضرت فضیلت جنگ انوار اللہ شاہؒ نے اپنی کتاب انوار احمدی (صفحہ ۲۸۹ تا ۳۰۴) میں تحقیق سے بیان کیا ہے اس کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

**(۲) معترضین** رسول اللہؐ کو اپنے اوپر قیاس کر کے تعریض و اعراض کرنے کی ابتدا خود عہدِ نبویؐ سے ہو چکی تھی چنانچہ ذوالخویصرہ کے بارے میں جو نجد کے قبیلۂ بنو تمیم سے تھا (جس سے عبد الوہاب نجدی صاحب کا بھی تعلق سمجھا جاتا ہے) بخاری و مسلم میں روایت ہے کہ حضرت ابو سعید خدریؓ نے فرمایا کہ ایک موقع پر ہم لوگ رسول اللہؐ کے پاس حاضر تھے۔ اور حضورؐ کچھ مال تقسیم فرما رہے تھے کہ اتنے میں ایک شخص آیا اور کہا۔ یا رسولَ اللہؐ! عدل کیجئے۔ آپ نے عدل نہیں کیا۔ حضرت نے فرمایا۔ تیرے لیے خرابی ہو۔ جب میں ہی عدل نہ کروں تو کون عدل کرے گا۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا۔ اجازت ہو تو میں اس کی گردن اڑا دوں۔ حضورؐ نے فرمایا۔ اسے چھوڑ دو۔ اس کے رُفقا ایسے لوگ ہوں گے کہ ان کی نمازوں، روزوں کے مقابلے میں تم لوگ اپنی نمازوں، روزوں کو حقیر سمجھو گے۔ وہ قرآن پڑھیں گے لیکن اُن کے حلق سے نیچے نہیں اُترے گا۔ وہ دین سے ایسے نکل جائیں گے جیسے تیر شکار سے صاف گزر جاتا ہے۔ یہ ہمیشہ خروج کرتے رہیں گے۔

**(۳) خارجی** اس کی ابتدا خارجیوں سے ہوئی۔ جب حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے مابین عہد نامہ صلح لکھا جانے لگا تو عروہ بن اویہ تمیمی نے حضرت علیؓ سے کہا کہ اللہ کے معاملے میں آپ انسانوں کو حَکَم بناتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی حَکَم نہیں بن سکتا۔ اس پر حضرت علیؓ نے ارشاد فرمایا کہ بات تو سچی ہے لیکن اس کا مقصود باطل ہے۔ اس اختلاف پر جب عروہ اور اُس کے

بر زمینے کہ نشانِ کفِ پائے تو بود — سالہا سجدۂ صاحب نظراں خواہد بود

حجر اسود بھی ایک متبرک پتھر ہے۔ اس سے بڑھ کر اور کیا تبرک ہو گی کہ خود حضور انور صلعم اسے بوسہ دیتے تھے۔ لیکن اسلام نے تبرک اور تعبد میں زمین اور آسمان کا فرق رکھا ہے۔ دیگر مذاہب میں یہ دونوں اعتبار مخلوط ہو گئے اور گمراہی پھیلی۔ چنانچہ اس فرق کو مشتہر کرنے کی غرض سے ایک مرتبہ حجاج کے روبرو حضرت عمر فاروق اعظمؓ نے حجرِ اسود کو مخاطب کر کے فرمایا (بخاری شریف) "بے شک میں جانتا ہوں کہ تو ایک پتھر ہے۔ نہ کسی کو ضرر پہنچا سکتا ہے اور نہ کسی کو فائدہ پہنچا سکتا ہے۔ اگر میں نے رسول اللہؐ کو تجھے بوسہ دیتے نہ دیکھا ہوتا تو میں تجھے کبھی بوسہ نہ دیتا۔" سبحان اللہ کیا توحید ہے۔ کیا اتباع ہے۔ کیا تعبد ہے کیا تبرک ہے۔ اس فرق کو نہ سمجھنے کی وجہ سے آثار پرستی کا گمان ہوتا ہے ایمان متزلزل رہتا ہے۔ بردِ قلبی حاصل نہیں ہوتا۔ عبادات محض رسم بن کر رہ جاتی ہیں۔ روح نہیں آتی۔ چنانچہ صراط الحمید للبرنی حصہ اول صفحہ ۲۲۵ پر اس کا خلاصہ ملاحظہ ہو۔

**(۴) خلاصہ** اس سے واضح ہوتا ہے کہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ اصل دین ہے۔ انبیاء اولیاء دین کے معلم ہیں۔ اور گو وہ بذاتِ خود سراسر مخلوق ہیں۔ عبد ہیں۔ لیکن اللہ کے نزدیک بے حد مقرب ہیں۔ مقبول ہیں۔ ان کی دعائیں مقبول ہیں۔ ان کے کام مقبول ہیں۔ ان کے آثار مقبول ہیں۔ ان کی اتباع مقبول ہے۔ ان کی تعظیم و توقیر واجب ہے۔ ان کا احترام لازم ہے۔ اور چونکہ سب کچھ مرضی الٰہی کے مطابق اور سراسر تحتِ امر ہے۔ توحید کے تابع ہے۔ شرک سے پاک ہے۔ اللہ تعالیٰ علمِ قرآنی عطا فرمائے جو افراط و تفریط سے پاک ہے۔ صراطِ مستقیم کا رہنما ہے کہ وہی طریقِ اسلام ہے۔

فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَۃِ ۔ لَا تَبْدِیْلَ لِکَلِمٰتِ اللّٰہِ ۔ ذٰلِکَ ھُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ (۱۱/۱۲) یعنی اللہ کے پاس تم میں سب سے زیادہ مکرم وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔ اولیاء اللہ کو خوف و حزن نہیں ہوتا۔ ایمان و تقویٰ اُن کا شعار ہوتا ہے اُن کے لیے دُنیا اور آخرت میں بشارتیں ہوتی ہیں۔ یہی سب سے عظیم کامیابی ہے۔

لیکن افسوس ہے کہ اولیاء اللہ کو لوگ اس حقیقی معیارِ قرآنی کے بجائے اپنے مقرر کردہ خیالی معیار سے جانچتے ہیں۔ اور صرف کشف و کرامات بلکہ استدراج والوں کو جاہل لوگ اولیاء اللہ مانتے ہیں۔ جو کمالات دکھاتے ہیں یا دل کی بات بتاتے ہیں۔ چنانچہ ان کے پاس جا کر دولت، صحت اور اولاد کے لیے دُعائیں کراتے ہیں۔ لیکن اولیاء اللہ کی شان کچھ اور ہی ہے۔ اس کا تعلق اللہ تعالیٰ کے قرب سے ہے۔ اولیاء اللہ کی مرتبت و عظمت کہ یہ کتنے بڑے شعائرُ اللہ ہیں، حسبِ ذیل قرآنی مثالوں سے واضح ہوگی۔ قرآن نے صفا، مروہ مقامات اور قربانی کے جانوروں تک کو شعائرُ اللہ قرار دیا۔ یوں تو سب خدا کی مخلوق برابر ہے۔ لیکن وہ بھی کیا نسبت ہوگی کہ اوقات، مقامات و حیوانات کو شعائرُ اللہ بنا دے۔ وَمَنْ یُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰہِ فَاِنَّھَا مِنْ تَقْوَی الْقُلُوْبِ (۲۲/۱۱) شعائرُ اللہ کی تعظیم کرنے سے تطہیرِ قلب جیسی نعمت حاصل ہوتی ہے۔ راز صرف اس قدر ہے کہ وہاں کوئی خاص نسبتِ الٰہی ثابت ہے۔ ورنہ وہ شی بہ ذاتِ خود مخلوقِ محض ہے۔ بے حقیقت ہے۔ نسبت کا راز بہت دقیق ہے۔ اللہ سمجھائے تاکہ حفظِ مراتب کی فہم و تمیز حاصل ہو۔ ورنہ ایک طرف انکار ہے تو دوسری طرف بھی تبرک تیار ہے۔

(۳) مقامِ ابراہیمؑ، حجرِ اسود | کعبہ شریف میں مقامِ ابراہیم ایک پتھر ہے جس پر حضرت ابراہیمؑ کا نقشِ قدم بھی نمایاں ہے۔

وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰھِیْمَ مُصَلًّی (۱/۱۲) یعنی بناؤ تم مقامِ ابراہیم کو جائے نماز۔

سجدے کراتے ہیں۔ جس کا قدرتی نتیجہ تفریط ہوتا ہے۔ جس وقت عبدالوہاب نجدی صاحب نے تحریکِ وہابیت شروع کی ہے، مکہ، مدینہ میں بعض مشائخ اپنے کو سجدے کراتے تھے۔ اور عورتیں غیر مسلموں کا ناچ ناچتی تھیں۔ جس کے ردِّ عمل میں یہ تحریک شروع ہوئی۔ آج کل ان پیروں کا شور و غوغا ان معترضین کے خلاف، محض اپنے مفاداتِ حاصلہ کے تحفظ کے لیے ہے۔ ورنہ اگر ان کو کھانے کو ملتا رہے تو غالباً یہ دین کی تباہی کی فکر نہ کریں۔

میرا مطالعہ اور مشاہدہ ہے کہ معترضین اسباب میں سب سے زیادہ مبتلا رہتے ہیں۔ ان کو اولیاء اللہ سے استعانت میں شرک نظر آتا ہے۔ لیکن وہ خود رات دن عہدہ داروں، دُنیا داروں سے استعانت کرتے رہتے ہیں، تو انھیں اس میں شرک نظر نہیں آتا۔ حالانکہ علم و عمل کے ہر مقام پر علمِ توحید کو کارفرما ہونا چاہیے۔ جب اُنھیں انبیاء و اولیاء میں رفعت و عظمت کے بجائے ذلت، پستی اور بے بسی نظر آتی ہے، تو کیوں وہ اِسی ذلت و بے بسی کو ان عہدہ داروں میں نہیں دیکھتے۔ یہاں اقتضائے بشری کی آڑ کیوں لیتے ہیں۔ ان کے اِس استدلال و عمل سے یہ لازم آتا ہے کہ جب اس علم سے عہدہ داروں سے استعانت کی جا سکتی ہے تو ان کی عبادت بھی کی جا سکتی ہے۔ یہ پیچیدگی یوں واقع ہوتی ہے کہ وہ تعبّد و تعظیم میں فرق نہیں جانتے۔ اِیَّاكَ نَسْتَعِيْنُ کا مطلب نہیں سمجھتے کہ کس طرح منشائے الٰہی کے تحت سارے عالم سے استعانت و استفاضہ کرنے کے باوجود شرک واقع نہیں ہوتا۔ اور توحید حاصل رہتی ہے۔ اور اِیَّاكَ نَسْتَعِيْنُ میں فرق نہیں آتا۔

**(۸) سجدے کے احکام** بعض لوگ کسی مسلمان کو کسی بزرگ کے مزار کا سجدہ کرتے یا قدم بوسی کرتے دیکھتے ہیں تو اس عمل پر کفر کا حکم لگا دیتے ہیں۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ یہ بہت نازک بحث ہے۔ قرآن مجید سے

**(۶) جمع طاعتیں** قرآن کے لحاظ سے عبدیت میں اتنی رفعت و قوت ہے کہ بیمار کو اچھا کرتا ہے اور مُردہ کو زندہ کر دیتا ہے۔ اسی لیے حضرت غوث اعظمؒ فرماتے ہیں۔ میں محی الدین ہوں عبد القادر ہوں۔ اللہ کے سب مُلک میرے حکم کے تابع ہیں۔ بلاد اللہ تلکی تحت حکمی۔ راز یہ ہے کہ اپنی رضا کو مرضی الٰہی کے تابع کرنے کے بعد ہر چیز بندہ کو عطا ہوتی ہے۔ حکومت کا یہ حال ہوتا ہے کہ قرآن میں اپنے حبیبؐ کے متعلق ارشاد ہے۔ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ (۵۹) مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (۸۰) یعنی اللہ رسول کی اطاعت کرو۔ جس نے رسول کی اطاعت کی، تحقیق اس نے اللہ کی اطاعت کی۔

مذکورۂ بالا اسماء اور مندرجۂ بالا اطاعتوں میں توحید صفات اور جمع طاعتیں کو ظاہر کیا گیا ہے۔ لیکن بعض کج فہموں کو اس صریح قرآنی توحید میں شرک نظر آتا ہے۔ ایسے ہی لوگوں کے متعلق تنبیہ ہے: اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ . . . . . اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا (۱۵۰) اللہ تعالیٰ اطاعتِ رسولؐ کی توفیق عطا فرمائے جو عین توحید ہے۔

**(۷) غلو کا ردِ عمل** آج کل نوجوانوں میں وہابیت کا فتنہ پھیل رہا ہے جس کی ذمہ داری بڑی حد تک ایسے مرشدین پر ہے جن کے افراط کا یہ ردِ عمل ہے۔ ان میں سے بعض نرے جاہل، خود بین، خود پسند، خود ستا، تنگ نظر، تنگ دل، بلکہ مغالطہ پسند ہوتے ہیں۔ ان کے پاس مُرید سازی، مُرید بازی کی تحدیدات ہیں۔ تمتع، تحرز، شہرت طلبی، بزرگی کا لزوم ہیں۔ مُریدوں کو ان کی صحبت سے فائدہ ہوتا تو کجا، اُلٹا یہی مُریدوں کی صحبت سے تمتع حاصل کرتے ہیں۔ توحید کی اصل پرکھ معاملات میں ہے کہ بندہ غیر اللہ کے خوف کے بغیر، اللہ کے بھروسہ معاملات میں قوت دکھائے لیکن ان کے معاملات بہت تکلیف دہ ہوتے ہیں۔ یہ تمتع کرتے ہیں۔

لیکن اس حکم کا بھی صرف یہ اثر ہوگا کہ اگر کوئی کسی کو سجدۂ تعظیمی کرے تو وہ ایک فعل حرام کا مرتکب قرار دیا جائے گا یعنی فسق کا۔ نہ کہ شرک و کفر کا۔ شرک کا تعلق تو عقیدہ سے ہے کہ اگر کوئی کسی غیر اللہ کو الٰہ و معبود جانے، مانے تو وہ مشرک ہوگا۔ خواہ اس غیر اللہ کو سجدہ کرے یا نہ کرے۔ لیکن اگر اس کا علم شرک کا نہ ہو اور محض تحیۃ و تعظیم کی نیت سے سجدہ کرے تو اس پر کسی طرح شرک کا حکم نہیں لگایا جا سکتا۔ احکام میں جس عمل کو حرام کہا گیا ہے اُسے حرام کہا جانا ہے۔ اُسے شرک کہنا اپنی ذہنی اختراع ہے۔ بدعت ہے اور زیادتی ہے۔ اور احکام و منشائے قرآنی کے خلاف ہے۔

## (۹) ولایت و رسالت کا فہم

عبدیت ہنسی کھیل نہیں۔ بہت نازک مقام ہے معترضین عبد کی بے بسی پر حکم لگاتے ہیں۔ اس کی قدرت و اختیار کے رُخ کو نہیں دیکھتے جو اللہ نے عطا کیا ہے۔ اولیاء اللہ پر کن حکمتوں کے تحت کیا مصیبتیں گزرتی ہیں، اس کا ان لوگوں کو علم نہیں۔ ان پر بے ادبی کی ایسی مار ہے کہ اولیاء اللہ کو کیا سمجھیں گے جبکہ وہ رسول اللہؐ کو نہیں سمجھ سکتے۔ یاد رکھو جب تک رسول اللہؐ سمجھ میں نہ آئیں، اللہ سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ اللہ کو سوائے رسول اللہؐ کے کسی نے نہیں سمجھا۔ جب ہم رسول اللہؐ کو سمجھیں گے تو اُن سے ہم کو اللہ کی سمجھ عطا ہوگی جو قدرتی راستہ ہے۔ رسالت کی یافت اولیاء اللہ کو حاصل ہوتی ہے علیٰ قدر مراتب۔ اکثر لوگ اتباع کا دعویٰ کرتے ہیں اور رسول اللہؐ سے کد رکھتے ہیں۔ حضورؐ کے مراتب سے محض اس لیے انکار کرتے ہیں کہ کہیں اُن کی توحید میں فرق نہ آ جائے۔ حالانکہ رسالت کے صحیح ربط کے بغیر انھیں توحید نصیب ہو ہی نہیں سکتی۔ اس لیے توفیق کے بعد وہ ہم سے کہتے ہیں کہ قرآن سے نازک اعتبارات سمجھاؤ۔ ہم اُن خاص نعمتوں

معلوم ہوتا ہے کہ پہلی اُمتوں میں بزرگوں کو سجدہ جائز تھا۔ اور یہ عمل حضرت آدمؑ سے حضرت عیسیٰؑ کے زمانے تک جائز رہا۔ چنانچہ ارشاد ہے۔ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا (اعراف) ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدمؑ کو سجدہ کرو پس انھوں نے سجدہ کیا۔ سورہ یوسف میں ارشاد ہے۔ وَرَفَعَ اَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ وَخَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا۔ یعنی حضرت یوسفؑ نے اپنے والدین کو اُٹھا کر تخت پر بٹھایا اور وہ سب حضرت یوسفؑ کے آگے سجدے میں گرے۔ ظاہر ہے کہ جب خود اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو جس عمل کا حکم دیا ہو اور ایک نبی اور اس کی اولاد نے جو عمل کیا ہو، وہ عمل ہرگز شرک نہیں ہو سکتا۔

اب رہا اُمتِ محمدیہ میں سجدہ کا حکم۔ تو اس بارے میں حدیث ہے حضورؐ نے فرمایا۔ اگر میں کسی کو یہ حکم دیتا کہ کسی دوسرے کو سجدہ کرے تو عورت کو حکم دیتا کہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے کہ شوہر کا اس پر بہت بڑا حق ہے۔ تفسیر ابن کثیر میں سورہ یوسف کے بیان میں ایک حدیث منقول ہے۔ حضرت سلمانؓ مدینے کے ایک راستے میں حضورؐ سے ملے۔ انھیں اسلام لائے تھوڑا ہی زمانہ گزرا تھا۔ انھوں نے حضورؐ کو سجدہ کیا۔ حضورؐ نے فرمایا۔ اے سلمان۔ مجھے سجدہ مت کرو۔ اور اُس ذاتِ حی (اللہ) کو سجدہ کرو جسے موت نہیں۔

لیکن بعض اکابر کا مسلک یہ ہے کہ جن احادیث سے غیر اللہ کو سجدہ کرنے کی حرمت کا استدلال کیا جاتا ہے اُن کی نوعیت خبرِ احاد کی ہے جو موجب ظن ہے۔ اور قرآنِ مجید میں مقربین کو سجدہ تکریم و تعظیم کا بیان استحباب کے ساتھ آیا ہے جو موجب یقین ہے۔ اس لیے ان اخبارِ احاد کی بنا پر غیر اللہ کو سجدہ تعظیمی کی حرمت پر استدلال کرنا درست نہیں۔ ان کے نزدیک جائز ہے۔

بہرحال اُمت کے سوادِ اعظم کا مسلک یہ ہے کہ غیر اللہ کو سجدہ حرام ہے۔

پڑجاتے ہیں اور اپنے کو خدا کہنا شروع کرتے ہیں ھُوَ الْبَاطِنُ کے ساتھ ھُوَ الظَّاھِرُ
کا لحاظ بہت ضروری ہے جس میں رحمٰن کا حق ادا کرنا پڑتا ہے۔ اللہ ہے، محمدؐ ہے
قرآن ہے۔ انھیں کے ماننے، نہ ماننے سے سارے فریق (مقرب، مومن یا کافر،
مشرک، منافق مرتد) بن رہے ہیں۔ اسی رحمانیت کو نہ سمجھ کر اچھے اچھے چکر کھاتے
ہیں۔ اور کفر، الحاد، شرک میں گر کر کہتے ہیں کہ دیکھ لیا۔ کچھ نہیں ہے۔ حالانکہ اسمِ اعظم
کے حصول اور مقامِ کُن پر فائز رہنے کے باوجود بڑے بڑے غوث، اقطاب دھکے
کھاتے پھرتے ہیں۔ وہ حکمت کے تحت مصیبتیں جھیلتے ہیں۔ اس راز سے صرف عارفین
واقف رہتے ہیں جو اجتبیٰ کے مقام پر فائز رہتے ہیں۔

ایک بادشاہ کا ذکر ہے کہ اس کا جلوس گزر رہا تھا۔ ایک شاہ صاحب تماشائیوں
میں کھڑے دھکے کھا رہے تھے۔ بادشاہ نے ان شاہ صاحب کو چھیڑ چھاڑ کے لیے بلوایا۔
کوتوال فوراً آیا اور اعزاز کے ساتھ انھیں لے گیا۔ بادشاہ نے اجتبیٰ کے متعلق سوال
کیا کہ محنت و مجاہدہ کے بغیر ولایت کے اعلیٰ مقامات کیسے حاصل ہو سکتے ہیں۔ شاہ
صاحب نے جواب میں کہا۔ کیا اب بھی آپ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ ان سب وزیروں
عہدہ داروں کو آپ کے پاس کسب و محنت سے باریابی حاصل ہے۔ یہ سب انابت
کے مقام پر ہیں۔ اور میں یہاں کوشش کے بغیر شاہی دعوت پر اجتبیٰ کے تحت دربار
قرب میں بلایا گیا ہوں۔ اب بادشاہ بھی نہیں پوچھ سکتا کہ میں کیوں یہاں آیا۔ وَاللّٰہُ
یَجْتَبِیْٓ اِلَیْہِ مَنْ یَّشَاۤءُ وَیَھْدِیْٓ اِلَیْہِ مَنْ یُّنِیْبُ (۲۵/۱۳) یعنی اللہ جسے چاہے
رحمت سے کھینچ کر اپنے پاس بلاتا ہے۔ اور جو کوشش کر کے رجوع ہوتا ہے جھکتا ہے
تو اس کو اپنی طرف ہدایت نصیب کرتا ہے۔ اس جواب پر بادشاہ پھڑک گیا۔

**(۱۱) اُجرت والے۔ انعام والے**

دو قسم کے لوگ ہیں۔ ایک اُجرت والے۔
دوسرے انعام والے۔ انابت کی راہ اُجرت

کو جو مقربین کے لیے مختص ہیں کیسے سمجھائیں۔ یہ بے ادبی کی وجہ سے اہل نہیں اور نہ ان کا شرحِ صدر ہو سکتا ہے۔ اگر وہ تسلیم نہ کریں تو نعمت کی ناقدری کی وجہ سے ان پر مار پڑے گی اور ہم پر ذمہ داری آئے گی۔ لہٰذا اس بات کے کہنے میں بخل نہیں بلکہ حکمت ہے۔

## ۲۰۔ طریقِ اجتبیٰ و انابت

اللہ کی طرف پہنچنے کے دو طریق ہیں۔ ایک اجتبیٰ دوسرا انابت۔ پہلے میں اُدھر سے کشش ہے دوسرے میں اِدھر سے دوا دوش ہے۔ اجتبیٰ والوں کا کیا کہنا کہ طلبیدہ جاتے ہیں۔ البتہ انابت والوں کو زیادہ مجاہدہ درکار ہے۔ قرآن نے مجاہدے میں ایمان و تقویٰ کے ساتھ وسیلہ بڑی چیز ہے۔ جو اللہ کے واسطے مجاہدہ کرتا ہے اسے اللہ کا راستہ ملتا ہے۔

علم ولایت کے حصول کا ذریعہ محبت ہے۔ محبتِ الٰہی دو طریق سے حاصل ہوتی ہے۔ ایک اجتبیٰ سے یعنی اللہ کی طرف سے بلا واسطہ محبت و کشش کے ذریعے یا شیخ کامل مکمل کی تاثیرِ نفس کے واسطے سے حاصل ہوتی ہے۔ دوسرا طریق انابت ہے جسے سلوک کہتے ہیں۔ صحبتِ شیخ قوی طریقِ دخول الی اللہ ہے۔ بقول حضرت مجدد رح انابت راہِ مریداں ہے اور اجتبیٰ راہِ مراداں ہے۔ ریاضات و مجاہدات انابت کے لیے شرط ہیں۔ لیکن اجتبیٰ کے لیے مجاہدات کی شرط نہیں، البتہ مفید ہیں (مکتوب ۸۶)۔

علمی سلوک انیت (میں پن) کو دور کرتا ہے اور اپنی حقیقت کھل جاتی ہے کہ ہم تعیّن کے سوا کچھ نہیں۔ ہم وجود و انا سے عاری ہیں۔ البتہ دو انگل کی لنگوٹی سے لے کر ہزاروں لباس اُس کی عطا ہے و بس۔ لاکھ ھُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاھِرُ وَالْبَاطِنُ صحیح۔ لیکن اپنی حقیقت تعیّن ہے اور ہماری ذات معلوم ہے۔ لہٰذا وَھُوَ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ کو کبھی نہ بھولیں۔ ورنہ لوگ زندقہ و الحاد میں

جہاں عملی معصیت ہو اور سخت تعزیری احکام موجود ہوں وہاں انبیاء و اولیا کا واسطہ دے کر تائید کے لیے دُعا کرنا سخت بے ادبی ہے۔ یاد رکھنے کی بات ہے اگر ہم نے گناہ کے عملی ہونے کے بارے میں اپنی لاعلمی کی بنا پر واسطہ دیا تھا تو معذرت کرنا چاہیئے۔ اس قسم کا واسطہ دینا ایسا ہے جیسے کوئی بیت الخلاء میں نماز پڑھے۔ خصوصاً حضور انورؐ اور اہلِ بیت کے معاملے میں بہت احتیاط و ادب لازم ہے۔ البتہ عام طور پر گناہوں کی معافی کے لیے یا مظلومیت کی حالت میں واسطہ پیش کرنا جائز ہے۔ اسی لیے قرآن نے وسیلہ، واسطہ چاہنے والوں کے لیے اوّلین شرط ایمانا و تقویٰ رکھی ہے۔ نہ کہ عملی معاصی پر وسیلہ سے تائید حاصل کی جائے۔ حکم ہے یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَابْتَغُوْا اِلَیْہِ الْوَسِیْلَۃَ (پ۶) واسطہ کو کھیل تماشا نہ بنائیں۔ بڑی ذمہ داری کی چیز ہے۔ البتہ عملی معاصی میں ابتلا پیش آجائے تو صرف استغفار کرتے رہیں تو بہتر ہے۔

**(۱۴) ادبِ رسولؐ** بعض لوگ پیارے محمدؐ کہتے ہیں جو نامناسب ہے۔ ہمارے پاس ادب محبت پر مقدم ہے۔ اولیاء اللہ کا متفقہ فیصلہ ہے۔ ع با خدا دیوانہ باش و با محمدؐ ہوشیار حضورؐ کے سامنے مارے خوف کے بڑے بڑے غوث اقطاب کے پتے پانی ہوتے ہیں۔ کبھی کبھار محبت کے غلو میں کہہ جانا اور بات ہے۔ نہ یہ کہ ہمیشہ کہتے رہیں۔

**(۱۵) نواب احمد نواز جنگ کا ربط رسالت** نواب احمد نواز جنگ کی فاتحہ سوم کے دن ڈاکٹر مقبول علی صاحب سے فرمایا علاؤ الدین صاحب کے عام اخلاق بہت خوب تھے۔ اسماعیلیہ فرقے کے وہ برائے نام رکن تھے اُن کے عقائد سنیوں جیسے تھے۔ ہمارے ساتھ نماز پڑھتے، ملتے ملاتے۔ بڑی چیز یہ کہ ان کا ربط رسول اللہؐ کے ساتھ اچھا تھا۔ اصل چیز قلب ہے محض رگ پٹھے اچھے

کی ہے۔ اور اجتبیٰ کی راہ انعام کی ہے۔ اکثر لوگ کھاتہ کھولتے ہیں۔ یہ بھی ٹھیک ہے لیکن محدود معاوضہ ہوتا ہے۔ ہر عمل کا بدلہ ہوتا ہے۔ لیکن ایک شخص سب کچھ کرکے لادعویٰ رہتا ہے۔ کہتا ہے۔ مجھ سے جو بن سکا کیا۔ لیکن سرکار سے جو ملتا ہے مالک کا احسان ہے۔ اس کے بعد کریم اُسے بے حساب دیگا۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ بعض سونے والے کھانے والے رات کے عبادت گزاروں، دن کے روزہ داروں سے بہتر ہوں گے۔

یہی حال علم کے میدان میں بھی ہے۔ بعض لوگ علم کی پوٹلیاں بنا کر انہیں دین پن ادکھاتے ہیں۔ حالانکہ قرآن تک کے متعلق ارشاد ہے۔ وحی کی حفاظت میں عجلت نہ کرو۔ ہم وقت پر تازہ علم و بیان دیں گے۔ وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْآنِ (۲۰) إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ (٧٥) وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ (١٥) دراصل اپنے مقام جہل کا ادراک رکھنا اور علیم کی طرف متوجہ رہنا علم کی گٹھڑیوں پر غرہ سے بہتر ہے۔ یہ نکتہ سمجھ میں آئے تو علم کے دریا بہیں گے۔ اگرچہ بظاہر اس کے پاس کچھ نہ ہوگا لیکن وہ پر مِنَ اللہ علوم کے خزانے کھلیں گے جس پر سب حیران ہوں گے۔

(۱۲) شَفَاعَت | قرآن میں کئی جگہ شفاعت بِالْاِذْن کا ذکر ہے لیکن معترضین شفاعت کو نہیں ملتے۔ آخر ان الفاظ کا مرجع (ماذون) تو ہوگا۔ اگر کوئی ہوگا تو بدرجہ اولیٰ انبیاء، اولیاء ہوں گے کہ دوست اور معزز کی شفاعت ہی مقبول ہوتی ہے۔ اور خاتم النبیین صلعم کو تو شفیع اعظم ہونا چاہیے۔ نص اور قرینہ یہی کہتے ہیں۔

(۱۳) وسیلہ کا ادب | دین میں ایمان اور وسیلہ سب سے زیادہ اہم ہیں۔ ایمان کی مثال شہ رگ کی اور وسیلہ کی مثال قلب کی ہے۔ اگر قلب میں قوت ہو یعنی وسیلہ و ربط قوی ہو تو ڈاکٹر آپریشن کر سکتا ہے۔ صحت و قوت کی امید ہو سکتی ہے۔ ورنہ نہیں۔ ان دونوں کو سنبھالنا ضروری ہے۔

کا مخالف ہے۔ بلکہ اس کا امتیازی معیار قلبی و رُوحانی ترقی ہے۔ اور صحابہ کی ایمانی زندگی اس کا آئینہ تھی۔

جلسۂ میلاد النبیؐ ۱۳۴۸ھ منعقدہ حیدر آباد میں فرمایا۔

**(۱۷) حُبِّ نبویؐ**

**(۱) محبت کے مراتب** اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر ایک نہایت قیمتی فطری جذبہ رکھا ہے جس کا نام محبت ہے۔ اس کا خاصہ یہ ہے کہ جس سے متعلق ہو جائے بس اُسی کی دُھن بندھ جاتی ہے۔ اس کے سوا کچھ نہیں سوجھتا اسی کے تصور، تذکرہ اور تلاش میں انسان لگا رہتا ہے۔ اس کا تعلق ادنیٰ چیزوں (زن، زر، زمین وغیرہ) سے وابستہ ہو تو ادنیٰ محبت سمجھی جاتی ہے۔ اگر اس کا رخ اعلیٰ (اللہ، رسول اللہ، اولیاء اللہ) کی طرف ہو تو اعلیٰ محبت شمار ہوتی ہے مختصر یہ کہ جتنا محبوب اعلیٰ ہو اتنی محبت عالی اور اُسی نسبت سے مُحب اعلیٰ سمجھا جاتا ہے۔

**(۲) محبت کے محل** جب محبت فطری ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کا بہترین محل استعمال کیا ہو کس سے محبت کی جائے اور کیوں کی جائے۔ اگر ہم انسانی فطرت و نفسیات پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ انسان تین چیزوں سے محبت کرنے پر فطرتاً مجبور ہے۔

(۱) حُسن و جمال (۲) فضل و کمال (۳) بذل و نوال۔ اگر کسی حسین محبوب کا سامنا ہو جائے تو نظریں بے اختیار اُس کی طرف اُٹھنے لگتی ہیں۔ اگر معلوم ہو کہ ایک بہت بڑا صاحبِ فضل و کمال آیا ہے تو لوگ نہ صرف اس کے کمالات بلکہ خود اس کو دیکھنے کے لیے ہجوم کرتے ہیں، چاہے وہ کالا بیلا ہی کیوں نہ ہو۔ اسی طرح اگر کوئی ہم کو یا ہمارے بچوں کو ڈوبنے سے بچالے تو ہم اُس محسن کے گرویدہ ہو جائیں گے اور اِس احسان پر دل و جان سے فدا ہو جائیں گے۔

ہوں تو آدمی کام کا نہیں، جب تک اس کا قلب اچھا نہ ہو۔ رسالت اور مدینے کے ساتھ ربط اچھا ہو۔ اور یہ بات علاؤالدین صاحب میں تھی۔ مرد ہونا شرط ہے۔ بعد کو توازن نہ بھی ہو تو کام چلتا ہے۔ ربطِ رسالت مردانگی ہے۔ رہا گناہ، اس کے لیے توبہ ہے۔ وہ تو ابتدا ہی سے ہے۔ حضرت آدمؑ سے لغزش ہوئی۔ توبہ کی۔ گناہ بھی کیا رحمت۔ ثابت ہوا کہ مرحوم و مغفور ہوئے۔ انھیں کی اولاد میں حضور رَحْمَۃٌ لِّلْعٰلَمِیْنَ کا ظہور ہوا۔ انسان کی عظمت اسی میں ہے جس کو ملائکہ تک نہ سمجھ سکے یہ مظہرِ جلال و جمال ہے۔ اِدھر شیطان گھبراتا ہے۔ اُدھر فرشتے سجدہ کرتے ہیں۔ اللہ نے اسے علمِ اسما دیا اور ظلوم و جہول کہہ کر شاباشی دی۔ ملائکہ پر سجدہ واجب ہوا۔ اس پر ڈاکٹر صاحب نے کہا۔ سُبْحَانِیْ مَا اَعْظَمَ شَاْنِیْ بھی تو ہے۔ فرمایا۔ سبحانی کہنا کمال نہیں۔ کمال تو عبدیت کے اظہار میں ہے کہ سُبْحَانَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ (پ ۱۵) قرآن ہے۔

**(۱۶) مسلمانوں کی مشکلات کا حل** مسلمانوں کے موجودہ مشکلات کے حل کے متعلق عام غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے کہ گویا سائنٹفک تعلیم، فراوانی دولت و ثروت، اور کثرتِ تعداد کے ذریعے ہماری مشکلیں دُور ہوجائیں گی۔ لیکن قرآنی نقطۂ نظر سے دیکھیں۔ اور حضورؐ اور صحابہ کی عملی زندگی کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ کس طرح دنیوی وسائل کی کمی اور قلتِ تعداد کے باوجود، اور علوم و فنون اور تعلیمِ ظاہری کے بغیر، مسلمانوں نے دس برس کے قلیل عرصے میں علمِ صحیح اور نسبتِ رسالت و اتباعِ رسولؐ کے ذریعے قیصر و کسریٰ کے تخت اُلٹ کر دنیا میں اپنی عظمت و جلالت کا ایسا سکّہ بٹھایا کہ آج دنیا حیران ہے۔ درحقیقت اب بھی ہماری ساری مشکلات کا حل رسالت کے زندہ قوی ربط میں مضمر ہے۔ اِس کے معنی ہرگز یہ نہیں کہ اسلام دماغی علوم اور اسبابِ ظاہری

لَقَدْ رَاٰی مِنْ اٰیٰتِ رَبِّہِ الْکُبْرٰی (۲۷/۵) جس کا عروج ہے۔ فَکَانَ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی (۲۷/۵) جس کی اطاعت گزاری ہے۔ مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ (۵/۹) جس کے افعال ہیں۔ وَمَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ رَمٰی (۹/۱۹) جس کے آثار ہیں: اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰہَ یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ (۲۶/۹)۔ ان کی انگلی کا اشارہ ہو تو اِنْشَقَّ الْقَمَرُ (۲۷/۸) جس کے فیض و عطا کا یہ عالم کہ وَلَسَوْفَ یُعْطِیْکَ رَبُّکَ فَتَرْضٰی (۳۰/۱۸) جس کے صفات ہیں رَسُوْلٌ کَرِیْمٌ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ۔ اور پھر جس کی ذات ہے۔ اِنَّکَ مَیِّتٌ وَّاِنَّھُمْ مَّیِّتُوْنَ ۲۳۔ وہ تو وہ ان کے غلاموں کی یہ آن بان ہے۔ وَالَّذِیْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِہٖٓ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُتَّقُوْنَ۔ لَھُمْ مَّا یَشَآءُوْنَ عِنْدَ رَبِّھِمْ (۲۴/۱)

**(۵) حضورؐ کا بذل و نوال** اسی طرح حضورؐ کے بذل و نوال، لطف و احسان پہ غور فرمائیے۔ ایک طرف اللہ تعالیٰ اپنی رحمتِ عام کا اس طرح ذکر فرماتا ہے: وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ کُلَّ شَیْءٍ (۹/۶) دوسری طرف اپنے حبیب کی رحمتِ عام کے متعلق اعلان فرماتا ہے: وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ (۲۷/۱) غلامانِ محمدیؐ کے لیے اللہ تعالیٰ کی رحمتِ خاص کا یہ حال ہے کہ کَانَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَحِیْمًا (۲۲/۳) اور حضورِ انورؐ کا اپنے غلاموں پہ خصوصی رحمت کا عالم یہ کہ حَرِیْصٌ عَلَیْکُمْ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ (۱۱/۳)

عجیب ربط ہے۔ عجیب فرق ہے۔ عجیب عروج ہے۔ عجیب نزول ہے۔ عجیب توحید ہے۔ عجیب رسالت ہے۔ عجیب ہستی ہے۔ عجیب نیستی ہے۔ پھر لطف یہ کہ منفصل نہیں بلکہ لازم و ملزوم ہے۔ غرض بقول حضرت سعدیؒ۔

بَلَغَ الْعُلٰی بِکَمَالِہٖ ؛ کَشَفَ الدُّجٰی بِجَمَالِہٖ ؛ حَسُنَتْ جَمِیْعُ خِصَالِہٖ ؛ صَلُّوْا عَلَیْہِ وَآلِہٖ

محبت اصل ہے۔ عظمت سمجھ میں آجائے اور محبت حاصل ہو جائے تو اتباع کی طرف دل بے اختیار مائل ہو جاتا ہے۔ لارڈ بیٹرن انگلستان کا مشہور شاعر تھا اپنی شعر گوئی اور جادو بیانی کی وجہ سے مقبولِ خاص و عام تھا۔ اس کی مقبولیت کا یہ عالم کہ انگریز نوجوان آئینے لے کر اُس کی طرح چہرہ، بال اور لباس درست کرنے اور حرکات و سکنات میں اس کی اتباع کی کوشش کرتے۔

## (۳) حضورؐ کا حسن و جمال

اس نقطۂ نظر سے اگر ہم غور کریں تو حسن و جمال کے متعلق قرآن کہتا ہے: اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (۱۸؍۱۱) یعنی اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ نورِ محمدی کے متعلق ارشاد ہے۔ قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ (۶؍۶) یعنی اللہ کے پاس سے نور (محمدؐ) آیا اور کتاب مبین بھی یعنی روشن بیان کرنے والی کتاب۔ چنانچہ حدیث ہے۔ اَنَا مِنْ نُوْرِ اللّٰهِ وَالْخَلْقُ كُلُّهُمْ مِنْ نُوْرِيْ (طبرانی) جب ہجرت کر کے مدینۂ منورہ تشریف لائے تو آپ کے حسن و جمال کو دیکھ کر مدینے کے بچے بچیاں بے اختیار نغمہ زن ہوئیں۔

طَلَعَ الْبَدْرُ عَلَيْنَا فَاخْتَفَتْ مِنْهُ الْبُدُوْرُ
مِثْلَ حُسْنِكَ مَا رَأَيْنَا قَطُّ يَا وَجْهَ السُّرُوْرِ

## (۴) حضورؐ کا فضل و کمال

فضل و کمال پر غور کریں تو حضورؐ کی شان میں ارشاد ہے: اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (۲۹؍۲) جس کی محبوبیت ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا (۲۲؍۴) جس کی شہرت ہے۔ وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ (۳۰؍۱۹) جس کی سیر ہے سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ ... لِنُرِيَهٗ مِنْ اٰيٰتِنَا الْكُبْرٰى (۲۷؍۱) جس کا مشاہدہ ہے۔ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى

ہمیں دیکھنا ہے کہ رات دن میں حضورؐ کا ذکرِ مبارک ہمارے دل و زبان پر کتنا رہتا ہے اگر خدانخواستہ یہ محبت نصیب نہیں ہے تو پیدا کریں اور ترقی دیں۔ اس کا قرآنی طریق یہ بتایا گیا ہے کہ صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا (۲۲/۴) پر عمل کریں۔ درود و سلام اور نعت کی مداومت کریں۔ اللہ تعالیٰ اپنے حبیبؐ کی سچی محبت، ادب و تعظیم نصیب کرے جس کا ثمرہ توحیدِ نبویؐ ہو۔ آمین بطفیل حبیب رب العالمین۔

## (۱۸) بصیرتِ محمدی

اصل چیز زاویۂ نظر کی درستی ہے۔ قرآن کا اصول عَلٰی بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي (۱۳/۵) ہے ہم کو رسول اللہؐ اور آپ کے مُتّبعین اولیاء اللہ کی بصیرت و نظر حاصل کرنی چاہیئے۔ فطری صلاحیت اور اچھی صحبت سے بصیرت پیدا ہوتی ہے اللہ کی توفیق و فضل شرط ہیں۔ انانیت اور نفسانیت سے خالی رہیں۔ ورنہ نورِ علم الٰہی حاصل نہیں ہو سکتا۔ کارک بند شیشی سمندر میں ڈالو تو اس میں ایک بوند پانی نہیں آئے گا۔ ہر ایک کی نظر حتیٰ کہ کافر کی نظر اپنے محل و اقتضا کے لحاظ سے درست ہی ہے۔ لیکن بصیرتِ محمدی کے مطابق نہیں ہے۔ ہر ایک جیسا دیکھتا ہے ویسا کہتا ہے اور وہ بھی ایک حقیقت ہے۔ مثلاً کوئی بمبئی جا جائے۔ گندی موریاں اور گندی گلیاں دیکھتا پھرے اور کہے کہ بمبئی تو بہت غلیظ شہر ہے۔ یا کسی مکان میں جائے اور صرف بیت الخلاء ہی کو دیکھے اور کہے کہ مکان میں نری غلاظت ہے۔ تو وہ اپنے نقطۂ نظر اور مشاہدہ کے لحاظ سے صحیح ہے۔ لیکن وہ تنگ نظر کہلائے گا۔ کیونکہ اس نے بمبئی کے مالا بار ہل، کھلے بنگلے، اچھے محلے نہیں دیکھے اور کسی مکان کے دیوان خانے اور چمن کو نہیں دیکھا۔ ورنہ اچھی رائے بھی قائم کر سکتا تھا۔ اسی طرح معترضین رسولوں اور اولیاء اللہ کے نزول (مثلیت) کو دیکھ کر عروج و فوقیت کا انکار کرتے ہیں۔ حالانکہ انبیاء کا نزول غوث اقطاب کے عروج سے بڑھ کر ہے۔ بعض لوگ بعض اولیاء اللہ کی قبلِ سلوک بداعمالیوں کا ذکر کر کے

اس خصوص میں درود ملاحظہ ہو اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ عَلٰی قَدْرِ حُسْنِہٖ وَجَمَالِہٖ وَفَضْلِہٖ وَکَمَالِہٖ ۔ وَبَذْلِہٖ وَنَوَالِہٖ ۔ وَفَقْرِہٖ وَسُؤَالِہٖ ۔ وَفَوْزِہٖ وَمَآلِہٖ ۔ وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارِکْ وَسَلِّمْ (للبرنی)

**(۶) اتباع کی جان، حب و ادب** اس سے ثابت ہوا کہ جذبۂ محبت کا بہترین محل اللہ تعالیٰ اور اُس کا محبوبؐ ہیں چنانچہ حکم الٰہی ہے ۔ قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ وَیَغْفِرْ لَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ وَاللّٰہُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (۳/۱۱) ترجمہ: کہہ اگر تم اللہ سے محبت کرنا چاہتے ہو تو میری اتباع کرو، اللہ تم کو محبوب بنا لے گا اور تمہارے گناہوں کو بخش دے گا۔ لیکن واضح رہے کہ اتباع کی جان محبت و تعظیم و ادبِ نبویؐ ہیں جس کے نتیجے میں خود بخود اتباع کی دولت حاصل ہوتی ہے۔ ورنہ اتباع رسمی ہے۔ صرف اتباع کی صورت ہے ۔ جس کی اتباع کا ثمرہ محبوبیتِ الٰہی اور مغفرت و رحمت ہو تو اصل متبوع کتنا محبوب ہوگا۔ انصاف شرط ہے ۔ لہٰذا حضور انورؐ ہمارے لیے بہترین نمونۂ علم و عمل ہیں ۔ ہر امر میں ہر وقت آپ متبوع ہیں (امام وقت ہیں) لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ (۲۱/۲۱) آپؐ کی ہر ہر ادا پیاری ہے۔ اور اس قدر پیاری ہے کہ کوئی اُس کی نقل اُتارتا ہے تو اس پر بھی پیار آتا ہے۔ اتباع کے تو بے شمار مدارج ہیں۔ صدیقین۔ شہدا، صالحین لیکن ادنیٰ سے ادنیٰ کو شرفِ غلامی نصیب ہو جائے تو صاف بشارت ہے قُلْ یٰعِبَادِیَ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَۃِ اللّٰہِ (۳۹/۲۴)

**(۷) محبت کی پہچان اور طریق علاج** محبتِ رسولؐ کی پہچان یہ ہے کہ مَنْ اَحَبَّ شَیْئًا اَکْثَرَ ذِکْرَہٗ ۔ عام تجربہ و مشاہدہ ہے کہ جس چیز سے محبت ہو انسان اس کا بہت ذکر کرتا رہتا ہے۔ لہٰذا

بعض لوگ بڑے لحیم، شحیم، صحت مند ہوتے ہیں۔ لیکن جوہر مردانگی سے محروم۔ عالم ظاہر کی طرح عالم باطن کا بھی یہی حال ہے۔ بعض لوگ علمیت کی چربی بہت رکھتے ہیں یعنی قرآن خوانی، عربی ادب، تفسیر وغیرہ کی تفصیلات میں مہارت رکھتے ہیں۔ لیکن قرآن کی روح اور محبت کی قوت (نسبت نبوی اور نسبت اولیا) سے محروم ہیں۔ گویا مردانگی ندارد۔ اس کے بعد حیات آفرینی کے آثار کیسے نمایاں ہوں گے۔

**(۲۰) حضرت موسیٰؑ اور حضرت خضرؑ** | بظاہر بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت خضرؑ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بڑے تھے۔ یاد رکھو۔ کوتوال شہر کی ہر تفصیل سے واقف ہوتا ہے۔ وہ اس کے فرض اور سررشتہ کے تحت ضروری ہے۔ اور وزیراعظم ایک حد تک عملاً ان تفصیلات کا علم نہیں رکھتا لیکن اس کے دائرے سے کوتوال خارج نہیں۔ حضرت خضرؑ کی ماموریت (ولایت) کی وجہ سے حضرت موسیٰؑ (صاحب شریعت رسول) کو اس محل پر سکوت ضروری تھا۔ اس سے حضرت موسیٰؑ کی عظمت میں فرق نہیں آتا۔

**(۲۱) اسباب اور اولیاء اللہ سے ربط** | اسلام نے ترک کی تعلیم نہیں دی۔ ظہور کے مرتبے میں اسباب اور اولیاء اللہ کی طرف توجہ اور طلب لازمی، ضروری ہے۔ اور منشائے الٰہی ہے۔ البتہ علم صحیح ہونا ضروری ہے چاہے اسباب کے تعلق سے ہو، چاہے اولیاء اللہ کے تعلق سے۔ یعنی اشیا بذاتہ میت ہیں، فاعل حقیقی نہیں۔ ان سے کسی قسم کی امید نہیں رکھنی چاہیے۔ یہ باطنی علم ہے۔ البتہ معمولی اشیا ہوں یا اولیاء اللہ۔ ہر ایک میں قدرا قوت و فعل من اللہ رہا ہے۔ کسی میں ایک درجہ، کسی میں کروڑ درجے۔ مدارج کا فرق ہے۔ اولیاء اللہ بڑے بڑے اسماء کے مظہر ہوتے ہیں اس لیے ان سے زیادہ استفادہ کے لیے زیادہ توجہ کی جاتی ہے۔

بدظنی پھیلاتے ہیں۔ واضح رہے کہ کیا کسی کے کبھی بیمار ہونے سے اس کی صحت و قوت کے اعمال کا انکار لازم آتا ہے۔ اس عالم میں اگر کوئی شخص تنگ اور غلط زاویہ نظر اختیار کرے گا تو دوسرے عالم میں اسی نقطۂ نظر میں ترقی اور وسعت ہوگی۔ وَمَنْ كَانَ فِیْ هٰذِهٖۤ اَعْمٰى فَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِیْلًا (۱۷:۷۲)

ہدایت و گمراہی کے بے شمار مدارج ہیں۔ یُضِلُّ بِهٖ كَثِیْرًا وَّیَهْدِیْ بِهٖ كَثِیْرًا (۲:۲۶) قرآن اور رسولؐ ہی سے ایک طرف مومنین ہدایت کے مقامات حاصل کر رہے ہیں تو دوسری طرف اسی سے بعض لوگ اللہ، رسول اللہؐ، اولیاء اللہ کے متعلق بدترین خیالات لے رہے ہیں۔ وسوسوں میں مبتلا ہو رہے ہیں۔ بقول عرفاء "ہمارے دل میں اتنے بڑے وسوسے آتے ہیں کہ شیطان کے دل میں بھی کیا آتے ہوں گے۔" سالکین کو ان وساوس سے گزرنا پڑتا ہے جس طرح ڈاکٹر پوسٹ مارٹم کرتا ہے اور غلاظتوں، بیماریوں میں بیٹھا رہتا ہے لیکن علم و اصلاح و مطالعے کی خاطر، نہ کہ بیمار بننے کے لیے۔ اسی طرح عارفین بڑے ڈاکٹر ہوتے ہیں اور گنہگاروں سے ہمدردی رکھتے ہیں۔ ان کو مختلف لوگوں کے وساوس کا علم ہوتا ہے جن کو دیکھ کر وہ بصیرتِ محمدی کے مطابق صحیح نقطۂ نظر قائم کرانے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن بعض اولیاء اللہ ان وساوس کے تابع ہو کر مرتکب ہو جاتے ہیں ایسی صورت میں اُن کے دعوئ تقدس کو توڑنا منشائے الٰہی ہوتا ہے۔

**(۱۹) ظاہر و باطن** فرمایا: کھانسی کے باوجود، آج کل سردیوں میں برف، لیموں، موسمی، دہی کھا رہا ہوں تو فائدہ ہو رہا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اشیاء کے اثر و صفت کو کیا کہیں۔ دراصل جب اشیاء کا وجود ہی مستقل نہیں، تو صفات (سردی، گرمی) کہاں مستقل ہو سکتے ہیں۔ گو عادتِ الٰہی یہی ہے۔ لیکن اللہ کے حکم و تجلی پر توکل ہونا چاہیے۔

بادل کو دیکھ کر پانی کے فیضان کا انکار ہوگا۔ اسی طرح اولیاء اللہ کی صورت سے اللہ ہی کے افعال ظاہر ہو رہے ہیں جن میں بصیرت نہ ہو وہ نہیں دیکھ سکتے جیسے ایک عامی بادل اور بارش کو دیکھ کر سمندر کے پانی کو نہیں پاتا۔ نہیں مانتا۔ لہذا کسی کو سمجھانا مشکل ہے۔ شرح صدر ہو تو بات سمجھ میں آئے۔ حیرت ہے کہ یہ لوگ اولیاء اللہ کے انکار میں کیسے پرورش پاتے ہیں حالانکہ ہم کو خیال سے ضیق ہوتی ہے۔ دراصل اچھی آب و ہوا کا باشندہ غلیظ آب و ہوا میں مر جائے گا اور غلاظت کا کیڑا اچھی آب و ہوا میں مر جائے گا۔

اللہ، رسول تو بہت بڑے ہیں۔ اولیاء اللہ بجلی کے اسٹیشن ہوتے ہیں۔ ان کی قوتوں کا ٹھکانا نہیں۔ چاہیں تو ایک آن میں عالم کو اُلٹ دیں۔ یہ قدرت اسی بندے کو نصیب ہوتی ہے جس کا ادراک ہو کہ مجھ میں انگلی ہلانے کی بھی قوت نہیں لیکن وہ ادب، اقتضا اور منشائے الٰہی کے تحت خاموش رہتے ہیں جس پر بے بسی کا دھوکا ہوتا ہے۔ وہ عبدیت دکھاتے ہیں۔ اس کے برخلاف ان سے ڈینمولے کر نچے مرتبے والے کمالات دکھلاتے ہیں۔ لوگوں کو حیران کر دیتے ہیں۔ ماموریت کے لیے بڑے دل و جگر اور قوت برداشت کی ضرورت ہے۔

دراصل اسلام میں مرکز یعنی اللہ، رسول سے راست تعلق پر زور دیا گیا ہے کہ دیگر ادیان کی طرح ذیلیات یعنی نیچے کے روابط میں اولیاء اللہ کی نسبتوں کو غلط سمجھ کر شرک و کفر میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ لیکن جب کلمۂ طیبہ کے ذریعے مرکز سے اچھا ربط قائم ہو جائے تو اولیاء اللہ کے ذریعے استفادہ مانع توحید نہیں ہوتا۔

**(۲۱) مہلت میں حکمت** بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ مسلمانوں کا اتنا قتل و خون ہو رہا ہے لیکن اتنے بڑے اولیاء اللہ نہیں کرتے۔ یہ چیزیں بہت نازک ہیں۔ عوام سمجھ نہیں سکتے کہ ان میں کیا حکمتیں

**(۲۲۱) صاحبِ خدمت اولیاءاللہ**

قطب، غوث اسی کو کہتے ہیں جس پر ربوبیت کے اسرار کھل جاتے ہیں اور وہ ربوبیت کی تفصیلات سے متحقق ہوتا جاتا ہے۔

بعض اہل اللہ مامور اور صاحبِ خدمات ہوتے ہیں۔ وہ آئندہ ہونے والے اسرار بیان فرماتے ہیں۔ دراصل باطن ظاہر کو متاثر کرتا ہے۔ اہل اللہ اہلِ باطن ہیں۔ جو کچھ اس عالم میں گزر رہا ہے قلبِ مومن پر پہلے گزرنا لازم ہے حیدرآباد کی حد تک حضرت یوسف صاحب شریف صاحبؒ قطب ہیں۔ سب احکام یہاں سے جاری ہوتے ہیں چنانچہ میرے ایک دوست حضرت کے خادم محمد علی شاہ صاحب مرحوم، حضرت کے ایما سے آئندہ ہونے والے مختلف واقعات اور اسرار مجھ سے بیان کر دیتے تھے۔ اسی طرح علی گڑھ میں میرے ایک مہربان بزرگ حضرت عبداللہ شاہ خانؒ زبردست کشفِ کونی رکھتے تھے۔ اہلِ خدمت صاحبِ حکومت تھے۔ کشفِ قبور کشفِ اجنہ زبردست تھا۔ پہلی جنگِ جرمنی کے حالات نقشہ لے کر قبل از قبل بتاتے جو کچھ عرصہ بعد اخباروں میں آتے۔

اولیاء اللہ کے پاس دو چیزیں ہوتی ہیں۔ ایک اکھاڑہ۔ دوسرا شفاخانہ خواص کو اکھاڑہ میں جہاد کے لیے تیار کیا جاتا ہے عوام کا علاج کر کے گھر روانہ کیا جاتا ہے۔ اولیاء اللہ سے دعائیں کرانا عقیدت کی جان ہے۔

**(۲۲۳) اولیاءاللہ کا فیضان**

توحیدِ افعالی کا تعلق چونکہ عمل سے ہے اس لیے ہر کوئی یہاں گرتا ہے، مار کھاتا ہے۔ البتہ صفات و ذات دل خوش کن ہیں جہاں میٹھی باتیں چلتی ہیں۔ اولیاء اللہ کے فیضان کی مثالیں بالکل ایسی ہیں جیسے بارش کا سمندر سے بخارات، بادل بن کر نکلنا اور برس جانا آثار مختلف ہوتے ہیں مختلف صورتوں سے پانی سمندر ہی سے آتا ہے لیکن کیا بارش

ہے۔ اللہ عزیز بھی ہے۔ قدیر بھی ہے۔ پھر بھی آپ لوگ کہتے ہیں۔ کیسے ہو سکتا ہے۔ آپ درخواست ہی نہیں دیتے تو منظوری کیسے ملے گی۔ میں نے اُن سے کہا۔ واقعہ یہ ہے کہ میں نے حضرت قطب صاحبؒ، حضرت محبوبِ الٰہیؒ، حضرت چراغ دلیؒ اور حضرت باقی باللہؒ کے پاس حاضریاں دی تھیں اور عرض کیا تھا حضرت ہم کو آپ کے پاس سے تو بصیرت ملتی ہے۔ بصارت تو حیوانی چیز ہے۔ حکمت میں ڈاکٹروں کے پاس گنجائش نہیں ہے۔ لیکن ہم قدرت کے تحت آپ کی دعا سے کار برآری چاہتے ہیں۔ مدد فرمائیں۔ چنانچہ بفضلِ الٰہی ایسی مدد حاصل ہوئی کہ سب دنگ ہو گئے۔

**(۲۶) حکومتِ عالم اور مومن** قرآناً یہ امرِ مسلّم ہے کہ حضور انورؐ کے پاس سے عالم میں حکومت تقسیم ہوتی ہے حکومت ہو یا کچھ اور۔ جب تک مومنِ کامل کے قلب پر خطرہ نہ گزر جائے اس کا ظہور اس عالم میں نہیں ہو سکتا۔ غدر کے زمانے میں ایک بزرگ مُلّا محسنؒ نے ہمارے والد صاحب سے پوچھا۔ کیا انگریزوں کا حاکم جوان عورت ہے۔ اس کو دربارِ رسالت سے ہندوستان کی حکومت عطا ہوئی۔ چنانچہ واقعات کے خلاف انگریزوں کو نا اُمیدی کی حالت میں کامیابی ہوئی۔

اس عالم میں خاص خاص اولیاء اللہ کو حکومت سے ربط رہتا ہے اگر رحمانیت کے تحت ان کی حمایت مختلف حکومتوں کو حاصل نہ ہو تو ان کا قیام ناممکن ہو جائے۔ حکمتِ کلّی کے لحاظ سے یہ ربط ضروری ہے۔ البتہ حکمتِ جزوی میں نامناسب معلوم ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اولیاء اللہ میں اختلاف چلتا ہے۔ اور وہ رحیمیت کے تحت سب کو کاٹ کر رکھتے ہیں۔ لیکن بعض ان دونوں اسماء رحمٰن و رحیم کے مظہر ہوتے ہیں۔ ان کا مقام بڑا ہوتا ہے۔ ان میں

پوشیدہ ہیں۔ خود تاریخ سے ثابت ہے کہ یزید کے زمانے میں مسجد نبوی میں تین دن
تک گھوڑے بندھے رہے۔ خواتین کی بے حرمتی کی گئی۔ فوراً کچھ نہ ہوا۔ بعد کو ہوا بعض
دفعہ ظلم کو ڈھیل دے کر پایۂ تکمیل کو پہنچنے کا موقع دیا جاتا ہے تاکہ حکمت کے تحت
ان پر حجت تمام ہو کر سزا دی جائے۔ اور فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا
(۶/۴۵) صادق آئے۔ اصل میں یہ مسئلہ اقتضاءات کا ہے۔ اس عالم کا سمجھنا مشکل
ہے۔ ایک طرف کہا جاتا ہے۔ اللہ چاہتا تو سب کو ہدایت کرتا۔ دوسری طرف کافروں
کی تخلیق اور پرورش عمل میں آرہی ہے۔ اور پھر تبلیغ کا حکم ہوتا ہے تاکہ مسلمان اپنا
اقتضا پورا کریں۔ حضرت نوحؑ سب کافروں سے عالم کو پاک کرنے کی دعا کرتے ہیں
جو قبول ہوتی ہے اور حضورؐ کافروں کی ہدایت کی دعا کرتے ہیں جو قبول ہوتی ہے
بہرحال دعا بھی ہے۔ بددعا بھی ہے۔ جہاد بھی ہے۔ قتل و شہادت بھی۔ ہر
ایک کا محل ہے۔ اور اس محل کے اقتضا کے تحت ہر چیز درست ہے۔ البتہ ایک دوسرے
کے تقابل سے فرق سمجھ میں آرہا ہے۔ اِنَّ رَبِّيْ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (۱۱/۵۶)۔

## (۲۵) استعانت عن الاولیاء کی مثال

مشہور شاعر مولانا امجد حیدر آبادی نے فرمایا۔ میرے والد صاحب
کی آنکھوں کا آپریشن ایک دفعہ ہو چکا تھا۔ کچھ عرصہ بعد پھر بیکار ہو گئیں آپریشن
کے بعد دوسرا آپریشن عموماً نہیں ہوا کرتا۔ دلی کے ڈاکٹر قریشی آمادہ نہ تھے
والد صاحب نے فرمایا۔ میری ذمہ داری پر کرو۔ نوے سال کی عمر میں جب
آنکھیں نری خشک تھیں آپریشن کیا گیا اور نہایت کامیاب رہا۔ خود ڈاکٹر
نے حیرت کی اور کہا کہ سن کے لحاظ سے کامیابی کا قطعاً امکان نہ تھا۔ یہ یا
کرامت ہے۔ ڈاکٹر نے مجھ سے توجیہ پوچھی۔ میں نے کہا۔ آپ حضرات علماء
اسباب میں حکمت کی حد تک خوب جاتے ہیں۔ لیکن اس کے آگے ایمان کا ...

اس وقت عالم میں دراصل حق و باطل، اسلام و کفر کی جنگ ہے۔
اس لیے انبیاءؑ کے اصول کے تحت ہمیں آئینوں کے ذریعے متوجہ الی اللہ ہونا چاہئے تاکہ حق کی قوت سے باطل کو شکست ہو جائے۔

**(۲۸) نسبت** | اللہ والا نسبتوں کی موٹر میں چلا جاتا ہے جس سے جو ٹکراتا ہے پاش پاش ہو جاتا ہے، چاہے اُس میں معمولی آدمی ہی کیوں نہ سوار ہو۔

جو رسول اللہؐ سے اور اہلِ بیت سے نسبت توڑے وہ کہیں کا نہیں رہتا جو ان نسبتوں کو توڑے اُسے دُنیا میں ذلیل انسانوں سے ربط قائم کرنا پڑتا ہے جو مشاہدہ ہے۔

ایمان میں صفائی ہو۔ ادب اور ربط اچھا ہو تو اولیاء کی نسبت سے تقویت ہوتی ہے۔ نسبت کیا ہے۔ ایک نگران کار ہے مثلاً بچے کا نگران کار بچے کو ہر وقت گرنے سے روک لیتا ہے۔

نسبت دو دھاری تلوار ہے۔ اس کا اچھا استعمال دشمن کے لیے مُہلک ثابت ہوتا ہے اور غلط استعمال اپنے لیے۔

حضرت شاہ عبدالحق محدثؒ فرماتے ہیں۔ بڑا عمل یہ کہ کسی اللہ والے کے دل میں جگہ پیدا کر لے۔

نسبتِ سجادگی یا نسبت اولیاء اللہ کوئی ذاتی صفت یا فعل نہیں۔ اللہ کے فضل سے نصیب ہوتی ہے۔ لیکن جسے نسبت حاصل ہو اس پر اس نعمت کی حفاظت کا فرض عائد ہوتا ہے۔ اس کو اپنی زندگی اور علم و عمل ایسا رکھنا چاہئے کہ نسبت پر کوئی حرف نہ آئے ورنہ مار پڑتی ہے۔

اکابر کی شان میں بے ادبی کرنے پر بڑے بڑے علم والوں پر پڑے چکر

توازن ہوتا ہے۔ اولیاء اللہ کے مقابلے نفس سے خالی ہوتے ہیں۔ منشائے الٰہی کی تعمیل ہوتے ہیں۔ اس کے نہ سمجھنے کی وجہ سے لوگ ہلاک ہوتے ہیں۔
حکمتِ کلی اور نظم و نسق کا علم حاصل ہو تو معلوم ہوگا کہ جیلر کا قاتلوں، باغیوں کو کھلانا، اور مہتمم عجائب خانہ کا اژدہوں کو پالنا کتنی بڑی سرکاری خدمت ہے۔ ورنہ جاہل کہے گا کہ جیلر قاتل یا باغی کی کیوں حمایت کر رہا ہے اور مہتمم سانپوں کو کیوں پال رہا ہے۔
اولیاء اللہ مومنین کی کیوں نہ مدد کریں جب کہ وہ کافروں تک کی مدد کرتے ہیں۔ لیکن وہ امر کے تابع ہیں۔ سب کو ربوبیت کا فیض اولیاء کے ذریعے باطن سے مل رہا ہے۔ اس کے لیے اولیاء کے پاس کافروں کا حاضر ہونا اور استعانت کرنا بھی لازمی نہیں۔ بلکہ اسم رحمٰن کے تحت ان کا اقتضا پورا کرنے کے لیے وہ خود مدد کرتے ہیں۔ اور رحمۃ للعالمینؐ کے تحت رہ کر ان کو حکومتیں، دولتیں، قوتیں عطا کرتے ہیں۔

## (۲۷) حق و باطل کا باطنی نظم

فرمایا۔ باطل پرست آج کل شیطانی قوتوں سے بہت کام لے رہے ہیں۔ اور اپنے شیاطین سے استمداد کر کے قوتیں حاصل کر رہے ہیں۔ حق و باطل دونوں کو تخلیق میں قوت اللہ ہی کے پاس سے ملتی ہے۔ پہلے کے اولیاء اللہ باطل پرستوں کے اس باطنی نظم سے کافی واقف رہا کرتے تھے۔ اور اُن کے خلاف حق کی قرآنی قوتوں سے کام لیتے تھے اور کامیاب ہوتے تھے۔ حق کی قوت تو باطل سے ٹکر ہونے ہی سے ظاہر ہوتی ہے۔ یہ حکمتِ الٰہی ہے۔ اسی لیے باطل سے کبھی گھبرانا نہ چاہیئے۔ بلکہ حق کی قوت کے مشاہدے اور اس سے کام لینے کی صلاحیت پیدا کرنی چاہیئے۔

میں تمیز کی ضرورت ہے۔ یہ تمیز اُسی وقت حاصل ہوتی ہے جبکہ نسبت قوی ہو جسمانی دوری رُوحانی فیضان کو مانع نہیں۔ عمل میں مَیں پن (انیت) نہ آئے۔ سب فضل جانے۔ چاہے فضل اندر سے آئے یا باہر سے۔ ذاتُ اللہ (فضل والے) پر نظر رہے یہی اُستاد کی بات ہے۔ کام سے مطلب رہے۔ اس کے بعد نہ ذکر کرے، نہ تعریف کا اُمیدوار ہو تو مردانگی ہے۔

**(۳۱) پہلوانی اور نسبت علیؓ** | مسلمان پہلوان ہمیشہ اللہ اللہ کیا کرتے تھے۔ محض جسمانی زور کافی نہیں سمجھتے تھے۔ اپنے ساتھ رُوحانی زور اور ہیبتِ حق رکھتے تھے۔ نسبت والے ہوتے تھے۔ اور بڑے بڑوں پر غالب آتے تھے۔ "یا علیؓ" کہہ کر دنگل میں کودتے تھے، دِل ہلا دیتے تھے۔ علی اسم الٰہی بھی ہے۔ اور حضرت علیؓ اِسمِ علی کی تجلّی بھی ہیں۔ اور شجاعت آپ کا خاص وصف ہے۔ کشتی، بنوٹ سکھاتے وقت حضرت علیؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت غوثِ اعظمؓ کی نیاز دلائی جاتی ہے۔ قرآن کا حلف لیا جاتا ہے کہ ظلم کی حمایت نہیں کی جائے گی۔ اور عورت، بچے، بوڑھے، بیمار پر وار نہیں کیا جائے گا۔ نیت فساد کی نہ ہو۔ شرافت لازمی ہے۔ جنّات و شیاطین بھی حضرت علیؓ کا نام لینے پر قریب نہیں آتے۔

**(۳۲) نسبت والے کی ذمہ داری** | نسبت کے اسرار بہت نازک ہیں۔ نسبت والے پر بڑی ذمہ داریاں رہتی ہیں ورنہ نسبت کٹ کر مار پڑتی ہے۔ اگر اولیاء اللہ کی شان میں نسبت والے کے سامنے کوئی گستاخی کرے اور وہ خاموش رہے تو جواب طلب ہو جاتا ہے کہ کیوں جواب نہیں دیا اور اپنی نسبت کو کیوں ذلیل کیا۔ اگر جواب دے تو فتنہ کھڑا ہو جاتا ہے۔ معذوری کی حالت قابلِ لحاظ ہوتی ہے۔ چنانچہ قرآن میں بڑی سخت تنبیہ ہے۔ اِذَا سَمِعْتُمْ

پڑتے ہیں غلط علم میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ خود مکتفی ہونے کا خیال اور کسی نسبت کی عدم ضرورت کا خیال عرفان و عبدیت کے علم کے منافی ہے۔

**(۲۹) نسبت اور ترکِ نسبت** | یاد رکھو نسبتیں سب سے بڑی نعمت ہیں۔ ہمیں ایسا معلوم ہوتا ہے۔ ہمارا کہیں مقام نہیں۔ ایک تعین ہیں اور بس۔ یعنی عدم و جہل لیکن نسبتیں بفضلہ سر پر سایہ کئے ہوئے ہیں جن کے واسطے سے نعمتیں مل رہی ہیں۔ انبیاء تک رحمۃ للعالمین صلعم کی نسبت سے مستفیض ہیں وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَضْلًا كَبِيْرًا (۲۲) ترجمہ۔ مومنین کو خوش خبری دیجئے کہ اُن کے لیے اللہ کی طرف سے بڑا فضل ہے۔ اِس آیت سے ظاہر ہے مومن کے لیے حضورؐ کی نسبت فضل کبیر ہے۔ محمدؐ و احمدؐ کے بغیر فضل ہوتا کہاں۔ لیکن حیرت ہے کہ بعض لوگ فضل محمدؐ اور فضل احمدؐ کے نام کو شرک سمجھتے ہیں حالانکہ اسی آیت سے ثابت ہے کہ فضل محمدؐ میں ہی فضل اللہ ہے۔ اور یہی توحید ہے۔

نسبتیں ہر وقت سایہ کئے ہوئے ہیں لیکن خوف رہتا ہے کہ کہیں بادل کی طرح ہٹ نہ جائیں۔ اسی لیے رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا پڑھتے ہیں۔ دوسری طرف اندیشہ رہتا ہے کہ اللہ کسی ذرہ سے لپیٹا نہ دے کہ اس کے بندے بن کر رہ جائیں یہ لوگ اکابر سے بے نیاز ہو کر زندگی بسر کرتے ہیں، اور ہمیں توحید ایسی معلوم ہوتی ہے کہ بزرگوں کے صدقے میں بفضلہ ہم عالم سے بے نیاز ہو جاتے ہیں ہم کو نسبت میں توحید اور اُن کو نسبت میں شرک نظر آتا ہے۔ غلامی بڑی چیز ہے۔ لیکن ان لوگوں کو حضورؐ کی غلامی ہی میں شرک نظر آتا ہے۔ اللہ شرح صدر کرے تو سمجھ میں آئے۔

**(۳۰) نسبت اور فضل** | فیضانِ علمی کے وقت بھی نفس و شیطان اور فیضِ الٰہی

برتنوں میں بھی آتے ہیں۔ البتہ رنگ، روغن، پختگی پکے برتنوں کا حصہ ہوتی ہے۔ لیکن خوبی یہ رہتی ہے کہ جو کام ظاہر و باطن کے لحاظ سے ہزاروں میں ہونا چاہیئے یہاں کوڑیوں میں ہوتا ہے۔ اور جس میں مصیبت کی شدت کی وجہ سے جان نکل جانی چاہیئے اس میں برائے نام بار ڈال کر عظیم الشان نعمتیں دی جاتی ہیں۔

**(۳۴) قبر کی حقیقت** ایک صاحب نے کہا۔ قبور ڈھیر ہیں۔ اہل قبور کچھ نہیں کر سکتے۔ مر گئے ختم ہوا۔ فرمایا۔ اگر قرآن پر ایمان رکھتے ہو تو معلوم ہوگا کہ کسی کامل کے قدم کا کسی قبر پہ جانا کیا آثار پیدا کرتا ہے۔ حضورؐ کو سردار المنافقین عبداللہ بن اُبی کی قبر کے متعلق حکم ہوا۔ وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓی اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰی قَبْرِهٖ (۱۰/۱۷) ترجمہ: اور ان میں کوئی مر جائے تو اس پہ کبھی نماز نہ پڑھو اور نہ اس کی قبر پہ کھڑا ہو۔ یہ تھا حکم کفار و منافقین کی قبروں کے متعلق۔ لیکن مومنین کے قبور کی شان کا کیا کہنا کہ خود بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ صلعم اکثر جنتُ البقیع تشریف لے جاتے اور اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ يَا اَهْلَ الْقُبُوْرِ فرماتے اور دعا فرماتے اور سالانہ شہدائے اُحد کے قبور پر تشریف لے جاتے۔ اگر قبر کوئی چیز نہیں۔ مہمل ہے۔ ڈھیر ہے تو یہ حکم اور یہ عمل کیوں وہ صاحب اس پر بہت متاثر ہوئے اور مان گئے۔

بظاہر قبر ہمارے سامنے ہوتی ہے۔ میّت کا قبر سے ہر وقت تعلق بھی ہوتا ہے۔ لیکن ہم میں اور میت میں عوالم کا فرق و بُعد ہے۔ پھر سلام ہے۔ لام ہے۔

**(۳۵) عالم برزخ** عالم برزخ کے متعلق تین باتیں ہیں۔ ایک زمان و مکان یعنی جہاں ہمارا خیال وہیں ہم۔ ورنہ ہمارا بدن ڈھانچے

آیاتِ اللّٰہِ یُکْفَرُ بِھَا وَیُسْتَھْزَأُ بِھَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَھُمْ حَتّٰی یَخُوْضُوْا فِیْ حَدِیْثٍ غَیْرِہٖ۔ اِنَّکُمْ اِذًا مِّثْلُھُمْ (۵ﷺ) ترجمہ: جب اللہ کی نشانیوں کے ساتھ کفر کیا جائے اور ٹھٹھا کیا جائے تو ان لوگوں کے پاس مت بیٹھو جب تک کہ وہ اور بات شروع نہ کردیں کہ اس حالت میں تم بھی ان ہی جیسے ہوجاؤ گے۔ جتنا بڑا مقام اور عہدہ ہوگا اتنا ہی خطرہ ہوگا۔ لیکن نسبت والے کی حفاظت بھی ویسی ہی ہوتی ہے۔ نسبت والے کو اپنے اعمال ٹھیک رکھنے چاہئیں تاکہ فیضان خوب ہو۔ پہلوان کو سارا لطف دشمن سے لڑنے میں آتا ہے۔ کمانڈر کو لطف میدانِ جنگ کے خطرات میں آتا ہے ورنہ مفت کی تنخواہ میں کیا لطف۔

ایک صاحب نے کہا مسلمانوں پر بڑی بلائیں آرہی ہیں۔ فلاں سجادہ صاحب پر بڑی مصیبت آئی۔ فرمایا۔ فطرت یہ ہے کہ اپنا بچہ غلطی کرے تو ڈبل سزا۔ ماما ملازم کا بچہ وہی غلطی کرے تو کم سزا دی جاتی ہے یا اس پر توجہ نہیں کی جاتی۔ سخت سزا کا مقصود اپنے بچوں کی اصلاح ہوتا ہے۔ سزا و جزا ہر دو طرف یہی قانونِ فطرت کارفرما ہے۔ چنانچہ حضورؐ کی ازواجِ مطہرات کے متعلق ارشادِ باری ہے۔ غلطی پر دُگنا عذاب ہوگا اور نیکی پہ دُگنا ثواب ملے گا۔ یُضٰعَفْ لَھَا الْعَذَابُ ضِعْفَیْنِ ۔۔۔۔ وَتَعْمَلْ صَالِحًا نُّؤْتِھَآ اَجْرَھَا مَرَّتَیْنِ (۲۲/۱)

**(۳۳) مصیبت میں نسبت کا فیض** بعض لوگ بعض اولیاء اللہ کے متعلق کہتے ہیں۔ اتنی بڑی نسبتوں کے باوجود اتنی بڑی مصیبتیں ان پر کیوں آئیں۔ اللہ تعالیٰ کے اس انتظام سے وہ غافل ہیں کہ وَلَنَبْلُوَنَّکُمْ (۲/۲) کی بھٹی کے بغیر، ان اعلیٰ مقامات کا حصول اور ان میں استحکام ممکن ہی نہیں۔ اسی میں اِنَّا لِلّٰہِ کا علم پختہ ہوتا ہے۔ اسی بھٹی کے ذریعے کچے اور پکے برتنوں (منافق و مومن) میں تمیز پیدا ہوتی ہے۔ ورنہ نقوش تو کچے

بڑی چیز ہے کہ ملاقات کا فرض ادا کیا۔ اس کا فوری فیضان یہ کہ محبت، عقیدت پیدا ہوتی ہے اور قلب میں سکون کی خاص کیفیت محسوس ہوتی ہے۔ اور ان کا فیضان مختلف طریقوں سے حاصل ہوتا ہے۔ اُن کی دعا اور رفاقت سے کمال بر آتی ہو جاتی ملنا لازم نہیں۔ وہ چاہیں تو اپنے ملازم کو کام کی تکمیل کے لیے اشارہ کر دیں، خط لکھ دیں یا دعا کر دیں۔ لیکن ان ایمانی سیدھی باتوں کے بجائے بعض پیر صاحبان اپنے مریدوں کو دادا پیر کی قبر اور کشف قبور اور خوابوں، کرامتوں کے تماشوں میں لگا دیتے ہیں جس میں اکثر دھوکے ہوتے ہیں لیکن قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ ایمان بالغیب پر ترقی اور ترقیاں ملتی ہیں۔ آثار طلبی تو کا نزول کی علامت ہے۔ رفاقت اولیاء کی آنتوں پر ایمان رکھیں۔ شک نہ کریں۔ اکثر لوگ مجھ سے کشف و خواب بیان کرتے ہیں میں اہمیت نہیں دیتا۔ سمجھتے ہیں ان کو یہ چیز حاصل نہیں جب ہم کہتے ہیں۔ ہم کچھ نہیں اور نہ کمال رکھتے۔ تب بھی انھیں کرید رہتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اعتبارات ایمانیہ کی کیا اہمیت ہے۔ کہ انھیں کمالات میں چین نہیں اور ہمیں بے کمالی میں سکون حاصل ہے۔

## (۳۷) اہل قبور سے ربط اور بت پرستی کا فرق

بعض لوگ اہل قبور سے ربط و تکریم اور بت پرستی دونوں کو برابر سمجھتے ہیں۔ انھیں نہ موجودہ بت پرستوں کا علم ہے اور نہ قدیم بت پرستوں کا۔ بت پرستوں کا اعتبار یہ ہے کہ وہ مختلف صفات مثلاً ربوبیت، تخلیق، تخریب، علم، قدرت، دولت وغیرہ کی تجلیوں کو ایک ایک تعین اور صورت میں محدود و مقید مانتے ہیں۔ اُن کے نزدیک ہر ایک بت بالذات اس صفت کا حامل ہے۔ صرف یہی بلکہ اس صفت کا لزوم اسی صورت و تعین میں مانتے ہیں۔ اس کے برخلاف اسلامی تعلیم کے لحاظ سے کوئی چیز مستقل بالذات نہیں۔ اور نہ کسی چیز میں

سے بڑھ کر نہیں۔ میرے ایک دوست بعض وقت حالتِ بیداری میں تنِ مثالی کے ساتھ دوسرے عالم کو چل دیتے تھے۔ ایک مرتبہ وہ جسم سے نکل کر سیر کر رہے تھے۔ اُن کو اپنے بدن میں واپس آنا ناممکن ہو گیا۔ اور اُنھیں اندیشہ ہُوا کہ مجھے مُردہ سمجھ کر لوگ دفن کر دیں گے۔ بمشکل بہت دیر بعد بدن میں سما سکے۔ مجھ سے کہا۔ یہ حالت رُک جائے تو بہتر ہے۔ میں نے ایک آیت بتائی تو فائدہ ہُوا۔ دیگر یہ کہ اولیاء اللہ ایک حد تک برزخ کی کیفیت بیان کرتے ہیں۔ زیادہ نہیں۔ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ (۱۵/۱) رُوح میرے رب کے حکم سے بنی ہے۔ رُوح کا عمل مُطلق ہے اور جسم کا مقیّد۔ حضرت ابنِ عربیؒ نے تنِ مثالی سے سیاروں کی سیر کی اور چشم دید واقعات لکھے۔ تیسری چیز خواب کی حالت (برزخی) ہے جو بے پایاں سمندر کے مانند ہے کہ انسان خواب میں ہر جگہ موجود ہوتا ہے اور ہر چیز کر گزرتا ہے۔

**(۳۶) کشفِ قبور** اکثر لوگ اولیاء اللہ کے مزارات پر جا کر جبری رابطہ پیدا کرنا چاہتے ہیں جو بہت نامناسب ہے۔ اخلاقاً دنیا میں بھی کسی کے گھر جا کر باہر آنے پر مجبور کرنا بُرا سمجھا جاتا ہے۔ یہی کیا کم فضل ہے کہ زیارت کی توفیق ہوئی سلام کیا۔ اب وہ جیسا سمجھیں گے ملیں گے۔ دُعا دیں گے۔ کار برآری کا انتظام کریں گے۔ کشفِ قبور کی ایسی کوشش میں اکثر دھوکے ہوتے ہیں شیطان آکر ملے تو تمیز نہیں ہوتی اور اُس کو حضرت قبلہ سمجھ بیٹھتے ہیں۔ عام طور پر صاحبِ مزار سے ملاقات نہ ہوا اور ظاہراً فیض نہ ہو تو لوگ کہتے ہیں کہ یہ بے کار کام ہے۔ یہ مُردے ہیں۔ اسی اصول پر کوئی دُنیا میں کسی کے گھر جا کر مل کر اپنی مُراد پوری کرا کے تو دکھا دے۔ یہ ناممکن ہے۔ البتہ اگر وہ چاہیں تو ملاقات کریں۔ ہمارا اُن کو بلانا اور مجبور کرنا بے ادبی ہے۔ بلکہ مار پڑنے کا اندیشہ ہے۔ اصل میں زیارت کی سعادت

لازم ہے۔ دل جتنا صاف لائے گا بس اتنا ہی عکس آئے گا جیسی نظر
ویسی دید، جیسی طلب ویسی یافت ع دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر
بہرحال روحانی فیوض و برکات کی بحث بہت نازک ہے۔ جس پہ
گزرے وہی جانے ع لذتِ مے نہ شناسی بخدا تا نہ چشی (صراط الحمید للمریدینؒ)

## (۳۹) شہداء اور صدیقین کے آدابِ زیارت

شہداء و صدیقین کو اس عالم شہادت سے بہت
زبردست تعلق رہتا ہے۔ شہداء میں تلوین بہت ہوتی ہے اور صدیقین میں
تمکین (ایک حالت پر قرار) ہوتی ہے۔ شہداء کا معاملہ بہت نازک ہے۔ وہاں
پہ بہت ادب، لحاظ کرنا پڑتا ہے۔ ان پر جلالی شان غالب رہتی ہے کیونکہ
وہ قتل ہو کر ایک آن میں اس عالم سے اس عالم میں منتقل ہوئے۔ اس
لیے شہداء کے قبرستانوں میں بہت رعب و حرارت رہتی ہے بعض جگہ تو
راتوں میں گھوڑے، چمکتی تلواریں اور جنگ کے مناظر نظر آتے ہیں اور لوگ
ان کو اصلی حالت میں دیکھ کر ہیبت کھاتے ہیں اور غلط رائے قائم کرتے
ہیں۔ ان کے پاس جمعرات کا دن خاص ہوتا ہے جبکہ سب جمع ہوتے ہیں اور
جلوس نکلتے ہیں۔ رات ۲ تا ۲، دن کے بارہ بجے اور طلوعِ آفتاب سے
آدھ گھنٹہ بعد تک ان کے مزاروں پر رہنا مناسب نہیں۔ احتیاط طلب ہے۔
مغرب کے بعد جھٹ پٹے کے وقت شہداء کو اس عالم کی طرف بہت توجہ رہتی
ہے۔ بچوں کو ایسے وقت ان کے پاس لے جانا مناسب نہیں۔ ورنہ اس عالم سے
ربط پیدا ہو کر توازن بگڑنے کا اندیشہ ہوگا۔ شہداء کو بچے اور صفائی مرغوب
ہوتے ہیں۔ بچوں پر روحانیت خود بخود غالب رہتی ہے اور حیوانیت مغلوب۔
قرآن میں شہداء کی شان میں بہت سی آیتیں ہیں تاکہ لوگ ادب سیکھیں اور

کسی قوت واثر کا لزوم ہے۔ حتیٰ کہ اللہ کا رسول بھی عبدہٗ و رسولہٗ ہے۔ شفاعت و عطاء وغیرہ اللہ تعالیٰ کی مرضی کے تابع ہیں۔ اللہ کی قدرت، عطا، حول و قوت و اثر کا ظہور بندوں میں مربوب کی حیثیت سے ہوتا ہے۔ اور ان سے جو کارسازی ظہور میں آتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت سے مانی جاتی ہے۔ لیکن بُت پرستوں کے نزدیک یہ امور ان ہی تعینات کی مرضی پر منحصر ہیں۔ لازم ہیں۔ اسلام اور کفر میں یہی عظیم الشان فرق ہے۔ یہ اسلام کا اثر ہے کہ بُت پرستی کی یہ تعبیر کی جا رہی ہے کہ ہمارا معبد بھی آپ کے کعبہ کی طرح قبلۂ توجہ ہے۔ اور بُت آپ کی قبروں کی طرح ہیں۔ لیکن حقیقت یہ نہیں کہ وہ بُت کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ اور کسی رُوح کی طرف توجہ کرتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ مذہبی رسوم کی ادائی سے قبل سونے یا پتھر کی مورت کو کوئی تقدس حاصل نہیں ہوتا۔ لیکن مذہبی رسوم کی ادائی کے بعد وہ بُت اس رُوح کا عین ہو جاتا ہے اور اُن میں دوئی نہیں ہوتی۔ وہ اسماء و صفات کو مستقل بالذات اور منفک عن اللہ مانتے ہیں۔ اس کے برخلاف قبور تو اللہ کے بندوں کی ہوتی ہیں جہاں قرآن و حدیث کے لحاظ سے زندگی ہوتی ہے اور سلام و کلام ہوتا ہے۔ معترضین اہلِ قبور سے ربط اور اُن کی تکریم کو قبر پرستی سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور تعظیم و تعبّد میں فرق نہیں کرتے۔ حالانکہ حضورؐ نے فرمایا۔ السّلام علیکم یا اہلَ القبور۔

### (۳۸) زیارات

زیارت گاہوں کے جو برکات ہیں، انوار ہیں، باطنی احوال ہیں، وہ اپنے اپنے ربط کی بات ہے۔ قلب کی کیفیت ہے۔ کس طرح کوئی بیان کرے اور کس سے بیان کرے ع کجاست محرمِ رازے کہ تشریح دل بکنم۔ نامحرم سے کہنا بات کھونا ہے۔ انکار کرے تو اُسے ڈبونا ہے۔ کوئی جانتا ہو یا کم از کم مانتا ہو تو دید و شنید کی گفتگو میں مضائقہ نہیں۔ سو یہ تخلیہ کی بات ہے۔ زیارت و حضوری کے خاص آداب ہیں۔ اخلاص، عقیدت اور ادب بہر صورت

چھ ماہی، برسی۔ محض رسمی طور پر یہ تاریخیں رائج ہیں۔ بنظرِ سہولت یہ مقرر کی جائیں تو مضائقہ نہیں کہ ہر کام کا کوئی نہ کوئی وقت ہوتا ہے۔ ورنہ ان میں کوئی لزوم نہیں ہے۔ لزوم سمجھنا غلط ہے۔ علیٰ ہذا ایصالِ ثواب کے موقع پر تقریب رچانا۔ کنبہ برادری جمع کرنا۔ دعوت کرنا۔ استطاعت نہ ہو تو قرض و دام کرنا اور اس تقریب کو لابُد سمجھنا۔ یہ بھی سراسر غلط ہے۔ یوں بنظرِ تعلقات و بصورتِ گنجائش احباب و اقربا شریک ہوں تو یہ ایک معاشرتی صورت ہے۔ اور عدم گنجائش کی حالت میں یہ بھی فضول ہے۔ کارِ ثواب کی آڑ میں اسراف کی صورتیں پیدا ہوتی ہیں تو بعض لوگ بے زار ہو کر کارِ ثواب ہی سے دست بردار ہو جاتے ہیں۔ لیکن افراط و تفریط دونوں صورتیں مُضر ہیں۔ اچھا کام اچھے طریق پر کرنا صراطِ مستقیم ہے۔

یہ کوئی رسمی خودستائی نہیں بلکہ حدیث شریف ہے کہ برنی کھجور بہت بہتر ہے۔ مدینہ منورہ میں برنی مقبولِ خاص و عام ہے۔ ۷ محرم ۱۳۵۲ھ کو مسجدِ نبوی میں کھجور کے ٹوکرے منگوائے۔ حضرت امام حسینؓ کی فاتحہ دی اور تبرک تقسیم ہوا۔ ۱۰ محرم کو بابُ النساء پر شربت کی سبیل لگی۔ ۱۲ محرم کو مدینہ طیبہ میں حلیم پر سید الشہداءؓ کی فاتحہ ہوئی۔ یہاں حلیم بھی بہت عمدہ پکاتے ہیں۔ مکان پر شب بھر حلیم پکا۔ کچھ احباب میں اور باقی غریبوں میں تقسیم ہوا۔ ہم کو تو کسی نے روکا نہ ٹوکا۔ (صراط الحمید حصہ دوم للبرنی ص ۱۸۶-۱۵۰-۲۷) (ماہِ محرم ۱۳۸۰ھ میں اس خادم کو بھی مسجدِ نبوی اور مدینہ طیبہ میں بلا روک ٹوک ان نیازوں کی سعادتیں حاصل رہیں۔ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا المولف علیم)

(۲۴) **نیاز کی تخصیص و تعمیم** | بعض لوگ بھی ہم نیاز۔ نذر۔ فاتحہ۔ ایصالِ ثواب کو شرک، بدعت، حرام قرار دیتے ہیں اور اُن میں

نقصان نہ اُٹھائیں۔ ان کی زندگی کی بہت تشریح کی گئی ہے۔ لیکن جاہل سمجھتے ہیں۔ کیا شہداء و صدیقین سے بڑھ گئے۔ اصل مقصد نہیں سمجھتے کیونکہ صحبت نہیں، نہ سمجھ۔

## (۴۰) آدابِ زیارت کی تفصیل

دُنیا میں ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو طبیعت، منشا، اوقاتِ فرصت وغیرہ کا لحاظ کیا جاتا ہے۔ اسی طرح اولیاء اللہ سے ملنے کے بھی خاص آداب ہیں۔ بعض ملاقات پسند کرتے ہیں بعض نہیں۔ بعض کے پاس اجازت سے جانا پڑتا ہے۔ کسی زائر میں نیک نیتی و خیر طلبی ہے تو عقل نہیں۔ بے محل آجاتا ہے اور سوتے سے اُٹھانے پر ناگواری ہوتی ہے لیکن حیوان سمجھ کر معاف کیا جاتا ہے۔ بلاوجہ ہر ایک سے ملتے پھرنا مناسب نہیں۔ ایسا شخص فضل و سعادت کے بہانے اپنی انیت کا اظہار کرتا ہے کہ ہم بھی کچھ ہیں کہ بڑے بڑے اولیاء اللہ سے مل سکتے ہیں۔ ایسے شخص کا کوئی مقام نہیں۔ ہر جائی ہونے سے کسی ایک کا ہونا بہتر ہے۔ ہر جگہ اولیاء اللہ نے روایات قائم کر رکھی ہیں جو بہت عام ہیں کہ کس دن، کس وقت، کن لوازم کے ساتھ ملنا چاہیئے عورتوں کا مزاروں پر نہ جانا بہتر ہے کیونکہ اُن کی طہارت مشتبہ رہتی ہے۔ سب سے اونچی بات یہ ہے کہ قلبِ سلیم خود محسوس کرتا ہے کہ کونسی چیز اولیاء اللہ کو پسند ہے اور کب۔

## (۴۱) ایصالِ ثواب (فاتحہ)

ایصالِ ثواب میں تو کلام نہیں۔ خواہ وہ اطعامِ طعام ہو یا تلاوتِ قرآن۔ لیکن اس کے واسطے کوئی اوقات، دن، تاریخ اور مدت اور کوئی طور طریق مخصوص و معین نہیں ہے۔ تاہم ہر کام کا ایک موقعہ اور سلیقہ ہوتا ہے۔ اگر اس کو لازم نہ سمجھا جائے تو اس میں کوئی مضائقہ باقی نہیں رہتا حسبِ موقعہ جب چاہیں ایصالِ ثواب کر سکتے ہیں۔ سویم، چہلم،

فرمایا۔ قبرستان میں کسی ایک بزرگ کے پاس زیارت کے لیے جائیں تو بعض حضرات میں ایسا ملکہ ہوتا ہے کہ تعمیم کے باوجود تخصیص کو باقی رکھتے ہیں۔ اور بعض تعمیم میں تخصیص کو برقرار نہیں رکھ سکتے۔ بعض تخصیص و تعمیم دونوں کو ساتھ چلاتے ہیں۔ یہ اپنا اپنا ذوق ہے۔

دعوت کا فطری اصول اس عالم میں بھی یہ ہے کہ مہمان خاص کے عزیز، دوست بلکہ خدام تک نہ چھوٹنے پائیں۔ پھر کیسی شرمندگی کی بات ہوگی اگر حضورؐ کی نیاز میں ازواج مطہرات اور اہلِ بیتِ اطہار کو شامل نہ کریں۔

**(۴۳) چیلنج** حق و باطل کے تصفیہ کے لیے کسی جذباتی چیلنج کو حضرت نامناسب سمجھتے تھے۔ چنانچہ ایک دفعہ ایک بڑے صاحبِ کشف بزرگ نے کچھ اہل تبرّیٰ کو ایسے تصفیہ کے لیے چیلنج دیا۔ اس پر فرمایا۔ یہ مسنون طریقہ نہیں کہ مقابلہ کے ذریعے تصفیہ کیا جائے۔ ورنہ حضورؐ اور اکابر اس پر عمل کرتے اور دشمن عذاب و لعنت میں فوراً گرفتار ہو جاتے۔ ہمارا کام صبر و استقامت ہے کیونکہ اس عالم میں باطل کے اقتضاءات کو ڈھیل دی گئی ہے۔ ہمارے اصول کے لحاظ سے ان پر لعنت بھی نہیں بھیج سکتے۔

**(۴۴) حضرت علیؓ کا دین میں مرتبہ** ناچیز نے عرض کیا۔ کیا وجہ ہے کہ حضرت علیؓ ہی سے باطنی علوم کا فیضان چلا۔ حالانکہ دیگر خلفاء راشدینؓ اور صحابہؓ موجود تھے۔ فرمایا۔ واقعہ تو یہی ہے۔ البتہ حضرت نقشبندؒ کا سلسلہ حضرت صدیق اکبرؓ تک پہنچتا ہے۔ بڑے بڑے صحابہ صدیقیت کے مقام پر فائز تھے۔ ممکن ہے اوروں سے بھی سلسلے چلے ہوں جو بعد کو ختم ہو گئے۔ باطنی فیض کا سرچشمہ خاص حضرت علیؓ باب العلم ہیں۔ ایسا کیوں ہوا۔ اس کا قرآنی جواب تو صرف ایک ہے۔ ذَالِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ

سے بعض کھاتے بھی ہیں تو ہچکچاتے ہوئے، گویا فعل حرام کے مرتکب ہو رہا ہیں۔ نیاز کا اصول یہ ہے کہ فاتحہ، نیاز دیتے میں اگر جملہ نام لیے جائیں تو ہر ایک کو برابر برابر ثواب پہنچتا ہے۔ اور اگر ایک بزرگ کے نام سے نیاز دیں تو ایک ہی کو ثواب پہنچتا ہے۔ اس مسئلہ میں حضرت مجدد الف ثانی رح کا مسلک بہت فطری ہے کہ تعمیم میں ہر ایک کو برابر ثواب پہنچتا ہے۔ لیکن تخصیص میں جن بزرگ کے لیے ایصال ثواب کیا جائے اُن کو خاص مسرت ہوتی ہے جو تعمیم میں نہیں ہوتی۔ گویا کہ ربط کی تعمیم میں وہ قدر نہیں ہوتی جو تخصیص میں محو اکر لی ہے۔ مثلاً اگر کوئی ہماری دعوت خصوصیت سے کرے تو ہم کو داعی سے خاص مسرت وخصوصیت ہوگی اور اہتمام کے ساتھ جانا لازم سمجھیں گے۔ لیکن اگر بہتوں کی دعوت ہے تو ہم بھی چلا جائیں گے، ہیں۔ اور ہم کو داعی کی طرف خاص توجہ اور اُس سے تخصیص نہ رہے گی دفتر سوم مکتوب ۲۸ میں حضرت مجدد رح یوں فرماتے ہیں۔

"جب میت کے لیے صدقہ کی نیت کریں تو اوّل آنحضرت صلعم کے لیے ایصال ثواب کی نیت سے ہدیہ کا ایک حصہ جدا کریں بعد ازاں اس میت کے لیے ایصال ثواب کریں۔ کیونکہ حضورؐ کے حقوق تمام حق داروں کے حقوق سے بڑھ کر ہیں۔ اور آپ کے طفیل اور وسیلہ سے فاتحہ قبول ہونے کی امید ہے۔ ایصال ثواب میں اگر بغیر شرکت کے کسی ایک بزرگ کے نام پر نیاز دی جائے تو وہ اپنی طرف سے اس نیاز کو تحفہ اور ہدیہ کے طور پر حضور انور صلعم کی خدمت میں خود پیش کریں گے۔ اور اُس کے وسیلے سے حضورؐ کے پاس سے برکات وفیوض حاصل کریں گے۔ اس طرح شرکت میں ایک درجہ ثواب ہے۔ اور عدم شرکت اور تخصیص کی صورت میں دو درجے۔"

## (۴۵) حضرت خاتونِ جنت رضؓ کے اعمال

حضورِ انورؐ کا حضرت خاتونِ جنتؓ کو یہ فرمانا کہ میں تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔ تمہارے لیے تمہارے عمل کام آئیں گے۔ یہ فرمان انتہائی قرب کو ظاہر کرتا ہے۔ لیکن بعض لوگ اسے پڑھ کر جہالت و نادانی سے حضورؐ کے شفیع نہ ہونے کو ثابت کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے۔ اے فاطمہ! تمہارا معاملہ اللہ کے ساتھ ہے۔ میں بھی بیچ میں نہیں ہوں۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ وہ مقامِ قرب ہے جہاں اللہ تعالیٰ سے حضرت خاتونِ جنتؓ کا تعلق ایک خاص نوعیت اختیار کر لیتا ہے۔ اور بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ بیچ میں نہیں ہیں۔ اس کا منشا ہرگز شفاعت کا بطلان نہیں بلکہ انتہائی قرب کا اظہار ہے۔

اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک وزیرِ اعظم پورے ملک میں حکومت کر رہا ہے ملک میں سب مخلوق کو نفع یا نقصان پہنچا رہا ہے لیکن اپنے بیٹے کا معاملہ آنے پر کہتا ہے۔ تمہارے لیے میں کچھ نہیں کر سکتا۔ تم جانو اور بادشاہ جانے۔ ایسی صورت میں غور کرو۔ بادشاہ کی محبت و توجہ کس درجہ وزیر کے بیٹے پر ہوگی۔ لازماً انتہائی توجہ کرے گا۔ اور اسی کی خاطر بطورِ خود اس کی پرورش و ترقی کا انتظام کر دے گا۔

## (۴۶) حضرت امام حسنؓ اور حضرت امام حسینؓ

جہاد در اصل امرِ الٰہی کی تعمیل کا نام ہے۔ نہ محض لڑنے کا، نہ محض خاموش رہنے کا۔ قرآن میں ہر مقام اور ہر مرتبہ کی تعلیم ہے۔ لوگ نادانی سے اکابر پر اعتراض کرتے ہیں اور کہتے ہیں۔ حضرت امام حسنؓ آرام پسند، صلح پسند تھے۔ لڑے نہیں۔ اور چھوٹے بھائی حضرت امام حسینؓ کی شجاعت کی تعریف کرتے ہیں۔ انھیں نہیں معلوم کہ قرآن میں کُفُّوْٓا اَیْدِیَکُمْ وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ (پ۵) یعنی (جنگ سے) ہاتھ روکو، نماز پڑھو اور زکوٰۃ دو، کا بھی تعلیم ہے۔ ۱۳ سال تک

مَنْ یَّشَاءُ (پ ۱۲) اللہ کا فضل ہے جسے چاہا دیا۔ اس خاندان کو خاص شرف بخشا کہ فیضانِ نبوت حضرت امام حسنؓ اور حضرت امام حسینؓ کی اولاد کے ذریعے عالم میں پھیلا۔ اکثر اکابرِ دین حضرت علیؓ ہی کی اولاد (سادات) میں ہوئے۔ در اصل حضرت علیؓ کو تعلیم و تبلیغ سے طبعی مناسبت تھی۔ رسول اللہؐ کے ساتھ بچپن سے اخیر وقت تک لپٹے رہے۔ اَنَا مَدِیْنَۃُ الْعِلْمِ وَعَلِیٌّ بَابُھَا کی نعمت سے سرفراز رہے۔ حضورؐ نے آپ کے متعلق یہ بھی فرمایا۔ تیرا گوشت خون میرا گوشت خون ہے۔ میں جس کا مولیٰ ہوں۔ علی اس کا مولیٰ ہیں۔ بچپن سے حضرت علیؓ ان کے والد حضرت ابوطالب، اُن کی والدہ فاطمہ بنتِ اسدؓ، پھر حضرت فاطمہ خاتونِ جنتؓ، پھر حسنینؓ قمرینؓ سب حضورِ انورؐ سے لپٹے ہوئے تھے۔ ان پر کل وقت معیت و عنایتِ رسولؐ کی انتہا تھی۔ اسی لیے سب سے زیادہ فیضان کا منبع یہی بنے۔

حضورِ انورؐ کی اولاد صرف حضرت فاطمہؓ سے چلی۔ حضرت خدیجہؓ میں فدائیت اور محبوبیت، حضرت عائشہؓ میں علم و محبوبیت کی تجلی تھی۔ بعض لوگ شیعوں کی ضد میں حضرت فاطمہؓ کے بجائے حضرت عائشہؓ ہی سے محبت کرتے ہیں۔ انھیں ربط معلوم نہیں۔ اسی لیے میں نے حضورؐ سے عرض کیا۔ ازواجِ مطہرات، صحابۂ کرامؓ اولیائے عظامؒ کے جو مقامات و مرتبے آپ پاس ہیں مجھ پر محقق ہوں۔ اور مجھے بھی آپ کے علم و ربط کے لحاظ سے محبت ہو۔ بفضلہ دعا قبول ہوئی۔ چنانچہ ہر دربار میں حاضر ہونے پر ایسا معلوم ہوا کہ گویا ہم اسی در کے ہیں۔ ہر صحابی نے اپنی موزونیت و اقتضا کے لحاظ سے دین کی خدمات انجام دیں۔ حضرت صدیقؓ نے ارتداد و افتراق سے دین کو بذریعہ جہاد بچایا۔ حضرت عمرؓ نے حکومت میں خوب توسیع دی۔ اسلام کی خوب اشاعت کی۔ حضرت عثمانؓ نے بے دریغ مال اسلام پر صرف کیا۔ اور حضرت علیؓ نے فیضانِ باطنی کے ذریعے تبلیغِ اسلام کی۔

وَرَحْمَۃٌ (۲)

**(۴۷) حضرت امام حسینؓ اور حضرت غوث اعظمؓ**
فرمایا۔ اسلام میں دو نسبتوں سے ٹکر لینا نہایت خطرناک ہے۔ یہ زہر ہلاہل ثابت ہوتی ہیں۔ ایک حسینی نسبت۔ دوسری قادری نسبت۔ حسینی نسبت میں مظلومیت کی انتہا ہے، اس لیے محبوبیتِ الٰہی کی بھی انتہا ہے چنانچہ محبت، کرم، جلال کی ساری نسبتیں اُس طرف منعطف ہوتی ہیں۔ آپ سید الشہداء ہیں کہ صبر و توکل تسلیم و رضا کے تمام مقامات عجب آن بان سے، عجب تزک و شان سے طے کر کے اپنے نانا کی اُمتِ مرحومہ کے واسطے عبدیت کے راستے آسان کر دیئے۔ اللہ کی راہ میں، صداقت کی چاہ میں، مال جائے، آل جائے، آبرو جائے، جان جائے۔ ہر قدم پر سید الشہداء دل بڑھانے اور راہ دکھانے کے واسطے موجود ہیں۔ خالق ان پر صلوٰۃ بھیجتا ہے، مخلوق ان پر سلام بھیجتی ہے۔ ان کے ہاں رحمت برستی ہے۔ کربلا میں ہدایت بستی ہے۔ یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ . . . . وَاُولٰئِکَ ھُمُ الْمُھْتَدُوْنَ (۲) اس حقیقت کی تجلی، اس مقام کی استقامت، اس مرتبہ کی یافت اور اس مقبولیت کی سرفرازی کُلّی طور پر حضرت امام حسینؓ کے واسطے مخصوص تھی کہ پنجتن پاک میں سب سے چھوٹے ہیں۔ سب کے پیارے ہیں۔ راج دُلارے ہیں۔ سُبحان اللہ۔

جب اُموی اور عباسی خلفاء کے زمانے میں گیارہ بڑے بڑے ائمہ (سادات) شہید کئے گئے۔ تو بالآخر بڑی شان سے حضرت غوث اعظمؓ حضرت امام حسنؓ کی اولاد میں تشریف لائے۔ جس طرح بنو اسمٰعیل میں حضور انورؐ تشریف لائے۔ آپ جلال کی تلوار ثابت ہوئے۔ جس جس نے آپ کی شان میں ذرا بے ادبی کی، بڑے بڑے مقامات کھو دیئے۔ حتیٰ کہ ایمان بچا لے جانا مشکل ہو گیا۔ حضرت دراصل

مناسبت سے منشا پا کر حضرت امام حسنؓ خلافت سے دست بردار ہو گئے۔ اور جہاد سے رُک گئے۔ دولت و ثروت کی بنا پر خوب زکواۃ دیتے تھے۔ خیر خیرات کرتے تھے اس کے برخلاف جَاهِدُوا کے حکم کے تحت حضرت امام حسینؓ نے جہاد فرمایا اور آیت وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ (۲) کا حق ادا کر کے اس کے مصداق بنے۔ اس لیے دونوں کے مرتبے بلند ہیں۔ دونوں نے قرآن کا حق ادا کیا۔ قرآن ہر ایک کی فطرت کے مطابق علم دیتا ہے انسان فطرت کا آئینہ ہے۔

**(۲) نسبتِ حسینؓ** حضرت امام حسینؓ بڑی زبردست نسبتوں کے جامع ہیں۔ راہِ حق میں آپ نے بے نفسی، فدائیت اور قربانی پیش کی ہے اس کی وجہ سے اِن نسبتوں کی قوت دوبالا ہو گئی۔ اور محبوبیت پر محبوبیت۔ اُمت میں تاریخی و واقعاتی اعتبار سے سب کا اتفاق ہے کہ عبدیت کی سب سے جامع آیات وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ کا حق آپ کے سوا اس درجہ کسی نے ادا نہیں کیا۔ اسی میں آپ کی رفعت ہے۔ فوج کا فخر کمانڈر پر ہوتا ہے سب تو کمانڈر نہیں ہوتے۔

**(۳) سجدۂ امانت** سجدۂ حسینؓ امانت کا وہ آخری سجدہ تھا جو منجانب صدیقین، شہداء، صالحینِ اُمت بطور فرضِ کفایہ آپ نے پیش فرمایا۔ بظاہر وہ خاک پر تھا حالانکہ وہ عرش سے بالا تھا کیونکہ اس مؤمن کا سجدہ عرش پر تھا۔ عرش پر سر رکھیں تو ظاہر ہے عرش سے بالا ہوگا۔ حضرت نے جہاد کے لیے جلال کی تلوار اُٹھائی تھی جس میں شہادت واقع ہوئی۔ اس میں یقیناً قیامت برپا ہونا لازمی تھا۔ جب حضرت شعیبؑ کی اونٹنی کی ٹانگ کاٹنے پر قہر و جلال کے ساتھ عذاب آیا تو حضورؐ کے محبوب نواسے کے اس غضب ناک واقعہ پر قیامت ہونی تھی۔ لیکن حکمت کے تحت حضرت جبرائیلؑ نے آپ کا سر سنبھالا۔ اس شہادت کے آثار ہر دو عالم کے لیے ظاہر ہوئے۔ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ

انکار و مخالفت جاری ہے۔ خلاصہ یہ کہ فیضان ابراہیمی اور فیضانِ محمدیؐ دو دو صاحبزادوں کے ذریعے جس طرح نسلاً بعدِ نسلٍ عالم میں نمودار ہوا۔ اس میں عجب مشابہت بلکہ مماثلت ہے۔ اور کیوں نہ ہو ملتِ ابراہیمی اور ملتِ محمدی دونوں ایک ہیں۔

**(۴۸) حضرت غوثِ اعظمؓ کا دبدبہ** حضرت غوثِ اعظمؓ کی زندگی میں رعب، دبدبہ سطوت نمایاں رہے۔ سلاطین و امراء کانپتے تھے۔ اولیا، غوث، اقطاب تھرتھراتے تھے۔ جب غوث و قطاب آتے تو دروازے پر عرض کرتے۔ اَلْاَمَانُ یَا غَوْثَ الزَّمَانْ تو حضرت فرماتے۔ اَمَانٌ لَکُمْ۔ تب اندر داخل ہوتے۔ آج بھی باطنی کیفیت کا یہی عالم قائم ہے۔ اولیاء اسی طرح عرض کرتے ہیں۔ حضرت سے بعض لوگ عرض کرتے۔ حضرت۔ کچھ تو نرمی کیجیے۔ اتنی شدت سے لوگ گھبرا جائیں گے۔ تو حضرت فرماتے۔ نہیں۔ اس محل کا اور اس زمانہ کا اقتضا ہی ایسا ہے کہ نرمی نہ برتی جائے کیونکہ ابتدا سے اب تک اولیاء اللہ کو ذلیل کیا گیا۔ گیارہ ائمہ کو یا تو شہید کیا گیا یا زہر دیا گیا لہٰذا میں غیرتِ الٰہی کی ایک تلوار ہوں۔ جو ذرا بھی بے ادبی کرے گا کٹ جائے گا۔ غیرتِ الٰہی میں بندے کا اختیار نہیں۔ اسی لیے شجرہ میں آپ کا لقب ہی سَلَّابُ الْاَحْوَالْ ہے۔ ذرا سی بے ادبی پر معارف چھن جائیں دین دنیا برباد ہو جائے۔ اللہ محفوظ رکھے (آمین)

ایک بڑے ولی اللہ نمازِ جمعہ کے لیے گھوڑے پر سوار ہوئے۔ انھیں کشف ہوا۔ ابھی حضرت غوثِ اعظمؓ نماز کو روانہ نہیں ہوئے تو فوراً اتر پڑے۔ اور جب حضرت سوار ہوئے تو پھر یہ سوار ہو کر مسجد گئے۔ یہ تھا ادب اور یہ تھی حضرت کی رفعت۔ حضرت سید احمد رفاعیؒ ہم عصر تھے۔ حضرت غوثِ اعظمؓ کی اجازت سے

بے ارادتی کے مقام پر فائز تھے۔ فرماتے ہیں۔ اگر کوئی دُعا اپنی ارادت سے میں نے عمر بھر میں مانگی تو وہ یہ تھی۔ یا اللہ! مجھے ایسا رکھ کہ تیرے سوا کوئی نہ جانے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سارے عالم میں حضرت غوثِ اعظمؓ کے ڈنکے بج گئے اور جھنڈے لہرا رہے ہیں ایک بزرگ نے خواب میں دیکھا کہ آپ جلالِ الٰہی کی ایک تلوار ہیں جو فرش سے عرش تک چلی گئی ہے۔ اور ہزاروں بد عقیدہ آپ سے ٹکرا کر ختم ہو رہے ہیں۔ جہنم واصل ہو رہے ہیں۔ اسی لیے قادری نسبت سے کوئی ٹکر نہ لے ورنہ خاتمہ خراب ہو جاتا ہے۔

غور کیجئے تو خاندانی حیثیت سے حضرت رسولِ کریمؐ کی حضرت ابراہیمؑ سے جو فیضانی نسبت واقع ہوئی ہے، اسی قسم کی نسبت حضرت غوث اعظمؓ کو حضرت رسولِ کریمؐ سے حاصل ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کے دو صاحبزادے ہیں۔ بڑے صاحبزادے حضرت اسمٰعیلؑ اور چھوٹے صاحبزادے حضرت اسحٰقؑ۔ دونوں نبی زادے ہیں۔ اور نبی ہیں۔ لیکن چھوٹے صاحبزادے کی نسل میں انبیائے بنی اسرائیل کا خوب سلسلہ چلتا ہے اور مدت تک بڑے صاحبزادے کی نسل خمول میں رہتی ہے۔ حتیٰ کہ بنی اسمٰعیل میں رسولِ کریمؐ تشریف لاتے ہیں تو بنی اسرائیل کے طرفداروں کو ناگوار گزرتا ہے۔ یہاں تک کہ حضرت رسولِ کریمؐ کے نسب سے انکار کیا جاتا ہے وہ انکار و مخالفت آج تک جاری ہے۔ علیٰ ہذا خاندانی حیثیت سے حضرت رسولِ کریمؐ کا فیضانِ نبوت حضرت امام حسنؓ اور حضرت امام حسینؓ علیہما السلام ان ہی دو ائمہ کے ذریعے عالم میں پھیلا کہ دونوں آلِ نبیؐ اور اولادِ علیؓ ہیں۔ چھوٹے صاحبزادے کی نسل میں ائمہ کرام کا سلسلہ چلا اور خوب چلا۔ مگر بڑے صاحبزادے کی نسل مدت تک خمول میں رہی۔ حتیٰ کہ حسنی فیضان کا چشمہ اُبلا اور ایسا اُبلا کہ ماشاءاللہ۔ پھر بھی حضرت غوث اعظمؓ کو ائمہ کرام سے غیر سمجھ کر جس طرح انکار و مخالفت کی نوبت پہنچی سب کو معلوم ہے۔ اور آج تک

تک میں اللہ کے حول و قوت سے تصرّف کرتا ہوں" سنا تو میں نے عرض کیا میں
اس پر ایمان رکھتا ہوں۔ چنانچہ اس ادب کی وجہ سے یہ مقام مجھ پر منکشف ہوا
حضرت غوث اعظمؓ کی ذرہ نوازی کا یہ عالم کہ فرمایا۔ اگر میرے غلام کا ستر بھی میرے
بھی ہٹے تو میں اُسے ڈھکتا ہوں۔

یہ بے ادب اللہ کی قدرت کیا سمجھیں گے، رسول اللہ کو کیا پہچانیں گے۔
جب کہ انھیں غلامانِ رسولؐ کی قدرت دیکھنی، سمجھنی نصیب نہیں۔ نہ قوت ہے،
نہ نظر ہے اور نہ ایمان ہے۔

**(۴۹) حضرت غوث اعظمؓ کا پرتو** مرشدی و مولائی حضرت مولانا الیاس برنیؒ کی
زندگی میں اپنے آقا حضرت غوث اعظمؓ کی نسبت
کا پرتو خاصا نمایاں تھا۔ غیر معمولی رعب و جلال عطا ہوا تھا۔ بڑے بڑے وزرا،
اُمرا، عہدہ دار، مشائخین، علما آپ سے مرعوب رہتے۔ حاضری حوصلہ طلب تھی
ایک طرف مزاج میں بے حد شفقت، نرمی، ملائمت تھی۔ تو دوسری طرف دبدبہ اور
ہیبت کا یہ عالم کہ بڑے بڑوں کو بے تکلف ہونے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ اچھے اچھے
ماہر تقریر و بیرسٹر گفتگو یا بحث کے منصوبے بنا لاتے لیکن دو منٹ میں سب سوچا
ہوا رفو چکر ہو جاتا۔ لطف یہ کہ بظاہر رعب داب، ہیبت کے لوازم نہ تھے مثلاً بڑا
عہدہ یا لباس، تمکنت و شان وغیرہ۔ وزرا تک سے ڈرائنگ روم میں سادگی سے
ننگے سر، کرتہ، پاجامہ، سلیپر پہنے ہوئے ملتے۔ چپراسی تک سے خوب ہنسی خوشی
شفقت سے گفتگو فرماتے۔ لیکن اگر حضرت خاموش ہو جاتے تو کسی کو بولنے کی ہمت
نہ ہوتی۔ پھر اسی رعب کے ساتھ مقبولیت کا یہ عالم کہ کثرت سے لوگ قدر کرتے
آپ سے محبت رکھتے بلکہ ملنے کے مشتاق رہتے۔ ماشاءاللہ۔

عام طور پر بڑے لوگ اَنّت کے تحت جلسہ ا ہو تعظیم اور سلام کے متمنی

بغیر کسی دعوت میں شریک نہ ہوتے۔ خلیفۂ وقت کے ولی عہد کی شادی ہوئی سب مشائخین کو دعوت دی گئی لیکن حضرت نے شرکت نہیں فرمائی اور حضرت احمد رفاعیؒ بھی منشا پا کر نہ گئے۔ ختم دعوت پر معلوم ہوا کہ حضرت غوث اعظمؓ تشریف نہیں لائے تو اسی وقت دولہا کے سر پر خوانِ نعمت دے کر بھیجا اور کہلایا۔ خادم بھی جائیں گے ہونا لیکن انتظام درہم برہم ہو جائے گا۔ حضرت کے قدم باعث سعادت ہوتے۔ اس انکار پر حضرت اپنے ساتھ حضرت احمد رفاعیؒ کو لے کر پہنچے۔ خلیفہ اور ولی عہد نے خادموں کی طرح کمر کس کر کھانا کھلایا۔ یہ تھی حضرت غوث اعظمؓ کی جبروت و سطوت کیونکہ سرکش عباسیوں سے معاملہ آ کر پڑا تھا جن کی سرکوبی ضروری تھی۔ اسی وجہ سے آپ کو قَدَمِیْ هٰذِهٖ عَلٰی رَقَبَةِ کُلِّ وَلِیِّ اللّٰہِ کی شان عطا ہوئی۔ آپ کے خطبات کا طرز بھی پُر ہیبت ہے اسی زمانے میں ہندوستان میں محل و وقت کا اقتضا ایسا تھا کہ حضرت خواجہ اعظم اجمیریؒ نے اصلاح کے لیے محبت کا راستہ اختیار فرمایا جب کہ بغداد میں رعب کی پالیسی تھی لیکن حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کے زمانے میں رعب کا اقتضا آیا۔ پھر حضرت نظام الدینؒ کے زمانے میں محبت کا غلبہ رہا لیکن آپ کے رعب سے بھی چھ سلاطین کی گردنیں جھکی رہیں۔ پھر حضرت نصیر الدین چراغ دلیؒ کے زمانے میں رعب داب رہا۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ فرماتے ہیں۔ چاہے کوئی چشتی ہو یا نقشبندی یا سہروردی۔ جب تک حضرت غوث اعظمؓ سے استفادہ نہ کرے اس کی تکمیل ممکن نہیں۔ مکتوبات شریف میں فرماتے ہیں۔ پہلے ائمۂ عشرہ بالترتیب واسطۂ فیض ولایت تھے۔ لیکن اب حضرت غوث اعظمؓ واسطۂ فیض ولایت ہیں۔ یوں تو اُمت میں بہت سے کامل اولیا گزرے ہیں لیکن آپ کے برابر کرامات کسی سے ظاہر نہیں ہوئے۔ جب میں (مجددؒ) نے حضرت غوث اعظمؓ کا فرمودہ کہ "میں قضائے مُبرم

فِی اللّٰہِ حَقَّ جِہَادِہٖ (حج ع ۱۰) وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا۔ وَاِنَّ اللّٰہَ لَمَعَ الْمُحْسِنِیْنَ (عنکبوت ع ۷) اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰہِ لَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ (یونس ۱۱)

سَیِّدُنَا وَ سَنَدُنَا وَمَوْلٰنَا۔ اَلْغَوْثُ الْاَعْظَمُ

(۱) اَلسَّیِّدُ مُحْیُ الدِّیْنِ نُوْرُ اللّٰہِ　　(۲) اَلصِّدِّیْقُ مُحْیُ الدِّیْنِ اَمِیْنُ اللّٰہِ

(۳) اَلْمُحْسِنُ مُحْیُ الدِّیْنِ اَمَانُ اللّٰہِ　　(۴) اَلْمُخْلِصُ مُحْیُ الدِّیْنِ وَلِیُّ اللّٰہِ

(۵) اَلْمَحْبُوْبُ مُحْیُ الدِّیْنِ صِبْغَۃُ اللّٰہِ　　(۶) اَلْمَخْدُوْمُ مُحْیُ الدِّیْنِ مُرَادُ اللّٰہِ

(۷) اَلْقَادِرُ مُحْیُ الدِّیْنِ اَمْرُ اللّٰہِ　　(۸) اَلسُّلْطَانُ مُحْیُ الدِّیْنِ سَیْفُ اللّٰہِ

(۹) اَلْقُطْبُ مُحْیُ الدِّیْنِ آیَۃُ اللّٰہِ　　(۱۰) اَلْغَوْثُ مُحْیُ الدِّیْنِ حُجَّۃُ اللّٰہِ

(۱۱) اَلْفَقِیْرُ مُحْیُ الدِّیْنِ عَبْدُ اللّٰہِ

فَضْلُ اللّٰہِ فَضْلُ اللّٰہِ فَضْلُ اللّٰہِ

اَلصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلَیْہِ بِعَدَدِ کَلِمَاتِ اللّٰہِ

(مطبوعہ رقعہ کی نقل)　　مِنَ الْخَادِمِ مُحَمَّدْ اِلْیَاس الْبَرَنِی الْقَادِرِی

**(۵۲) عطیہ قادریہ** بفضلہ تعالیٰ بغداد شریف میں آستانۂ عالیہ قادریہ پر حاضری نصیب ہوئی تو دل کی تمنا تھی۔ دعا تھی کہ یوں تو ماشاء اللہ متعدد اسمائے غوثیہ مدتوں سے مروی و مقبول ہیں۔ لیکن کچھ ایسے اسماء اس ناچیز کو بھی عطا ہوں جن سے اپنے ذوق کے موافق حضرت پیران پیر غوث اعظمؓ کی شان کا عرفانی مرقع جو معنا مرتب مربوط ہو، ذہن میں آ کر دل میں سما جائے کہ قادری فیضان کا دائرہ وسیع ہو۔ اور اللہ رسولؐ کے ساتھ مقربین کے مقام و مراتب سے بھی ربط ترقی کرے۔ الحمد للہ اسمائے غوثیہ کی تمنا اور دعا بعد کو جلد پوری ہو گئی چنانچہ خاص احباب میں ان کی تقسیم بھی ہوئی۔ اور ارسال

---

نوٹ:۔ اسمائے غوثیہ کے مطبوعہ رقعہ کے پہنچتے ہی حضرت پیر سید ابراہیم نقیب الاشراف بغداد شریف، حضرت پیر جمال الدین بغدادی ذہبیؒ، حضرت پیر سید یوسف گیلانی بغدادی، پیر آف داتا، وزیرستان اور حضرت پیر سید ابو نصر حموی بغدادی اور دیگر اولیائے وقت نے نہایت مسرت کا اظہار فرمایا مبارک باد دی۔ بلکہ لکھا کہ آئندہ سے ہم اپنے مریدین کو یہ اسمائے غوثیہ عطا کریں گے۔ یہ سب حضرات اور مدینہ طیبہ اور بغداد شریف میں حضور داتا الانسان اور دیگر اولیاء اللہ اکثر فرماتے تھے۔ اس وقت آپ حضرت غوث اعظمؓ کے سب سے بڑے محب اور سب سے بڑے محبوب ہیں۔

رہتے ہیں۔ بڑوں کو سلام کرتے ہیں اور چھوٹوں سے سلام وصول کرتے ہیں۔
لیکن حضرت اس اصول کے خلاف تھے۔ مجلس میں جہاں موقع ملتا بیٹھ جاتے
جو سامنے آتا آزادی سے مل لیتے۔ بعضوں کے نفس موٹے ہوتے تو اُن کی اصلاح
کے مدنظر نہ ملتے، چاہے وہ وزیرِ اعظم ہی کیوں نہ ہو۔ یا اگر ملتے تو کچھ ترشی چھوڑ دیتے
تاکہ نشہ اُتر جائے۔ اس سلسلے میں ایک دفعہ اس ناچیز نے گفتگو کی تو فرمایا اس
زمانے کا اور اس محل کا اقتضا ایسا ہی معلوم ہوتا ہے جس کے تحت ہم نے ایسی
زندگی بسر کرنی شروع کی ہے۔ اللہ حافظ ہے۔

**(۵۰) یا پیر غوث الاعظم رضؓ** فرمایا۔ ہمارے سلسلے کے ایک بہت بڑے بزرگ
حضرت کمال الدین شاہؒ نے حضرت غوث اعظم رضؓ
کی شان میں نہایت بلند پایہ نظمیں لکھی ہیں جن کو بڑے حضرت قبلہ مستانہ وار
جھوم جھوم کر پڑھتے تھے "یا پیر غوث الاعظم" لیکن بعض وہابی منش صوفیوں کے
نزدیک یہ شرک ہے۔ دراصل حضرت غوث الاعظم رضؓ اسماء وصفاتِ الٰہی کی خاص
تجلی ہیں جس پر یہ نظر نہیں کرتے کیونکہ وہاں حضرت کی عظمت سمجھ میں آئے گی جو ان کے
خیال میں شرک ہے۔ اسی غلط علم کے تحت یہ لوگ وجود کی یافت وشہود کا مراقبہ اپنی
انیت قائم رکھ کر کرتے ہیں۔ اور انا الحق کہتے ہیں۔ دراصل اس انا الحق کہنے میں اُن کی
انیت پنہاں رہتی ہے جو شرک ہے۔ اس کی تمیز نہیں "یا شیخ عبدالقادر جیلانی شیئاً
للہ" کا وظیفہ تو اولیاء اللہ میں مشہور ورائج ہے۔

## (۵۱) اسمائے غوثیہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ

اَللّٰہُ یَجْتَبِیْٓ اِلَیْہِ مَنْ یَّشَآءُ وَیَھْدِیْٓ اِلَیْہِ مَنْ یُّنِیْبُ (شوریٰ ع ۲) وَجَاھِدُ

# فصلِ پنجم

# قرآن۔ بیعت وارشاد۔ سلوکِ علمی سلوکِ ذکری

## ۱۔ قرآن اور علم

فرمایا اسلام قرآن کا پیام ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ اور اس کے اسماء وصفات، اور اُن کے مظاہر انبیاء اور کائنات کے حقایق وروابط اور اُن کے مقاصد بیان کئے گئے ہیں۔ انسان مقصدِ کائنات ہے اور اس نظام کی جان ہے۔ اسلام کے معنیٰ اللہ تعالیٰ کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا اور اُس کے قوانین کی تعمیل ہے جو فطرت کے مطابق ہیں۔ لہٰذا اسلام کی بنیاد صحیح علم وعمل پر قائم ہے تاکہ ہم اس کے ذریعہ راہِ ترقی پر گامزن ہوکر اپنے مقاصد کو پا جائیں۔ علم کے مدارج اعلیٰ ترین خالص علمِ وحی سے شروع ہوکر، فکر، خوض اور ظن تک نزول کرتے ہیں ہر ایک کو اپنی زندگی میں کشف والقا یا شرحِ صدر کا کبھی کبھی تجربہ ہوتا ہے۔ جس سے علمِ وحی کا کچھ اندازہ ہوسکتا ہے۔ جیسے ہلکی باریک کرن سے روشن سورج کا لیکن وحی کا علم انتہائی اچانک، فطری، روشن، یقینی اور اعلیٰ ہوتا ہے جس کا دماغ سے تعلق نہیں ہوتا۔

وحی کے بعد غور وفکر کا درجہ ہے جس پر قرآن کا بے حد زور دار اصرار ہے لیکن اس کا دائرۂ عمل متعیّن ہے۔ ایک تو یہ کہ وحی پر ایمان رکھتے ہوئے آیاتُ اللہ میں قلب کو مشغول رکھ کر تدبّر وتذکّر کرے۔ نہ یہ کہ فکر کو وحی کا مقام دیدے اور وحی کا انکار کرکے فکر کے ذریعہ اُن خاص مسائل کے حل کی کوشش کرے جو وحی کے لئے مختص ہیں، جیسے فلسفی کیا

یازدہم شریف کی مبارک تقریب میں یہ عطیہ بطور تحفہ پیش ہے۔ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ

خادم محمد الیاس برنی قادری

بیت السلام - سیف آباد حیدرآباد
۱۱ ربیع الثانی شنبہ ۱۳۷۴ھ م ۲ر اکتوبر ۱۹۵۴ء

(مطبوعہ رقعہ کی نقل)

## (۵۳) مسلمان کم، کافر زیادہ کی مصلحت

ناچیز نے عرض کیا۔ مسلمان کم، کافر زیادہ کیا وجہ ہے۔ اور آیۃ رَحْمَتِیْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ (۹/۴) اور حدیث سَبَقَتْ رَحْمَتِیْ عَلٰی غَضَبِیْ کا کیا مطلب ہوگا۔ فرمایا۔ اصل چیز کمیت و تعداد نہیں بلکہ کیفیت ہے۔ قلت و کثرت کوئی چیز نہیں۔ اہم نہیں۔ روئے زمین پر انسا کے مقابل میں جرائیم اور حشرات الارض کی کتنی کثرت ہے۔ حکمت کے تحت اپنے محل پر جو ہو رہا ہے ٹھیک ہے۔ یاد رکھو۔ تھوڑا سونا ہزاروں من پیتل، رانگے سے بہتر ہوتا ہے۔ اور یہی حال کوہ نور ہیرے اور کوئلوں کا ہے۔ اسی طرح حق باطل پر غالب ہوتا اور ایک نور کا مقابلہ ہزاروں ظلمتیں نہیں کر سکتیں۔ ایک ولی کا عمل دوسرے ہزار انسانوں کے عمل سے اعلیٰ ہوتا ہے۔ صراطِ مستقیم سب سے بڑی نعمت ہے۔ اللہ نصیب کرے تو قدر ہوتی ہے کہ دوسرے لوگ باطل میں کیسے سرگرداں ہیں۔

اب رہا رَحْمَتِیْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ کا مسئلہ۔ رحمت کے بغیر نہ جمال کے مظاہر وجود میں آسکتے ہیں نہ جلال کے۔ حضور انور کی ذات مبارک اس رحمت کے ظہور کا واسطہ ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔ وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (۷/۱۷) شیطان اور اس کے تابعین بھی تو عالمین کا جزو ہیں جو حضور کے صدقے میں وجود کی رحمت سے فیض یاب ہو رہے ہیں۔ لیکن ہدایت کے فیض سے محروم ہیں۔

مختصر یہ کہ ایمان ہی وحی کے علم کے حصول کا آسان ترین ذریعہ ہے، غور کریں تو معلوم ہوگا کہ نہ صرف روحانیت میں ایمان کی ضرورت ہے بلکہ مادیت اور دنیوی علوم میں بھی ایمان ضروری ہے۔ انسانی معلومات کے خزانوں کے مقابل روزمرہ کے متعلق بھی ہمارے معلومات برائے نام ہوتے ہیں اس لئے استفادہ کے واسطے ہم کو دوسروں کے معلومات پر ایمان لانا پڑتا ہے۔ بھروسہ کرنا پڑتا ہے۔ آج کل سائنس و تہذیب جس قدر ترقی کر رہے ہیں۔ اسی قدر ہمارا ایمان اور بھروسہ دوسروں کے معلومات اور تجربات پر بڑھتا جا رہا ہے۔ لہٰذا اعلیٰ برتر زندگی میں بڑے گہرے ایمان کی ضرورت ہے۔ علاوہ ازیں وحی یا ایمان سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ اندھی قبولیت یا تقلید نہیں۔ بلکہ اس کے ساتھ ہر آن غیر محدود تازہ نور آتا ہے جسے شرحِ صدر کہتے ہیں جس کے ذریعہ انبیاء اور اُن کے متبعین کو حکمت و خیر کثیر ملتا ہے۔ علم لامحدود ہے علم حیات و نور ہے۔ جہل موت و ظلمت کا نام ہے۔ انبیاء مومنین کو نہ صرف کتاب و حکمت کی تعلیم فرماتے ہیں۔ بلکہ اُن کے قلوب کا تزکیہ کر کے ان کو حکمت کے صحیح استعمال کے قابل بناتے ہیں۔

قرآن کا ہر ہر حرف تصوف ہے لیکن تعجب و افسوس ہوتا ہے کہ آج کل تصوف کی تائید میں کوئی آیت تلاش کی جاتی ہے۔ قرآن میں تصوف کے لئے صدق کا لفظ آیا ہے اور صوفیوں کے لئے صدیقین و صادقین کا۔ اصل علم قرآنی کا بحرِ ذخّار حضور انورؐ کی ذاتِ مبارک ہے۔ تمام عالم کو اور غلاموں کو صرف سوئی کی نوک برابر علم تر کر کے دیا جا رہا ہے اس خیال سے کہ کہیں ڈوب نہ جائیں۔

اس خصوص میں حضرت کی کتاب "اسرارِ حق" سے چیدہ چیدہ چند ضروری مفید مطلب معلومات درج ذیل کئے جاتے ہیں۔

"دینیات کی غرض و غایت تیقن اور تقرب باری تعالیٰ ہے۔ اس سے وہ

کرتے ہیں۔ البتہ فکر کو کائنات اور اس کے طبعی قوانین و عملیات کی تحقیق میں استعمال کر سکتے ہیں جن کے انکشافات پر سائنسی علوم کی بنیاد ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔ ترجمہ:

(۱) ہم نے اس کی کتاب کو تیری طرف اتارا ہے تاکہ لوگ اس کی باتوں پر دھیان و غور کریں اور عقل والے سمجھیں (۳۸/۲۳) (۲) آسمان اور زمین کا بنانا ، رات اور دن کا بدلتے آنا اس میں عقل والوں کے لئے نشانیاں ہیں۔ وہ جو یاد کرتے ہیں اللہ کو کھڑے بیٹھے اور کروٹ پر لیٹے اور آسمان زمین کی پیدائش میں دھیان کرتے ہیں۔ اے ہمارے رب۔ تو نے یہ عبث نہیں بنایا (۳/۱۱)۔

اس آخری آیت سے واضح ہوتا ہے کہ مذہبی ذہنیت، سائنسی انکشافات کے ہرگز خلاف نہیں بلکہ مذہبی ذہنیت سے سائنس کا صحیح ذوق پیدا ہونا لازمی ہے اور یہ کہ جو سائنس داں، سائنس کے دائرہ عمل میں صحیح نقطہ نظر پیدا کرے گا۔ وہ لازماً مذہب کا قائل ہو جائے گا۔ اس طرح قرآن کے لحاظ سے وحی اور فکر دونوں اپنے اپنے دائرہ عمل میں علم کے صحیح معتبر ذرائع تسلیم کئے جاتے ہیں۔

اس کے برخلاف جب فکر اپنے میدان کو چھوڑ کر وحی کے دائرہ میں داخل ہو جاتی ہے اور ان اعلیٰ مسائل کو حل کرنا چاہتی ہے جو وحی کے لئے مختص ہیں تو وہ بھٹک جاتی ہے اور خوض میں سرگرداں ہو جاتی ہے جو یا وہ گوئی اور کھیل تماشے سے بڑھ کر نہیں۔ چنانچہ حکم ہے۔ وَاِذَا رَاَیْتَ الَّذِیْنَ یَخُوْضُوْنَ فِیْٓ اٰیٰتِنَا فَاَعْرِضْ عَنْھُمْ حَتّٰی یَخُوْضُوْا فِیْ حَدِیْثٍ غَیْرِہٖ (۶/۱۴)

اخیر میں ظن یعنے گمان و قیاس کا درجہ ہے۔ چاہے صحیح ہو یا غلط۔ انسانی فطرت کا عام میلان اس ظن کی جانب ہے اور یہ غلط فیصلوں کا بڑا ذریعہ ہے۔ اسی لئے قرآن وحی کے مقابل ظن کو ناپسند کرتا ہے۔ ارشاد ہے۔ یہ اکثر اٹکل پر چلتے ہیں۔ اٹکل صحیح بات میں کام نہیں کرتی (۱۰/۱۱)

کیونکہ عقل و حکمت کا ٹمٹماتا چراغ ہدایت اس بحرِ ظلمات میں داخل ہوتے ہی گُل ہوجاتا ہے۔ لیکن کرید ہے کہ فطرت (نیچر) سے نکل کر فوق الفطرت کے اسرار سے پردہ اٹھایا جائے جو عقلِ انسانی کے لئے شجرِ ممنوعہ ہے۔ مذہب کی بنیاد ایمان و اعتقاد پر ہے فلسفہ کی تعمیر قیاس و استدلال پر ہے، مذہب میں عقل آرائی فلسفہ بن جاتی ہے متکلمین مذہب کے نادان دوست ہیں۔ یہ مذہب و عقلیات کی تطبیق یا تردید کی الجھن میں مبتلا ہو گئے علمِ کلام ہی نے عقل و مذہب کی باہمی نفرت کے خیال کو پھیلایا اور اسلام کو نقصان پہنچایا۔

## ۲۔ قرآن اور نفسیات

جی چاہتا ہے کہ ایک کتاب اس عنوان پر لکھوں کہ قرآن میں شروع سے اخیر تک نفسیات ہی نفسیات ہے۔ اس میں صرف فطرتُ اللہ کا بیان ہے۔ یہ جذباتِ فطرت کا آئینہ ہے۔ اس میں زندگی کے مختلف پہلو، رخ اور کیفیات بیان کئے گئے ہیں شیکسپیئر نے اپنے ڈراموں میں نیچے کے اعتبار میں نفسیاتِ انسانی کے چند پہلوؤں کو بیان کیا ہے تو یورپ والے وجد کرتے ہیں اور اس کی نفسیات کو بے حد اہمیت و عظمت کی نظر سے دیکھتے ہیں، داد دیتے ہیں اسی نقطۂ نظر سے اگر قرآن کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس میں فطرت اور نفسیات کے کتنے اعلیٰ اعتبارات بیان کئے گئے ہیں جو حیات کے جملہ پہلوؤں پر حاوی ہیں۔

## ۳۔ قرآن اور فطرت

قرآن اللہ کا کلام ہے اور عالم اللہ کا خلق، اللہ کے کلام اور کام، قول و فعل میں مطابقت ہے۔ چنانچہ عالم میں جو کچھ ظہور ہے وہ قرآن کے مطابق ہے۔ چاہے کفر ہو یا اسلام۔ روس ہو یا امریکہ۔ اس لئے قرآن کا دعویٰ ہے کہ فطرتُ اللہ پر فطرۃ النّاس بنائی گئی ہے۔ آج کل دنیا نفسیات اور مطالعہ قدرت کی طرف بہت مائل ہے۔ کیوں نہ ان کو قرآن سے انسانی فطرت سمجھائیں کہ قرآن مبین میں سب کچھ ہے۔ کُلٌّ فِیْ کِتَابٍ مُّبِیْنٍ (۱۲/۱) میری زندگی میں قرآنی تصورات کے سوا مجھے کسی اور نظریہ نے کبھی اپیل نہیں کیا۔ قرآن سے ہر شخص کو

حقائق معلوم ہوتے ہیں جو بوجہ اپنی رفعت و نزاکت کے عقل کی رسائی سے بالاتر ہیں اور بالعموم فوق الفطرت کہلاتے ہیں۔ وحی و الہام دینیات کا سرچشمہ ہیں۔ او یقین و ایمان اس کے حاصل کرنے کا ذریعہ۔ عقلیات کی موشگافیاں اور کارگذا بھی کافی حیرت ناک اور قابلِ داد ہیں لیکن یہ مسلّم ہے کہ اس کا دورِ دورہ تحتا مادی طبقات تک محدود ہے۔ روحانیات کے اعلیٰ طبقات میں اس کے پر جلے ہیں عقلیات کے دو خاص شعبے ہیں۔ حکمت (سائنس) اور فلسفہ" (للبرنی)

اسی کتاب میں پروفیسر فلسفہ مولوی عبدالباری ندوی کی تحقیقات یہ ہیں بیکن کہتا ہے، فلسفہ کا قلیل اور سطحی علم الحاد کی طرف مائل کر دیتا ہے لیکن اس کا گہرا علم مذہب سے قریب کر دیتا ہے۔

نیوٹن کا اعتراف ہے کہ عالمِ فطرت کی یہ نیرنگیاں واجب الوجود (اللہ کے ارادہ کے علاوہ کسی اور شے سے ظاہر نہیں ہو سکتیں۔

ٹنڈل کہتا ہے۔ سائنس قریبی علل سے پردہ اٹھا سکتی ہے لیکن علل اولیٰ (اللہ) کا پتہ لگانا سائنس کے دائرۂ بحث سے قطعاً خارج ہے۔

ہکسلے امامِ حکمیات (سائنس) کہتا ہے کسی شے کی بھی کامل توجیہہ و تعلیل نہیں ہو سکتی۔

غرضکہ سائنس کا مذہب کی حد میں داخل ہونا اس سے زیادہ محال ہے جتنا ریل کا پانی میں، یا جہاز کا خشکی پر چلنا ہے۔ سائنس کا جو منتہائے پرواز ہے وہ مذہب کا نقطۂ آغاز ہے۔ سائنس کی بحث و تحقیق کا تعلق تمام تر فطرت (نیچر) کے واقعات و مشاہدات اور تجربات سے ہے۔ اور مذہب کی بنا یکسر فوق الفطر اور تجربہ و مشاہدہ کی دسترس سے ماوراء چیزوں پر ہے، مثلاً خدا، روح، حشر و نشر وغیر مذہب اسی ظلمات (جہل) میں اعتقاد و ایمان بالغیب کی مشعل سے رہنمائی کرتا ہے۔

چیزیں سمجھ میں آتی ہیں۔ بعض لوگ شرحِ صدر کے قائل نہیں۔ کہتے ہیں، نور چکھا دو، نور کا لڈو بنا کر کھلا دو۔ جو چیز بصیرت اور شرحِ صدر کی ہے، کہتے ہیں کہ بصارت سے دکھا دو۔ وہ جاہل ہیں، مادّی علوم تک ہیں مبادیات پڑھنے اور اُن پر ایمان لانے کے بعد صحیح ذوق اور خاص حال حاصل ہوتا ہے جس کے بعد چیزیں کھلنے لگتی ہیں۔ اسی طرح قرآنی آیات پڑھ کر وہ کیوں شرحِ صدر اور ذوقِ قرآنی کے قابل نہیں ہوتے۔ اس کے لئے اہلیت، کلچر اور پس منظر کی ضرورت ہے۔

علاوہ ازیں قرآنی آیات کے علم کے بعد بھی موقع محل کے لحاظ سے ایک حکیم کی طرح نسخہ ترتیب دینا پڑتا ہے۔ قرابادین پڑھنے اور مقویات سے واقف ہونے کے بعد جب تک مرض کی پہچان نہ ہو نسخہ مفید نہیں پڑتا۔ اس لئے حکمت کے تحت ہر محل پر آیات کا انتخاب اور وِرد ضروری ہے۔

## ۵۔ قرآن سے فیض و قوت

قرآن خوانی کے متعلق بخاری شریف کی حدیث ہے: مَنْ لَّمْ يَتَغَنَّ بِالْقُرْآنِ فَلَيْسَ مِنَّا۔ یعنے جو قرآن کو خوش آوازی (قرأت) سے نہ پڑھے وہ ہمارے طریق پر نہیں۔ قرآن قول ہے اور رسول اللہ صلعم عمل ہیں۔ اسماء کے مظہر ہیں۔ اُن آیات میں بہت زیادہ قوت ہے جس میں حضور صلعم کا یا قرآن کا ذکر ہو۔ سارے اولیاء اللہ متفق ہیں کہ حضور صلعم ہی قرآنِ مجسم ہیں۔ آیات کی مثال تار کی سی ہے۔ ولی اللہ کی تلقین جسے نسبت کہتے ہیں، ایسی ہے کہ بجلی کے تار کو بجلی کی رَو سے جوڑ دے جس کی وجہ سے فقط قلب میں نور آتا ہے اور قرآن کھلنے لگتا ہے۔ قرآن کی ہر آیت لاعلاج امراض کے لئے شفا ہے۔ اس کے علم و عمل کا تو بڑا درجہ ہے لیکن قرآن کو اللہ کا کلام مان کر پڑھنا، سننا، دیکھنا بلکہ رکھنا بھی باعثِ خیر و برکت ہے۔

سورۃ فاتحہ میں تسخیر و تکثیر ہے۔ حضرت محبوب الٰہی رح کو اس سے خاص ربط ہے۔

اس کی استعداد کے لحاظ سے فائدہ پہنچتا ہے۔

ایک دفعہ ایک نوجوان میرے پاس آیا۔ اور اُس نے خلافِ مذہب تصورات بیان کئے۔ میں نے کہا' اِن تصوّرات میں تو بہت وُسعت ہے اور اس کی مزید تفصیلات ہیں چنانچہ میں نے علمِ باطل کی تفصیلات جو بیان کیں تو وہ حیران ہوگیا اور مجھ سے کہنے لگا کہ اس کے باوجود آپ کی دینداری کا یہ رنگ کیسا' میں نے کہا' یہ تو آپ نے ایک پہلو دیکھا ہے' اس کے بعد میں نے باطل کی تفصیلات کے مقابلہ میں اسلام کے اعتبارات بیان کئے تو وہ بہت متاثر ہوا۔ اور کہنے لگا کہ اب تک میں اندھیرے میں تھا۔ اب نور وظلمت کے تقابل کے بعد حق کھل گیا۔

## ۴۔ قرآن کا فیضان

جب تک قرآن ہمارے جذبات' ادراکات' احساسات بلکہ روزمرّہ کے معاملات کے ساتھ مطابقت نہ کرے' اپیل نہ کرے اُس وقت تک قرآن کھلتا نہیں اور نہ اُس کی اہمیت وعظمت سمجھ میں آتی اور وہ نری عقیدت بنا رہتا ہے۔ قرآن کی ہدایت' نورانیت اور انشراح کی شانیں تو خاص طور پر وسوسوں' شکوک وشبہات میں کھلتی ہیں جس کے بعد سکون واطمینان نصیب ہوتا ہے۔ اس کا لطف تو روزمرّہ کے علم وعمل میں آتا ہے۔ لہٰذا چوبیس گھنٹے قرآن طاری رہے۔ قرآن مطلق علم دیتا ہے' لیکن افسوس ہے کہ لوگوں نے اسے مقید سمجھ رکھا ہے اس میں' ہر مرتبہ اور ہر محل کے لئے ہدایت ہے۔ موقع محل پہچاننا لازم ہے جو عارفِ کامل کا کمال ہے۔ دو دو مراتب بلکہ کئی کئی مراتب کے علوم بیک وقت یکجا جمع ہوتے ہیں۔ ایمان شرط ہے۔ محرومین نے قرآن کو حضورؐ کے زمانہ اور چند واقعات کی حد تک محدود کر دیا۔ حالانکہ قرآن زمان ومکان وصورت کے ساتھ محدود ومقید نہیں۔ ہر زمانہ کے لئے ہے۔ یہ اس کا دعویٰ ہے۔ یہ بات شرحِ صدر سے کھلتی ہے اور حکمت کے تحت سمجھ میں آتی ہے اور نورِ بصیرت حاصل ہوتا ہے جس کی وجہ سے تقیید سے ہٹ کر اطلاقیت کھلنے لگتی ہے اور سینکڑوں

مقطعات کا علم قرآنی آیات کے تحت ملا۔ یہ سب علم چند نشستوں میں عطا ہوا۔ ایک ایک حرف کا علم پانچ پانچ، دس دس منٹ میں ملا۔ حالانکہ عمریں صرف ہوتی ہیں، ایک حرف کا علم نہیں ملتا۔ یہ اللہ کا فضل ہے۔

اوراد کی کتابوں میں جو اوراد دیکھنے میں آئے وہ عام طور پر قرآنی آیات پر مشتمل نہیں ہیں۔ مؤلفین کے اپنے الفاظ میں پائے گئے لیکن اپنا تو یہ ذوق ہے کہ جو کچھ بھی لیں قرآن سے لیں۔ یقین ہے کہ اکابر کو مقطعات کا علم تھا جو ضبطِ تحریر میں نہ آنے کی وجہ سے محفوظ نہ رہ سکا۔ کل حروف اٹھائیس ہیں جن میں قرآن لکھا گیا ہے۔ خیال آیا کوئی ایسی آیتیں ملیں جن میں جملہ حروف ہوں۔ بفضلہ ہمارے اوراد کی کتاب "حزب اللہ" میں ساتواں حزب مرتب ہو گیا جس کے ظاہری و باطنی اعتبارات سے اندازہ ہوگا کہ مسلمانوں کے لئے کافروں کے مقابلہ میں کیا رحمت و حفاظت ہے۔

## ۹۔ قرآن خوانی کے دو طریقے

قرآن خوانی کے دو طریقے ہیں۔ ایک یہ کہ مسلسل اوّل سے آخر تک تلاوت کریں۔ گویا پورے اسلحہ خانہ میں داخل ہوئے، دوسرا طریقہ یہ کہ اس کی خاص آیتوں کا مقصد اور محلِ استعمال معلوم کر کے پڑھیں۔ یہ ایسا ہے کہ گویا اسلحہ خانہ سے اپنے کام کی چیزیں بندوق، تلوار، چھری حاصل کی اور شکار میں کام لیا۔

## ۱۰۔ اذکار کی گنتی

سارا قرآن "ذکرُ اللہ" ہے۔ قرآنی اصول یہ ہے کہ جو جتنا زیادہ ذکر کرے گا اتنی فلاح حاصل ہوگی لیکن تعداد میں بھی حکمت ہے۔ (۷۰) کا عدد کُن کا۔ (۷۷) متولی کا۔ (۶۶) وکیل کا۔ (۱۳) کا عدد جلالی ہے۔ (۱۴) کے عدد میں نبوت کے اعتبارات غالب ہیں۔

دین میں نفسیات اور استعداد کا بڑا لحاظ ہے لیکن بعض مرشدین نفسیات کا مطلق لحاظ نہیں رکھتے۔ ذوقِ ایمانی پیدا کرنے کے بجائے اذکار کی گنتی پر زور دیتے ہیں۔

سورۂ اخلاص میں تفرید و تجرید ہے۔ حضرت پیران کلیرؒ کو اس سے خاص ربط ہے۔ چنانچہ محبوب الٰہیؒ کو محبوب بنا کر حق تعالیٰ نے خلق کی طرف واپس فرمایا اور پیرانِ کلیرؒ کو تفرید میں اپنے لئے منتخب رکھا۔

**۶۔ قرآن، ہر آن**

ایک صاحب نے سلسلہ کی تعلیم کی تدوین کا خیال ظاہر کیا تو فرمایا اسلام کی تعلیم تیس (۳۰) پاروں میں محفوظ و مُدَوَّن ہے۔ اسی کو موقع محل کے لحاظ سے تازہ بہ تازہ پیش کریں لیکن اگر ایک کورس بنا کر رٹا یا کریں تو وہ حافظہ کی چیستریں کررہ جاتی ہے۔ بنوٹ اور شطرنج کی طرح ہر وقت نئی چال چلیں تو بے زاری نہیں ہوتی۔ ہر وقت نیا علم نیا بیان آتا رہے تو دلچسپی رہتی ہے ورنہ لوگ بے زار ہو جاتے ہیں۔ آپ ہی فرمایئے کہ قرآن میں کیا حضورؐ کو یہ تعلیم نہیں دی گئی کہ اسے یاد کرنے کی فکر نہ کرو یاد کر کے مت رکھو۔ ہم خود آپ کو علم و بیان دیں گے۔ بلکہ بھول جائیں تو اس سے بہتر دیں گے لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ الخ (۲۹/۱۷) مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ اَوْ مِثْلِهَا۔ (۱/۳)

**۷۔ قرآن کی جاذبیت**

میرے ماموں حافظ نور الحسن صاحب بہترین خوش الحان قاری تھے۔ آواز بہت بلند، اس میں غیر معمولی اثر و کشش تھی مسلمان تو مسلمان ہندو تک متاثر ہوتے۔ بہت سے راجے، مہاراجے اُن کو بلاتے۔ ایک ریاست کا راجہ سورۂ رحمٰن سن کر ایک ہزار کا نذرانہ پیش کیا کرتا تھا اور کہتا تھا قرآن سن کر مجھے بے حد سکون ملتا ہے۔ دوسرے راجہ بھی چار چار پانچ پانچ سو نذرانہ دیا کرتے۔ محض قرآن کے اشتغال اور حُسنِ صوت کی حفاظت کی خاطر ساری عمر شادی نہیں کی۔ جب وہ مسجد میں قرآن سناتے تو بعض غیر مسلم اجازت لے کر سیڑھیوں کے پاس بیٹھتے اور بہیلیاں چھتوں پر جانمازیں بچھا کر شریکِ تراویح ہو جاتیں۔

**۸۔ حروفِ مقطعات**

فرمایا۔ اللہ کا شکر ہے کہ چند دنوں میں چودہ حروف

لوگ گائے کے گوشت وغیرہ سے پرہیز کرتے ہیں لیکن میں کسی چیز کا پرہیز نہیں کرتا۔ بلا اہتمام پڑھنے پر بھی بفضلہ حفاظت ہوتی ہے۔

**۱۳۔ وِرد کی بیاٹری** ایک صاحب کی انتہائی مالی پریشانیوں میں اُن کے لڑکے کو ایک وِرد عطا فرمایا اور افشا نہ کرنے کی تاکید فرمائی۔ افشا کریں تو لوگ وسوسے ڈالتے ہیں۔ قلب کی تختی صاف رہنا بہتر ہے۔ دِل میں عقیدہ ہو تو اس کی مثال عمدہ زرخیز زمین کی سی ہے۔ عقیدہ نہ ہو تو کنکریلی پتھریلی زمین میں کاشت ناممکن ہے۔ عمل کی جان نسبت اور وسیلہ ہے۔ قرآن میں ہے۔ توبہ و استغفار سے کارسازی کے بادل قوت سے اٹھتے ہیں۔ درود پڑھ کر رسول اللہؐ کی نسبت اور وسیلہ سے اپنا معروضہ اللہ کی درگاہ میں پیش کریں تو اللہ کی طرف سے منظوری کی تجویز حضورؐ کے وسیلہ سے صادر ہوگی۔ میں نے آج تم کو وِرد کی بیاٹری دی ہے، بیاٹری تمھارے زیادہ پڑھنے سے چارج ہوگی۔ جتنا زیادہ پڑھو گے اتنی قوت بیاٹری میں آئے گی۔ نسبتِ محمدیؐ بڑی چیز ہے، طاق عدد محبوب ہے۔ اس سے باطل میں کام نہ لیں کیونکہ حق باطل کی تائید نہیں کرسکتا۔ حق نور ہے۔ وہ آتے ہی باطل کی ظلمتیں کافور ہوجاتی ہیں۔ اللہ محمدؐ کا نام دیکھنے میں مختصر ہے، اثر میں بڑا۔ کیفیت پر جائیں، کمیت پر نہیں۔

**۱۴۔ اجازتِ اوراد** اوراد کی اجازت ایسوں کو دینا چاہیئے جن کا پس منظر ہو۔ نااہل کو نعمت دینا ناقدری ہے۔ نعمت چھن جانے کا اندیشہ ہے۔ جواب طلب ہوسکتا ہے۔ ناقدرے کے لئے دعا بھی نہ کریں۔ دنیا میں بھی ہم کسی کی سفارش اس وقت تک نہیں کرتے، جب تک کہ اس عہدہ دار سے اس شخص کا ربط ٹھیک نہ ہو۔ ورنہ نقصان پہنچ جاتا ہے۔ اگر کوئی شائق، مخلص ہو تو اوراد بتانے میں بخل نہ کریں۔

اور ایسی پابندیاں بتاتے ہیں کہ مرید گھبرا کر پڑھتا نہیں بھاگ جاتا ہے۔ ہر ایک کی نفسیات کا لحاظ کرتے ہوئے بتانا چاہیئے۔ جتنا بن پڑے، جب بن پڑے، جس حال میں بن پڑے پڑھو۔ کیونکہ ذِکرُ اللہ غیر ذِکرُ اللہ سے بہتر ہے۔ حکم ہے۔ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ (۲۹/۱۴) یعنے جتنا ممکن ہے قرآن سے پڑھو۔ یہاں تک کہ قرآن بیٹھے لیٹے پڑھنے کی اجازت ہے۔ اسلام دینِ رحمت ہے عملی ہے۔ اللہ بندہ کی آسانی چاہتا ہے۔ بیماری میں روزوں تک کی قضا کی اجازت دیتا ہے۔

## ۱۱۔ مختلف آیات کا ورد

آج کل معاندین و مخالفین کے مقابلے کے لئے مختلف محاذ پر مختلف آیات کا ورد حسبِ منشائے قرآن کرنا چاہیئے اور اس کی بصیرت ہونی چاہیئے۔ شکستہ دل، رقیق القلب لوگوں کو آیۃ کریمہ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّىْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ پڑھنا چاہیئے۔ اسی طرح ایک جماعت تحفظ کے لئے، ایک معرکہ کے لئے، ایک نصرت و فتح کے لئے خاص آیتیں پڑھے۔ رات کا وقت بہتر ہے۔ علاج کے اور بھی طریقے ہیں۔ مالدار لوگ مصیبت زدوں کی مالی امداد کریں۔ دوسرے صبر کی تلقین کریں کہ دل اسلام سے بندھا رہے۔ ہر ایک اپنا فرض ادا کرے۔

## ۱۲۔ جلالی اوراد

میں مختلف جلالی آیات پڑھتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ اس کے آثار جلد ظاہر فرماتے ہیں۔ میں دیکھ کر گذر جاتا ہوں، پیچھے نہیں پڑتا۔ یہی اصول ہونا چاہیئے۔ جلالی اوراد پڑھنے سے حرارت محسوس ہوتی ہے لیکن اللہ محفوظ رکھتا ہے۔ ابھی میں نے ایک وِرد پڑھا۔ دوسرا کوئی ہوتا تو ممکن ہے بے قابو ہو جاتا۔ کیوں نہ ہو اگر بہتر سے بہتر بندوق بھی ہو تو گولی چلانے پر نال پر گرمی آنا لازمی ہے۔ بعض لوگ جلالی اوراد پڑھتے ہیں، اس کے اہتمام اور اپنی صلاحیت سے واقف نہیں ہوتے۔ اس لئے نقصان اٹھا کر مجذوب ہو جاتے ہیں جلالی اوراد کی حرارت کی وجہ سے

امامِ اعظمؒ نے فرمایا۔ اگر میں کسی میں ۹۹ حصے کفر دیکھوں اور ایک حصہ اسلام دیکھوں تو میں اُسے مسلمان سمجھوں گا۔ کافر کا نقطۂ نظر بھی جس قدر اسلام سے قریب ہوگا اُس قدر اُسے فائدہ پہنچے گا۔

## ۲۔ روح و قلبِ اسلام

جس طرح روح و قلب پر انسانی زندگی کا مدار ہے اسی طرح توحید و رسالت پر ایمانی زندگی کا مدار ہے توحید و رسالت دین کے روح و قلب ہیں یا ان کے بغیر دیگر ارکان کی ادائی جسد بے روح کی مثال ہے۔ دین کے دائرہ میں دوسری بڑی سی بڑی کوتاہیاں ہوں، قصور ہوں، گناہ ہوں، تو ان کی مثال زندہ انسانی جسم میں بیماریوں کی سی ہے۔ جب تک روح و قلب باقی ہیں اُسے مُردہ نہیں کہا جا سکتا۔ اور ظاہر ہے کہ بیمار، ہزاروں مُردوں سے بہتر ہے۔

## ۳۔ اختلاف رحمت

بعض اکابر میں نقطۂ نظر کا فرق شدید اختلاف کی حد تک تھا۔ لیکن اس کو ہم نفسانیت پر محمول نہیں کر سکتے، احتیاط چاہیئے۔ للّٰہیت کے تحت بھی ایسے اختلافات ممکن ہیں۔ اگر کسی دو اشخاص کے نقطۂ نظر بہت بلند ہوں اور دونوں ایک دوسرے کے نقطۂ نظر کو سمجھ لیں تو صاف کہنا پڑے گا کہ دونوں برسرِ حق ہیں۔ یہ عام خیال کہ حق پر صرف ایک ہی ہو سکتا ہے، دونوں نہیں ہو سکتے، بہت غلط ہے۔ حقیقت میں بہت جامعیت، رحمت و وسعت ہے۔ اس لئے اگر وہ دائرۂ حق کے اندر رہ کر اپنے نقطۂ نظر کے لحاظ سے ایک استنباط کر رہا ہے تو وہ حق پر ہے، باطل پر نہیں۔ دین میں نیت صحیح کے تحت اجتہادی غلطی اور اختلاف کو رحمت بتایا گیا۔ اجتہاد میں اختلافِ رائے کی صورت میں کسی ایک رائے کے خطا یا صواب ہونے کا ظنِ غالب ہو سکتا ہے اس اختلاف کی نوعیت حق و باطل کی نہیں ہوتی۔ اگر اجتہاد کو روا نہ رکھا جائے تو دین کا

## ۱۵۔ قرآن وحدیث

پورا اسلام قرآن میں مرتکز ہے۔ ہر مسئلہ میں قرآن اپنا آپ مفسر ہے۔ تاریخ اور فقہ کے لئے نماز وغیرہ کے تفصیلی مسائل میں البتہ حدیث کی ضرورت ہے۔ ورنہ دین کے سب اصول وعقائد قرآن مجید میں محفوظ ہیں۔ قرآن نور ہے۔ آنکھ شرط ہے۔ اندھا کیا دیکھے۔

قرآن کے مقابل حدیث لانے کی کبھی جراءت نہ کریں۔ حدیث کی روایت قبول کرنے کے بارے میں حضرت عمرؓ انتہائی احتیاط کو لازم سمجھتے تھے۔ اکابر میں بھی نقاطِ نظر کا اختلاف رہتا ہے۔ کوئی حدیث پر زور دیتا ہے، کوئی قرآن پر۔ ایک اہلِ قرآن وہ افراطی ہیں کہ حدیث کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ ہم ان میں نہیں۔ اسی طرح اولیاء اللہ کے کلام میں بھی الحاقات ہیں۔ حضرت غوث اعظمؓ کی بہت سی تحریرات ایک صدی بعد کی مرتب کردہ ہیں۔ جن میں بہت سے اضافے کئے گئے ہیں۔ اسی لئے ہر بات میں قرآن کو مقدم رکھنا چاہیئے کہ اس میں کسی کو اختلاف کی گنجایش نہیں اور نہ اس میں کوئی رد و بدل ہو سکتا ہے۔

## ۱۶۔ قرآنی نقطہ نظر

اصل اصول قرآنی نقطۂ نظر کا قیام ہے جس سے جملہ چیزیں کھلنا شروع ہوتی ہیں۔ لوگ اسے حاصل کرنے کے بجائے خارجی حالات اور اپنے نقطۂ نظر سے قرآن کو سمجھنا چاہتے ہیں، یہی غلطی ہے۔

یاد رکھو! حقیقت ایک دائرہ ہے جس میں بہت وسعت ہے۔ اسے محدود کرنا سخت جہالت ہے۔ دائرہ کے (۳۶۰) درجے ہوتے ہیں کسی کی نظر اس حقیقت کے ایک درجہ پر ہے تو کسی کی ۹۰ درجہ پر۔ صرف مدارج کا فرق ہے۔ اسی طرح آدمی ایک ہے۔ کسی نے ہاتھ دیکھا، کسی نے پیر یا چہرہ۔ لیکن دیکھا ایک آدمی ہی کو۔ اسی لئے اسلام کے اندر اگر کسی کا نقطۂ نظر قایم ہو جائے تو اس وسعت و رحمت کے لحاظ سے اس کو اسلام سے خارج نہیں کہا جا سکتا۔ چنانچہ حضرت

نے مریدی کو جلبِ منفعت کا ذریعہ بنالیا اور اس رسم کو لازمی قرار دیا۔ لہٰذا مرشدین کو آج کل کوئی پیشہ اختیار کرنا چاہیئے تاکہ دین بدنام نہ ہو۔

اصل میں مقصود بالذات اللہ، رسولؐ کی محبت اور اُس کی اشاعت ہے۔ اس کے لئے پیری مریدی کی بھی شکلیں ہیں لیکن حضور انورؐ کی زندگی پر نظر کریں تو معلوم ہوگا کہ حضورؐ عام بیعت نہیں لیتے تھے۔ خاص موقعوں پر بیعتِ جہاد لی۔ ورنہ عوام تو کلمہ پڑھتے مسلمان بنتے۔ پیالہ کی شرط نہ تھی۔ علاوہ ازیں ہر زمانہ کا ایک اقتضا ہوتا ہے۔ موجودہ زمانہ کا مجھے یہ اقتضا معلوم ہوتا ہے کہ تبلیغ و تلقین کے لئے مریدی کا لزوم نہ ہو کیونکہ بعض پیروں کے طریق کار کی وجہ سے یہ طریقہ آج کل بہت بدنام ہو گیا ہے۔ اس لئے میں نے طے کیا ہے کہ اس زمانہ کے اقتضا اور مصلحتِ دینی کے مدنظر، تعلیم و تبلیغ کو اس کا پابند نہ بناؤں۔ میرے خیال میں اس زمانہ میں تقریر اور ملاقات سے زیادہ مفید تصنیف و تالیف ہے کہ ٹھنڈے دل سے غور کر کے ہر شخص رائے قائم کر سکتا ہے۔ لہٰذا اللہ، رسولؐ کی محبت تصنیف و تالیف کے ذریعہ عام کریں جس میں وسعت ہے، برکت ہے، فیض ہے۔ جس کے دل میں اُس سے محبت پیدا ہو، وہ ہمارا بھائی ہے، مرید ہے۔ ہمارا مقصود حاصل ہو گیا۔ مرید کہلانا اور خود کو مرشد جتانا اور جتھا بنانا ضروری نہیں۔ وَکَفٰی بِاللّٰہِ عَلِیْمًا (پ ۵) اللہ کا علم کافی ہے۔ لہٰذا اپنا اصول تعمیم ہے، تخصیص نہیں۔

ناچیز نے عرض کیا۔ کیا آپ سرِ ظہور کی تلقین کے لئے بھی بیعت نہ لینگے۔ فرمایا، یہ سب تخیّلات ہیں۔ کیا سرِ تخلیق، سرِ ظہور صرف کہنے سے سمجھ میں آتے ہیں۔ یا یہ شرحِ صدر، علمِ لدنی، نورِ ربانی، سے کھلتے ہیں۔ یہ تو در اصل کھلنے کی چیزیں ہیں کہنے کی نہیں۔ اکابر کے حکمِ امتناعی کے خلاف بعض مشائخ ہر جاہل کے کان میں سرِ تخلیق کہتے ہیں نتیجہ اصلاح کے بجائے نہ صرف حیرانی، پریشانی، بلکہ کفر و نفاق و فساد ہوتا

دائرہ محدود ہو کر رہ جائے گا۔

## ۱۷۔ میلاد شریف اور مرشد کے معنے[1]

فرمایا۔ رسول دراصل علم الٰہی کے ذریعہ کو کہتے ہیں۔ اللہ نے رسول ؐ کے واسطے سے قرآن دیا۔ قرآن سے رحمت کے آثار آ رہے ہیں میلاد شریف کے معنی یہ ہیں کہ ہم رسول اللہ ؐ کا علم بیان کرتے ہیں۔ عمل بیان کرتے ہیں۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ خاص ماہ ربیع الاوّل میں میلاد شریف رکھتے ہیں کہ حضور جو علم الٰہی کی تجلی ہیں اس مہینہ میں اس عالم میں تشریف لائے۔ ورنہ رات دن دوسرے مہینوں میں بھی رکھ سکتے ہیں۔ حضور ؐ کے علم کو حاصل کرنا، تقسیم کرنا اور اشاعت کرنا یہی اصل میلاد ہے۔

مرشد کی بیعت کے معنی ہاتھ کان کی مریدی نہیں بلکہ مرشد سے مراد علم قرآنی ہے۔

## ۱۸۔ پیری مریدی کے متعلق اپنا مسلک

پیری مریدی کے مسلک کے متعلق مجھے اکابر پر اعتراض نہیں۔ اُن سے توافق ہے متخالف نہیں۔ کسی ولی اللہ سے ربط پیدا کرنے کے لئے مریدی مستحسن ضرور ہے۔ ولی کی پہچان یہ ہے کہ اس کی صحبت میں قرآن کھلے۔ اللہ رسول ؐ کی محبت بڑھے اور علم و عمل کی اصلاح ہو۔ خلافت و اجازت کے لئے بیعت ضروری ہے۔ تعلیم و تربیت کے لئے لازمی نہیں۔ بعض مثالیں ایسی ہیں کہ کسی عارف کی کتاب پڑھنے سے ربط پیدا ہو گیا اور قرآن کھلنے لگا۔ بعضوں کو محض کسی مزار پر حاضر ہونے سے قرآن سے معنوی ربط پیدا ہوا اور قرآن کھلنے لگا۔ بعضوں کو تو بغیر پڑھے اور بغیر کسی مزار پر گئے علمِ لدنّی عطا ہوا اور ایسا شرحِ صدر ہوا کہ معارف قرآنی کھل گئے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پیری مریدی بعضوں کے لئے خاص اعلےٰ فیضان کے لئے بھی لازمی نہیں۔ عوام کا خیال ہے اور واقعہ بھی ہے کہ بعض مرشدین

## ۲۰۔ حضرت کمال اللہ شاہ رحمۃ اللہ علیہ کا وصال

## حضرت مولٰنا محمد حسین شاہ رحمۃ اللہ علیہ سجّادہ نشین

حضرت مولانا محمد حسین شاہ رح کا اپنی طرف سے حضرت غوثی شاہ رح کو سجّادہ نامزد کرنا

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

شمس العارفین، زبدۃ الصادقین، پیر و مرشد حضرت الحاج شاہ کمال اللہ قادری چشتی نقشبندی قدّس سرّہٗ نے بتاریخ ۲۹ ربیع الثانی ۱۳۵۱ھ یوم پنجشنبہ بوقتِ مغرب بمقام سرائے الٰہی۔ الٰہی چمن، واقع محلہ کاچی گوڑہ، حیدرآباد دکن وصال فرمایا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡن۔ حضرت علیہ الرحمہ کے سلسلہ میں خلیفۂ اول ہونے کی حیثیت سے پیر بھائیوں کی عام خواہش اور برادر مکرم الحاج غوثی شاہ صاحب خلیفہ حضرت علیہ الرحمہ کا خاص اصرار تھا کہ میں حضرت علیہ الرحمہ کے بعد سجادگی کی خدمت انجام دوں لیکن سلسلہ کی ضروریات اور انتظامات کے مدنظر یہ بہتر معلوم ہوا کہ سجادگی کی خدمت برادرم الحاج غوثی شاہ صاحب کے تفویض کی جائے۔ لہٰذا میں اپنی تحریک اور پیر بھائیوں کی تائید سے برادرم الحاج غوثی شاہ صاحب کو سجادہ قرار دے کر اطلاع عام کے واسطے اس کا اعلان کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ اس انتظام کو قبول فرمائے اور اس میں خیر و برکت دے۔ آمین۔ ثم آمین۔ بفضلِ حبیبِ ربّ العالمین۔ والسلام۔

شرح دستخط حضرت مولانا محمد حسین صاحب ناظم عدالت دیوانی سجّادہ و خلیفہ
۴ جمادی الاول ۱۳۵۱ھ روز سہ شنبہ

شرح دستخط حضرت غوثی شاہ صاحب

کاتب: حضرت مولانا الیاس برنی صاحب (خلیفہ اول مولٰنا محمد حسین شاہ رح)

ناقل: خادم محمد عبدالحلیم الیاسی (یہ اعلان مقامی اخبار رہبر دکن صحیفہ وغیرہ میں شائع ہوا)

ہے۔ دعوتِ قرب عام نہیں، خاص ہے۔ اس کے لئے بِاِذْنِہٖ کی شرط ہے لیکن ستم یہ ہے کہ اگر قرآن کے مطابق حقیقتِ محمدیؐ بتائیں رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ کا علم دیں اور فرش سے عرش تک محمدؐ نظر آنے لگے تو بعض لوگ اس پر اعتراض کرتے ہیں، شرک کہتے ہیں۔ لہٰذا محبتِ رسولؐ کی عام تعلیم اور خاص اشارے کافی ہیں جن سے توحید مطلق انعام کھل جاتی ہے۔

## ۱۹۔ سجادگی و خلافت

اصل خلافت و سجادگی علم و عرفان کی ہوتی ہے۔ اصل چیز فیضانِ علم اور تعلیم و تبلیغ کی برکتیں ہیں جسے اللہ خود ظاہر فرماتا ہے، اللہ کا علم کافی ہے۔ اشتہار سے کیا حاصل۔ سجادگی و خلافت کا منشا انتظام یا تبلیغ ہوتا ہے۔ خلافت میں سب خلیفہ برابر ہیں۔ چھوٹائی بڑائی کا خیال جہالت و تنگ نظری ہے جو سلوک کے منافی ہے۔ اللہ کو معلوم کون بڑا، کون چھوٹا۔ البتہ علم و عمل کے لحاظ سے تبلیغ میں آثار آئیں گے۔ قدرت ظاہر کر دے گی کہ کون بڑا ہے دوسری چیز انتظامی ہے۔ مثلاً جاگیر، صندل، عرس کے انتظامات۔ اگر خاندانی آدمی اور انتظامی صلاحیت رکھتا ہو اور خلیفہ بھی ہو تو اسے ترجیح دی جائے گی۔ اگر خلیفہ ہے لیکن انتظامی صلاحیت نہیں تو اصولاً انتظامی صلاحیت والے کو ترجیح دی جائے گی کیونکہ تبلیغ سے بڑھ کر انتظام و اتحاد کا منشا پورا ہو سکے گا۔

سجادہ صاحب کو چاہیئے اعلیٰ روحانی علم حاصل کریں۔ عرس کو رسمی نہیں، بلکہ لوگوں کے مفاد کا ذریعہ بنائیں۔ عرسوں کی اصلاح کریں اچھی تقریریں دلائیں عمدہ قوالیوں کا انتظام کریں سلسلہ کی تصانیف کی حفاظت و اشاعت کریں۔ چھوٹے چھوٹے تعلیمی پمفلٹ ہزاروں کی تعداد میں تقسیم کریں۔ عرس کی دعوتوں وغیرہ میں نظم و ضبط برقرار رکھیں

پیدا نہ ہوگا تنقیدی و اجتہادی قوت سلب ہو جائے گی محض آخذین کر رہ جائے گا نئی چیزیں پیدا کرنے والا اور دین میں جان ڈالنے والا نہ بن سکے گا۔ کیا وہ استاد اچھا ہے جو محض نقل کرنا سکھائے یا وہ جو آزادی رائے قائم رکھے اور قوت تنقید پیدا کر کے اپنے سے بہتر شاگرد بنا دے۔ مرشدین کی صحبت کا منشا کیا ہونا چاہیئے۔ قرآن تو تدبّر و تعقل پر زور دیتا ہے۔ بڑے مُفکّرین بنانا چاہتا ہے۔ نقل کا بھی ایک درجہ ہوتا ہے جس کے لئے بعض مناسب ہوتے ہیں نہ کہ سب۔

## ۲۴۔ مرید کا اختلاف

ایک دفعہ بدر کے قیدیوں کو حضورؐ فدیہ لے کر چھوڑنا چاہتے تھے لیکن حضرت عمرؓ کو اختلاف تھا چنانچہ وحی حضرت عمرؓ کی رائے پر اُتری۔ ایک دفعہ مہر کے تعین کے بارے میں ایک بڑھیا نے حضرت عمرؓ سے اختلاف کیا اور حضرتؓ نے مان لیا۔ اس سے مرید کے اختلاف اور اُس کی صحیح رائے کی اہمیت و لحاظ اور مرشد کی وسیع القلبی کا پتہ چلتا ہے نمونہ ملتا ہے۔

## ۲۵۔ صحبتِ شیخ

یاد رکھو! صحبتِ شیخ کے بغیر قرآن نہیں کھلتا۔ اعلیٰ اعتبارات سمجھ میں نہیں آتے۔ صحبت کیمیا اثر ہوتی ہے اسی لئے حکم ہے "کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ (پ ۱۱)" یعنے سچوں کے ساتھ رہو۔ صحبت کی اتنی اہمیت نہ ہوتی تو صحابہ کا مرتبہ اتنا بلند کیوں ہوتا کہ غوث اقطاب بھی واقعتہً اپنے کو اُن کی جوتی کے تسمہ کے برابر نہیں سمجھتے کیونکہ حضورؐ کو اس عالم میں آنکھوں سے دیکھ کر دلوں میں پایا تھا۔ صحبت لازمی چیز ہے۔ نااہلوں کو نہ صحبت ہے نہ صلاحیت و استعداد ہے اور نہ بے ادبی کی وجہ سے توفیق ہے۔ لیکن غوثیت، قطبیت، و ولایت کی علی الشانیں سمجھنا چاہتے ہیں۔ صادقین کی صحبت اور خدمت سے استعداد بنتی ہے۔ استعداد نہ ہو تو صحبت کا علمی فیض جاری

## ۲۱۔ تحتِ امر پیری مریدی

ناچیز نے عرض کیا۔ حضرت غوث اعظمؓ نے پیری مریدی کی۔ فرمایا۔ حضرت نے ماموریت کے تحت یہ کام انجام دیا۔ اولیاء اللہ میں بعض ایسے بھی گذرے ہیں جنھوں نے باقاعدہ پیری مریدی نہیں کی الّا اس کے کہ جو اس بات پر مامور ہوئے۔ جو اپنی ارادت و تدبیر سے جتھا بندی کرتے ہیں۔ ان کے کام زیادہ مقبول و محکم نہیں ہوتے۔ ایک تو عقل و تدبیر کے ذریعہ کام پھیلانا ہے۔ دوسرے تحتِ امر کام کرنا ہے۔ پہلے میں کام کے پھیلنے کو دھوکا رہتا ہے، کام نہیں ہوتا۔ دوسرے میں بے ارادتی اور ماموریت میں کام ہوتا جاتا ہے بے سروسامانی اور تھوڑی سی سعی میں بھی وہ برکت ہوتی ہے کہ دنیا دنگ رہ جاتی۔

## ۲۲۔ برادرانہ اساس پر پیری مریدی

آج کل پیری مریدی میں تحکم نہیں چل سکتا۔ بلکہ یارانہ، برادرانہ اساس پر پیری مریدی کا فیض ہو سکتا ہے۔ وہ مرشدین شاذ ہیں جو تحتِ امر تقدیر تحکم، تسلط رکھتے تھے۔ عام طور پر اپنی خرابیاں زیادہ ظاہر کر دیں تاکہ غلط فہمی نہ رہے اس کے بعد جو ٹکے پکا ہو گا۔ مرشد جتنا زیادہ شیطان کے داؤ پیچ سے واقف ہو گا اس کا مقام اتنا ہی بلند ہو گا یا تو مرشد شر کی خاردار وادیوں سے گذرا ہو۔ یا علم الیقین کی حد تک شر اور شیطان کے متعلق اس کا علم ہو۔ ایسی صورت میں وہ گنہگار مریدوں سے مجانست حاصل کر سکتا ہے بلکہ مرید بھی اپنے ساتھ اس کی مثلیت بلکہ فوقیت کے علم کے قائل ہوں گے اور اپنا ہمدرد سمجھیں گے۔

## ۲۳۔ موجودہ مرشدین و مریدین

آج کل اکثر مرشدین اپنے مریدین سے غیر مشروط اطاعت چاہتے ہیں وہ زبان نہ کھولیں نتیجہ نفاق ہوتا ہے۔ اُن کی آزادیٔ رائے سلب ہو جاتی ہے بنیادی چیزوں کی حد تک زبان نہ کھولنا بجا ہے۔ لیکن اگر ہر چیز میں یہی عمل ہو تو کوئی تر

نقشبندی لوگ سمجھے جاتے ہیں۔ اُن کے پاس تصورِ شیخ لازمی ہے۔ چاہے اُس شیخ کو اسماء سے مناسبت ہو یا نہ ہو لیکن ان اسماء کے ورد کے موقع پر شیخ کو ان کا فیضان یا مظہر مانتے ہیں اور مستفید ہوتے ہیں۔ قادریوں چشتیوں میں تصورِ شیخ کی تعلیم پر زور نہیں اصل راز یہ ہے کہ اگر اللہ کی طرف کوئی شخص بخوبی توجہ نہ کر سکے تو وہ شیخ کا واسطہ اختیار کرتا ہے۔ اسی بنا پر نقشبندیوں کے پاس فنا فی الشیخ، فنا فی الرسول، فنا فی اللہ کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ اگر کسی کو ٹھنڈک مطلوب ہو تو وہ گلاب یا سبزہ زار کو دیکھتا ہے۔ ان کے تصور و دید سے بھی ٹھنڈک حاصل ہوتی ہے جیسے کسی مکروہ منظر سے کراہت ہوتی ہے ویسے ہی اچھے منظر سے فرحت ہوتی ہے۔ اس اصول کے تحت تصورِ شیخ کیا جاتا ہے کہ وہ خاص مناسبتوں کی وجہ سے اسمار الٰہی کا مظہر ہے۔ لیکن اگر طالب کو واقعی کسی اسم سے طبعی مناسبت ہو اور وہی ورد کرے تو بہت زیادہ فائدہ پہنچ جاتا ہے۔

## ۲۸۔ ادبِ شیخ

پہلے کے مرشدوں کا مریدوں پر بڑا رعب و اثر رہتا تھا آجکل کے مرید تو مرشدوں کو اپنا ممنونِ احسان سمجھتے ہیں، کلچر ہے نہ ادب۔ محض علم سے کلچر نہیں آتا۔ علم اور کلچر جمع ہوں تو کیا کہنا! حضرت خواجہ بدرالدین رحمۃ حضرت بابا فریدالدین گنج شکرؒ کے داماد اور خلیفہ تھے۔ آپ کے وصال کے بعد پیر تعلیم تھے حضرت محبوب الٰہیؒ ان کا اتنا ادب فرماتے کہ آپ کی زندگی میں خلافت حاصل کرنے کے باوجود چار پانچ برس تک کسی کو مرید نہیں فرمایا۔ ان لوگوں کا جہاں جمال یہ تھا، جلال کا بھی کیا کہنا۔ اللہ اکبر۔

ایک دفعہ حضرت خواجہ بدرالدینؒ اللہ اللہ کر رہے تھے، حضرت بابا فریدؒ نے تین مرتبہ آواز دی تیسری آواز پر کہا، میں اللہ اللہ میں محو تھا۔ بابا صاحبؒ نے فرمایا اب تک تو نے جو کچھ حاصل کیا، محو ہو گیا، اب کل سے پھر اندھیرا نہ کر۔ روتے روتے بُرا

نہیں ہوتا تو عقیدہ کا فائدہ پہنچتا ہے۔ انبیاء و اولیاء کی محبت، ادب و عظمت سے توفیق عطا ہوتی ہے۔

## ۲۶۔ تصوّرِ شیخ اور تصوّرِ رسول ﷺ کی نعمت

فرمایا، ایک دوست کو تصوّرِ شیخ حاصل ہے۔ ہم نہ اس کا انکار کریں نہ اقرار۔ البتہ یہ چیز ہماری طبیعت کے مناسب نہیں۔ ایک دفعہ ان کے شیخ نے ایک آیت کی زکوٰۃ بتائی، انھوں نے مجھ سے آکر کہا، اس ورد کو شروع کرتے ہی آپ کا تصوّر بندھ گیا۔ میں نے کہا، اب یہ چیز سرکاری ہے۔ من اللہ ہے بے ارادی میں آئی ہے تو اس کے آثار بہت تو ی ہوں گے۔ تو اپنی طلب بھی محمود ہے لیکن اس کے آثار اتنے قوی نہیں ہو سکتے۔

تصوّرِ شیخ کے متعلق اختلاف ہے۔ بعض اس کو مغائرِ اسلام سمجھتے ہیں۔ لیکن قرآن میں ہے۔ وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ ...... وَلَا تَعْدُ عَيْنَاكَ عَنْهُمْ (پ ۱۵ ع ۱۶) ترجمہ: تو اپنے کو اُن لوگوں کے ساتھ مقید رکھ جو صبح شام اپنے رب کی عبادت محض اس کی رضا جوئی کے لئے کرتے ہیں۔ تیری آنکھیں اُن سے ہٹنے نہ پائیں۔ اس سے صحبتِ شیخ، تصوّرِ شیخ اور فنافی الشیخ کی سند ملتی ہے، یعنی اہل اللہ پر ایسی نظر جمائے کہ ہٹنے نہ پائے۔ ہلال تکنے والوں کی نظر پر نظر دوڑائے تو کیا عجب ہلال نظر آجائے اور اُن کی آنکھوں کے ذریعہ شہود نصیب ہو کسی پر آنکھ جم جانا، کسی کا نظروں میں بس جانا بڑی بات ہے لیکن آنکھ کو راز دل سے ملتا ہے۔ دل ہی غافل ہو تو نظر کیا کر سکتی ہے۔ در اصل تصوّرِ رسول ﷺ اور فنافی الرّسول سب سے بڑی نعمت ہے۔

## ۲۷۔ تصوّرِ شیخ کی اہمیت

ناچیز نے عرض کیا۔ اسماء رؤف و رحیم کے ورد کے وقت بعض لوگ اللہ تعالےٰ کا خیال کرنے کے بجائے کسی مرشد کا خیال کرتے ہیں۔ فرمایا۔ سب سے زیادہ پابندِ شریعت

رہ کر اہلِ عرفان کے مقامات چاہنا گویا بس کے ٹکٹ سے ہوائی جہاز پر سفر کرنے کی خواہش کے مرادف ہے۔

## ۳۰۔ قرآنی سلوک

حضرت غوث اعظمؒ کا سلوک قرآنی ہے۔ اس میں بڑی قوت ہے پہلے چار پانچ سو برس تک اسلام اپنی اصلی قرآنی حالت پر تھا۔ راہبانہ تصوف نہ تھا یعنے پہاڑی چلّے نہ تھے۔ البتہ فاروقی تصوف تھا یعنے سالکین معاملات میں دین کو برتتے تھے۔ قوتیں بے حد تھیں لیکن بعد کو قرآنی سلوک میں مقامی اثرات آگئے اور مرکب ہوگیا جس کی وجہ وہ اگلی شان باقی نہ رہی۔ گو بعد والوں نے اصلاح کی کوشش کی لیکن ذوق بدل گیا۔ قرآنی سلوک کی مثال پانی کی سی ہے جس سے فطرت کو تسکین ہوتی ہے اور بے زار نہیں ہوتی۔ اس کے خلاف دیگر سلوک شربت، اولٹین کی طرح ہیں۔ تعجب ہے لوگ کہتے ہیں۔ ابتدا میں توحید وجودی وغیرہ نہیں تھی۔ گویا تصوف نہ تھا اور یہ بعد کی چیز ہے۔ حالانکہ بسم اللہ، الحمد للہ۔ ان شاء اللہ، ماشاء اللہ۔ اِنّا لِلّٰہ۔ یہ سب توحیدِ محض ہیں۔ اسلام کی بنیادی تعلیمات ہیں۔ ان حقایق کو مسلمان بچہ بچہ روزانہ بولتا ہے جس کی بڑے بڑے فلسفیوں کو ہوا نہیں لگی۔

اگلوں کو تصوف کی اصطلاحات کی ضرورت نہ تھی۔ وہ قرآن میں بسر کرتے تھے قرآن میں تصوف کے لئے صدق کا لفظ آیا ہے۔ اس صدق کو حضرت صدیق اکبرؓ کی طرح ایک لمحہ میں حاصل کر دیا برسوں میں حاصل کردہ علم کی تصحیح کے بعد عَلٰی صَلَاتِہِمْ دَآئِمُوْنَ (۲۹/۲۳) کی شان حاصل ہوتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ صدق لائے اور حضرت صدیقؓ نے تصدیق فرمائی متقی کی سند پائی (۲۴/۱) اس کی جزا یہ کہ وہ جو چاہیں رب عطا کرتا ہے۔ اسلام کا مزاج گرم و نرم معتدل ہے۔ اِنَّ رَبَّکَ سَرِیْعُ الْعِقَابِ وَاِنَّہٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (۶/۸) ساتھ ساتھ ہیں۔ ورنہ کسی کا ٹھیرنا مشکل ہو جائے۔ اسما سنبھا

حال ہوگیا۔ آخیر میں سلطان جی کی سفارش پر حضرتؒ نے معاف فرمایا۔ اصل اصول یہ کہ پیرومرشد کی حضوری میں اللہ میں استغراق اس محل کے خلاف تھا۔ اس وقت مرشد کی طرف توجہ کرنا ہی اللہ کا منشا تھا اور وہی استغراق تھا۔ اسی لئے جلال آگیا۔ کبھی تقابلی ارادہ نہ ہو۔ ارادہ تحتِ امر مناسب ہے۔ اگر استغراق ہی مقصود تھا تو علیحدہ کمرہ میں بیٹھتے۔ اسی طرح ایک دفعہ حضرت بابا صاحبؒ سلطان جی کو ایک کتاب پڑھا رہے تھے، پڑھاتے ہوئے ایک جگہ رک گئے اور غور کرنا شروع کیا۔ اس عرصہ میں سلطان جیؒ نے ایک دوسرا صاف نسخہ لاکر سامنے رکھ دیا اور کہا عبارت یوں ہے۔ حضرت خفا ہوگئے اور فرمایا کیا مجھے پڑھنا نہیں آتا۔ سلطان جی رونے لگے۔ خودکشی حرام نہ ہوتی تو خودکشی کرلیتے۔ بالآخر حضرت خواجہ بدرالدینؒ کی سفارش پر معافی ہوئی۔ مطلب یہ تھا کہ غور و فکر کے وقت بات نہ کرنی چاہیئے۔

## ۲۹۔ علمی سلوک

فرمایا۔ اکثر لوگ علمی سلوک کی قدر نہیں جانتے۔ دراصل انہیں ایمان کے مقام کی عظمت نہیں معلوم۔ بعض لوگ جو علمی سلوک کی اہمیت تو بیان کرتے ہیں لیکن علمی سلوک اسی کو سمجھتے ہیں کہ چند رٹے ہوئے اصول یاد کرادیئے جائیں جن کا عملی زندگی میں نفوذ نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ سے وہ علمی سلوک کے بجائے ذہنی سلوک بن جاتا ہے۔ اصلی علمی سلوک وہ ہے جو ذہن کے بجائے قلب میں جگہ پیدا کرے اور عملی زندگی کا جزو بن جائے۔ اس قسم کے سلوک کیلئے بہت کم لوگ تیار ہوتے ہیں۔ کیونکہ ان میں اس کی استعداد نہیں ہوتی۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ کسی نے سیاسیات تو پڑھ لی لیکن عملی قیادت میں ناکام، یا بیرسٹر ہیں، لیکن وکالت میں ناکام۔ علمی سلوک میں قدم قدم پر دشواریاں آتی ہیں جہاں عمل کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے اگر مقربین کے مقامات اور فیوض چاہو تو عاقلوں (عقل پرستوں، لفظ پرستوں) کے زمرہ سے علیحدہ ہونا پڑے گا۔ اہلِ نفس کے مقامات پر

فی الاَسْوَاقِ (۱۸/۱۲) کیا ہوا اس رسول کو کہ کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا ہے کھانے پینے، لین دین کو عبادت بنانا کمال ہے۔ کھانا اللہ کا رزق ہے، اُسکی مِلک ہے۔ اپنے فضل سے کتنے اسماء کے باہمی ربط سے ہم تک پہنچاتا ہے۔ پھر حول و قوت دے کر، ہمیں کھانے کے قابل بناتا ہے۔ لہٰذا محمدیوں کی طرح اللہ تعالےٰ کے حول و قوت سے اپنے کو کھاتا ہوا دیکھنا کمال ہے، نہ کہ فلاقے کرنا۔ یہ ہے علم صحیح۔ اس وقت کتنے بادشاہو کا رزق چھن گیا ہے جو رزق کو اپنا مال اور حق سمجھتے تھے۔ عبد و رب اور عَبدُہٗ و رسولُہٗ کا علم بیدار رہنا کمال ہے۔

## ۳۲۔ محبّت کا سلوک

### ۱۔ دو طریق تعلیم

اکابر میں تعلیم و تبلیغ کے دو طریقے رہے ہیں، جو اپنے اپنے محل پر مناسب ہیں۔ ایک استدلالی طریق (دماغی) دوسرا قلبی طریق (جذباتی) استدلالی طریق میں خشکی ہوتی ہے، قلبی طریق میں تازگی شگفتگی۔ استدلالی طریق قلبی طریق کے مقابلہ میں پُر اثر، جاندار نہیں ہوتا۔ اولیاء اللہ نے محبت (قلب) کے جذبہ سے بڑے بڑے کام لئے، مجمعوں میں آگ لگادی۔ عقلی طریق خشک لکڑی ہے، وہ بھی کام آتی ہے لیکن محبت کا طریق گویا ایک تر و تازہ ثمردار درخت ہے۔ ہر شخص میں محبت کا جذبہ فطری ہے، کسی حسین کو دیکھ کر ولولہ اٹھنا فطری ہے لیکن عقلی لوگ اپنی بے عقلی یا نفس کے تحت، یا اپنی کمزوریوں کو چھپانے کے لئے محبت کے جذبہ کو دبانا چاہتے ہیں، بالآخر وہ فنا ہوجاتا ہے۔ قانونِ فطرت ہے کہ جب مردانگی و محبت کے جذبات کو بری طرح دبایا جائے تو مردانگی غائب ہوجاتی ہے۔ اس لئے دین نے ضبط (کنٹرول) کی تاکید کی ہے۔

حضورِ انور کی سیرت تڑپانے والے واقعات سے پُر ہے لیکن بعضوں نے سیرت پر ایسے خشک انداز سے کتابیں لکھی ہیں کہ عشق و محبت کا ولولہ پیدا نہیں ہوتا۔

ہیں جلال و جمال سے عالم قائم ہے۔ كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ (۲۷٫۲۶)

## ۱- عالمِ شہادت کا سلوک

آج کل سلوک میں بالعموم عالمِ مثال کے کشف پر زور دیا جاتا ہے۔ انسان قدرتاً ندرت پسند واقع ہوا ہے۔ اس لئے لوگ ایسے سلوک کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔ قرآن علم صحیح پر زور دیتا ہے۔ عالمِ شہادت پر زور دیتا ہے۔ عالمِ مثال تو برزخ میں کھل ہی جائے گا لیکن عالمِ شہادت میں ہر آن جو اسمار کی تجلیات ہو رہی ہیں۔ ان سے نظر ہٹا کر صرف عالمِ مثال ہی کی طرف متوجہ ہو جانا، اس عالمِ شہادت کو غیر ضروری اور لاحاصل سمجھنا، خیالی صورتیں قائم کرنا اور اُن میں محو ہونا۔ اصل کی ناقدری اور بے ادبی ہے۔ غور کرو، اصل پھول کو چھوڑ کر اس کی تصویر کا تصور کس حد تک حق بجانب ہے۔ اگر روزانہ اشیا مشہودہ کا حق ادا کریں تو اللہ تعالیٰ اس ہی میں علم کھول دے گا۔ بچّوں، بیویوں وغیرہ کو چھوڑنا یا اُن سے نظر ہٹانے سے بہتر ہے کہ اِن کو اللہ، رسول اللہؐ کی امانت جان کر اُن کا حق ادا کریں۔

## ۲- تسبیح فاطمہؓ

حضورؐ نے حضرت فاطمہؓ کو سُبْحَانَ اللهِ۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ۔ اللهُ اَكْبَرُ۔ کا ذکر عطا فرمایا کہ اس کا وزن سارے عالم سے بڑھ کر ہے۔ سُبْحَانَ اللهِ سے یہ سبّوحیت حاصل ہوتی ہے کہ اللہ عالم سے پاک ہے اور ناقابل بیان ہے۔ اس عروج کے بعد نزول کر کے سارے عالم میں، ہر شئے میں وجود علم ارادہ وغیرہ دیکھ کر اللہ کو اس کا مرجع جاننا، یہی توحیدِ وجودی محمودیت اور الحمدللہ ہے۔ پھر اسی میں منحصر نہ رہ کر اللہ کو ہر ایک سے بالا دیکھنا، یہ کبریائی اور اللہ اکبر ہے۔

## ۳- ہر فعل عبادت

حضورؐ نے جملہ فطری افعالِ بشری، نکاح وغیرہ کو علمِ صحیح کے ذریعہ عبادات میں داخل فرمایا۔ قرآن میں نبیؐ کے متعلق کافروں کا قول ہے۔ مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ

کی ترقیوں کی جان ہیں۔ ذکر چھیڑا کہ تڑپ شروع ہوئی، دُھن بندھی، دُھن میں دُھن اپنی دھن۔ جیسے اس عالم میں نسبت کے لئے اس جذبۂ محبت (مردانگی) کی ضرورت ہے اُسی طرح اگر یہ جذبہ موجود ہو تو اس کا رُخ اعلیٰ کی طرف پھیر دیا جاتا ہے۔ اسی لئے بعض مرشدوں نے اپنے کسی ایک مرید میں تکمیل سلوک کے لئے اس خوابیدہ جذبہ کو جگانے کا اہتمام کیا۔ مقصود معصیت میں ڈبونا نہ تھا۔ بلکہ اُن کے مُردہ جذبات کو زندہ کرنا، ترقی دینا۔ بھٹی میں نکھار دینا، تاکہ دین کے معرکوں یعنے اللہ رسولؐ کے عشق و جہاد میں کام آسکے۔ اس تجربہ کے بعد خالص فولاد ہوتا تو لیتے، کچا لوہا ہو تو پھینک دیتے یا لوہے کی حد تک کام لیتے، لوہے سے فولاد کی غلط امید نہ رکھتے۔

رسول اللہؐ کی محبت کے بغیر انسان مُردہ ہے۔ اس لئے کافر مُردہ ہیں لیکن فاسق و فاجر مسلمان بیمار ہیں۔ جان تو ہے۔ صحت کی امید کی جا سکتی ہے۔

ایک مریض شیر ہزاروں موٹے تازے مردہ شیروں سے بدرجہا بہتر ہے محبت و ایمان سے صحت پیدا ہوتی ہے۔ محبت کی غلطیاں معاف ہیں۔ فطری کمزوری کی وجہ سے ہوتی رہیں گی۔ البتہ بڑی غلطیوں پر اصرار نہ کرنے کا حکم ہے۔ وہ بھی ہو جائیں تو توبہ کا حکم ہے۔

## ۴۔ مولوی، مشائخ کا فرق

ہمیشہ سے مولویوں اور مشائخوں میں اختلاف رہا ہے۔ وہ عقلی اور یہ محبت والے لوگ رہے ہیں۔ ہر وقت گناہوں سے اتنا ڈرانا کہ تقویٰ محض ایک خیالی چیز بن کر رہ جائے اور زندگی میں مایوسی پیدا ہو جائے، نامناسب ہے، بلکہ نفس کا دھوکا ہے۔ جذبات کو بے جا طریق پر دبانا اور رفنا کرنا ہی رہبانیت ہے۔ اس کا کنٹرول اور صحیح محل پر استعمال ہی اسلام کا کمال ہے۔ مولویوں میں خشکی اور مرشدین میں تراوٹ شگفتگی رہتے ہیں۔ دونوں کے آثار بھی ظاہر ہیں۔ حضرت خواجہ اعظمؒ اور حضرت

## ۲۔ مردانگی کی اہمیت

فصل پنجم

حضرت مظہر جانِ جاناںؒ کے والد بزرگوار نے انکو جذبۂ محبت پر ایک خط لکھا جو معارف کی اشاعت میں چھپا ہے۔

" اگر ممکن ہو تو عشقِ مجازی کی بھٹی کے شعلوں میں سے ہو کر نکل جاؤ تاکہ تم کسی کام کے بن سکو۔" کیا کوئی متقی باپ اپنے بیٹے کو آج ایسا خط لکھ سکتا ہے اسی تربیت کا نتیجہ تھا کہ وہ جانِ جاناںؒ بنے۔ اصل راز یہ ہے کہ دینی و دنیوی (روحانی، قلبی، مادی) زندگی میں محبت ہی کا جذبہ کارفرما ہے۔ ہم ملائکہ کی طرح معصوم تو بن نہیں سکتے گنہ گار شیاطین بھی نہ بننا چاہیئے بلکہ آدمیت ہی کمالِ انسانی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں رجولیت کو اتنی اہمیت دی گئی۔ جب تک رجولیت نہ ہو، نہ صرف دینی لحاظ سے بلکہ دنیوی قانونِ سول سروس کے لحاظ سے بھی وہ کامل نہیں سمجھا جاتا۔ اور نہ اس کو اعلیٰ خدمات کے لئے اہل سمجھا جاتا ہے، وجہ کیا ہے۔ کیا اس کے بغیر نوکری نہیں ہو سکتی۔ اصل میں فطرت کا اظہار ہے کہ انسانی کمالات مکمل نہیں ہو سکتے البتہ کنٹرول لازمی ہے۔ کمزور سے کمزور رجولیت والا بڑے سے بڑے نامرد پہلوان سے بہتر ہے۔ کیونکہ وہ سرمایۂ حیات رکھتا ہے۔ حیات آفریں ہے چمن بن سکتا ہے۔ نامرد بے ثمر درخت ہے، جلانے کی لکڑی ہے۔

## ۳۔ جذبۂ محبت

اصل بات یہ ہے کہ جس میں رجولیت ہے، اس میں محبت ہے، جوش ہے، فدائیت ہے، دُھن ہے، جسمانی مادی زندگی کی طرح قلبی و روحانی عالم کی بھی مردانگی ہے۔ وہاں بھی مرد، نامرد، کمزور مرد ہوتے ہیں۔ چونکہ وہ عالم لطیف ہے۔ اس لئے وہاں اعلیٰ، الطف محبتیں نزاکتیں اور ولولے ہوتے ہیں۔ جس طرح اس عالم کی ترقی اس جذبۂ محبت (مردانگی) کے بغیر ممکن نہیں۔ ویسے ہی اس عالم کا عروج بھی محبت کے بغیر ممکن نہیں۔ محبت، ادب تعظیم ہی وہاں

ایک صاحب نے اولیاء اللہ کے احوال، اقوال، افعال پر اپنا مسلک بنانا چاہا تو فرمایا۔ کسی کے احوال میں نہ الجھئے۔ اپنا ایک مسلک بنائیے کیونکہ احوال کی تعبیر مشکل چیز ہے۔ مسلک یا تو علمی ہو یا محبت کا ہو، یا امر و خدمت کا ہو۔ اسی کے مطابق آثار آئیں گے۔ مسلکوں کے فرق کو خلط ملط نہ کرنا چاہئیے۔ دراصل بلوغ مقصود ہے۔ بلوغ حاصل ہو تو ہجر، وصل، شکوہ شکایت، ناز و نیاز کے احوال خود بخود تابع ہو کر آئیں گے۔ لیکن اگر بلوغ ہی حاصل نہیں تو ان احوال کو پڑھ کر نہ ہی مفہوم نہیں سمجھ سکتے اور نہ انھیں کوئی سمجھا سکتا ہے۔ جس طرح جسمانی بلوغ ہوتا ہے ویسے ہی قلبی و روحانی بلوغ ہوتا ہے۔ اس کے بھی آثار ہوتے ہیں۔ اعلیٰ ادنیٰ کا فرق ہے۔ مشابہت ضرور ہے۔ محبت کے مسلک والا علم و عمل کچھ نہیں رکھتا۔ لاڈلا چھوٹا بیٹا ہے۔ اماّں، ابّا کے سوا چین نہیں۔ اس محبت کی لاج ایسی بنتی ہے کہ والدین اس کے لئے خود بخود سب کچھ کر دیتے ہیں۔ البتہ بڑا بھائی صاحبِ خدمت ہوتا ہے۔ صاحبِ حکومت ہوتا ہے، وہ بھی اسی طرح لاڈ پیار کرے تو نظم خراب ہو جائے۔ وہ امر کے مقام پر رہتا ہے محنت کر کے کماتا اور والدین کا حق ادا کرتا ہے۔ وہ اپنے محل پر بہت اہم ہے۔ بعض محبت کے ساتھ حکومت کو ملا کر چلاتے ہیں۔ بعض بالکل علمی مسلک رکھتے ہیں جس میں خشکی ہوتی ہے۔ یہ محبت والے کے مقام کا وزن اور آثار نہیں رکھتے۔ دین میں اپنے اقتضا کے لحاظ سے ایسے لوگوں کی بھی ضرورت ہے۔ بعض زاہد مرتاض ہوتے ہیں جن کو علم، محبت، حکومت سے مطلب ہی نہیں ہوتا۔ لہٰذا اپنی طبیعت کے لحاظ سے کوئی سا مسلک یا پیر اختیار کرنا چاہئیے۔ ہر ایک کو دیکھ کر رنگ نہ بدلیں۔ بعض اکابر نے مریدوں کا اقتضا دیکھ کر دوسرے پیر سے بیعت کرنے کی نصیحت کی۔ ہرجائی بھی نہ بنیں اور اپنے اعتقادات و احوال سوائے اہل کے ہر ایک سے نہ بیان کریں۔ ورنہ سلب ہونے کا اندیشہ ہے۔ رسول اللہ صلعم

محبوب الٰہیؒ کی تعلیمات تو زبان زد ہیں کیونکہ انھوں نے محبت کے جذبہ کو اپیل کیا۔ اس کے برخلاف بڑے بڑے علماء کی کتابوں کو وہ قبولیت حاصل نہیں۔

## ۵۔ عبادتوں کی جان

حج میں ایک بڑے مشہور مولوی صاحب کے خلیفہ میرے ساتھ رہے۔ انھوں نے کہا، تمھارے اوقات باضابطہ نہیں۔ تلاوت برائے نام۔ لیکن تمھاری باتیں جو بالکل اوٹ پٹانگ ہوتی ہیں، میرے دل کو لگتی ہیں اور تمھاری دینی عظمت میرے قلب میں ہر روز بیٹھتی جاتی ہے، حالانکہ میں رات دن وظیفے پڑھتا ہوں۔ لیکن تمھارے پاسنگ میں نہیں معلوم ہوتا۔ راز بتاؤ۔ بہ اصرار پر میں نے جواب دیا۔ اس کی مثال ایسی سمجھو کہ ایک شخص نے گانے کے قواعد و ضوابط کی کتابیں یاد کر لیں اور اسی میں کل زندگی صرف کر دی۔ دوسرے نے گانا گا لیا، کیفیت پیدا ہو گئی جو مقصود ہے۔ یا ایک شخص نے قواعد عروض و بلاغت میں عمر گزار دی۔ دوسرے نے شعر کہہ دیا۔ کہو کون بڑھا ہوا ہے۔

من نہ دانم فاعلاتُ فاعلات   شعر می گویم بہ از آبِ حیات

مطلب یہ کہ ایک کے پاس روح ہے، ایک کے پاس جسم۔ ایک کے پاس معنی تو ایک کے پاس لفظ۔ اگر روح و جسم، معنیٰ و لفظ کی جامعیت ہو تو کیا کہنا لیکن مقدم کون ہے۔ دراصل حضورِ انورؐ کی محبت اور آپ کی دھن سب عبادتوں کی جان ہے۔ اور یہی ترقی کا زینہ ہے عشقِ محمدی حیات ہے، قوت ہے۔ اس سے ہٹ کر جتنی بھی ترقی ہو سطحی ہے، اسلامی نہیں۔

## ۳۳۔ مسلک کا تعین

مرشدین کے وہ اعمال و اقوال جن کا تعلق انکے انفرادی ذوق سے ہو انکی ریس و مریدین کیلئے ضروری نہیں۔ ایسے اعمال و اقوال خوش عقیدگی کا بنا پر انکے مریدین کیلئے تو قابل قبول ہو سکتے ہیں سب کیلئے نہیں اسلئے خوش عقیدگی کو ایمان سے نہیں ملانا چاہیے۔ علم کا ایک ہونا جدا ہے اور اس کے استعمال کا طور طریق جو مسلک کہلاتا ہے وہ اور

قوی سخت تند مزاج ترکوں اور مغلوں سے سابقہ ہوا جن کی اصلاح قوی ذکرِ حدادی کے ذریعہ ممکن تھی کہ سختی کی وجہ سے محلول نہیں بن سکتا تھا۔ اس لئے ہاون دستے میں کھرل کرنا ضروری ہوا۔ ہر قسم کے لوگ ہیں، ہر قسم کے مریض ہیں۔ اس لئے حاذق حکیم کو علیحدہ علیحدہ نسخے تجویز کرنا چاہیئے نہ کہ سب مریضوں کو ایک ہی نسخہ دے جیسا کہ بعض مرشدین کرتے ہیں۔

## ۳۵۔ مراقبہ، فنا، بقا اور کمالات

فرمایا، اصل علم علمِ قرآنی ہے۔ باقی کھیل تماشا ہے۔ حضرت غوث اعظمؒ مراقبوں پر زور نہیں دیتے تھے۔ تصورِ شیخ اور دوسرے مراقبوں سے بھی چیز حاصل ہوتی ہے لیکن وقتیہ۔ علم صحیح سے اطلاقیت پیدا ہوتی ہے۔ ہر وقت حال طاری رہتا ہے۔ آثار جاری رہتے ہیں۔ قرآنی سلوک علم کی تصحیح کرتا ہے، ہر چیز اپنے محل پر رہتی ہے۔ البتہ ہر محل کی پہچان ہو جاتی ہے۔ ایک کافر جب مسلمان ہوتا ہے تو محض تبدیلِ علم سے اس میں زمین آسمان کا فرق پڑ جاتا ہے۔ اکثر مرشدین فنا، بقا، توحید ذاتی کے مراقبے بتلاتے ہیں جن پر مجھے اعتراض نہیں لیکن اس میں عمریں صرف ہو جاتی ہیں اور مشکل سے کوئی چیز حاصل ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف علمِ قرآنی حاصل کرو تو ایک لحظہ میں فنا، بقا حاصل ہو جائے، چاہے اس علم کو ایک منٹ میں جماؤ، برسوں میں جماؤ اپنا اپنا حوصلہ ہے۔

قرآن کے لحاظ سے فنا کے تصورات یہ ہیں کہ اپنے آپ کو ہم میت، جاہل، مضطر، عاجز، اصم (بہرا) اعمیٰ (اندھا) ابکم (گونگا) جانیں تو یہی فنائیت ہے۔ اس کے بعد حیات، علم، ارادت، قدرت، سماعت، بصارت، کلام کو من اللہ اپنے میں پائیں تو یہی بقا ہے۔ اس طرح ہر آن فنا، بقا جاری ہے۔ جتنی دیر سو جاتے ہیں، سارے عالم سے بے خبر ہو جاتے ہیں۔ اس بے خبری کو حواس کو معطل کر کے کیوں

کو ہر آن اپنا مرکز رکھنا، محبت کا محور بنانا یہی ترقی کا اصل مقام ہے۔

## ۳۴۔ زندگی کا خواب اور سلوک

اکثر مرشدین خوابوں پر زور دیتے ہیں، روز پوچھتے ہیں۔ کیا تم نے کوئی خواب دیکھا۔ نتیجتاً مرید وہمی ہو جاتا ہے۔ واہمہ ترقی کرتی ہے اور وہ خواب دیکھنا شروع کرتا ہے۔ چونکہ خواب و خیال کا عالم بہت وسیع ہے، وہ واقعات سے دور جا پڑتا ہے۔ اس کے پاس عملی زندگی کی اہمیت نہیں رہتی۔ آنکھ بند کر کے نورانی عالم میں جانا چاہتا ہے۔ لہٰذا کیوں نہ مریدین کو اس عالمِ شہادت کی زندگی کی اہمیت بتائی جائے کہ اس زندگی کا خواب کتنا خوب ہے اس پورے عالم کو دیکھو اس کی تجلیات دیکھو کہ یہی عبادت ہے یعنے کائنات میں ہر چیز مردہ ہے لیکن اسی میں سے حیات، علم ارادہ قدرت، سماعت بصارت کلام کیسے ظاہر ہو رہے ہیں بچوں کے ساتھ کیا تجلیاں ہیں۔ بی بی کے پاس کیا تجلی ہے۔ آسمان زمین پر کیا تجلیاں ہیں۔

بعض مرشدین مریدین کے اقتضادات کے خلاف حبسِ دم، ذکرِ جلّادی بتاتے ہیں۔ پہلے ہی صحتیں چوپٹ، اعصاب برباد ہیں۔ ان کی فطرت و قویٰ کا لحاظ کئے بغیر قوی اذکار بتائیں تو ردِّ عمل ہوتا ہے صحت برباد ہوتی ہے۔ بزرگوں کے مجوزہ سلوک درست ہیں کیونکہ نیت بخیر ہے انھوں نے توحید رسالت کی تفہیم کے لئے ذوق، ماحول، فضا کے تحت نسخے تجویز کئے۔ لیکن ہر فروعی چیز کو اصل قرار دینا اور اس کی سند کو حضورؐ کی طرف منسوب کرنا جسارت ہے۔ ہندستان کے لوگ محبت والے ہیں۔ اس لئے قوالی کے ذریعہ، حضرت خواجہ اعظمؒ نے سلوک الی اللہ طے کرایا۔ گویا پانی میں شکر ملا کر شربت بنا دیا۔ حضرت غوث اعظمؓ نے ترکِ ارادت اور تحتِ امر رہنے پر خاص زور دیا حضرت خواجہ نقشبندؒ کو

یہ واقعہ بیان کیا۔

## ۳۶۔ سلوک کا ما حصل

بڑے بڑے حاکموں عہدہ داروں کو دیکھو کہ بے عقلی، بے علمی، بے ہمتی کے باوجود کام کر رہے ہیں۔ اسے حکمتِ الٰہیہ کلی کے سوا کچھ نہیں کہہ سکتے۔

مال و دولت بہ کار دانی نیست  جز بہ تائیدِ آسمانی نیست

اِس لئے سارے سلوک کا ما حصل یہی ہے کہ اقتضاآت و تجلیات کا تماشا بلالحاظِ نتائج دیکھتے جائیں۔ اِسی دنیا میں کچھ مل جائے تو اسے انعام جانیں، حکمتِ الٰہی میں کون کیسے واقع ہوا ہے اس کی ترکیب پر نظر رہے۔ البتہ صرف دعا کئے جائیں۔ اصل کامیابی یہ ہے کہ منشائے الٰہی کے مطابق، صحیح اعتبار میں ہر آن زندگی گذرے۔ آخر ہم جن کی اُمّت ہیں اُن کے آثار ہم میں بھی تو آئیں گے۔ انبیاء پر بڑی مصیبتیں آئیں۔ اگر کوئی کہے کہ مومن پر ایسا ظلم کیوں ہو رہا ہے تو یہ جہل ہے۔ مخالف چیزیں اس کے ایمان کی تکمیل کے لئے آئیں گی، جس کا مقصود تحقق ایمانی اور استقامت فی الدین ہے ورنہ ایمان کے بعد اگر سب مفید مطلب چیزیں مل جائیں تو شیطانوں، ظالموں کے اقتضاآت کس کے مقابل ظاہر ہوں گے۔ اور ایمان و استقامت کی قوت اور نصرتِ حق کیسے ظاہر ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء، اولیاء ظلم سہتے ہوئے رحمانیت کے تحت اقتضاءات کو پورا کرتے ہیں اور دعائیں کرتے جاتے ہیں محض فتح مشروط نہیں رکھتے۔ قرآن میں ہے، جب اللہ نے ابراہیمؑ کو کئی باتوں میں آزمایا اور وہ ان کو پورے طور پر بجا لائے تو اللہ نے فرمایا میں تم کو لوگوں کا امام بناؤں گا (۱۲۴/۲) سلوک کا خلاصہ علمی ایمانی تحقق اور استقامت تھا۔ نتیجہ یہ کہ امّت کی اِمامت عطا کی گئی۔ اخیر تک نتیجہ کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتے۔ اللہ مقلّب القلوب ہے۔

حاصل کریں کیوں نہ علم کی تصحیح کر کے اپنی بے خبری و بے خودی کو حاصل کریں یعنے وجود وانا، صفات ہمارے نہیں، حق کے ہیں، جو ہمارے لئے امانت ہیں۔ اس طرح علمِ غلط کو چھوڑنا فنا اور علمِ صحیح حاصل کرنا بقا اور یافت ہے۔ اپنے کو عدم وجہل کے مقام پر دیکھے اور محض معلومِ حق جانے کیونکہ ہمارا قیام علم میں ہے اپنے کو تعینِ علمی کے سوا کچھ نہ جانے یعنے صورتِ معلومہ۔ اس کے اوپر توحیدِ ذات کے دعوے غلط ہیں البتہ علم کے اوپر جو علم عطا ہو وہ کہنے کا نہیں جس نے کہا، بری طرح پٹخیاں کھائیں۔ کسی نے انا الحق کہا، کسی نے کچھ۔ اس لئے اوپر کوئی چیز نہ قابلِ بیان ہے نہ قابلِ تحریر۔ البتہ قرآن میں اس کے اوپر صرف اتنا کہا گیا ہے۔ هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (۲۷/۱۷) اس انتہائی مقام کے متعلق بھی حضورؐ کو کہا گیا ہے۔ فَاَوْحٰۤى اِلٰى عَبْدِهٖ مَاۤ اَوْحٰى (۲۷/۴) یعنے عبدیت کو باقی رکھتے ہوئے علم (وحی) دیا جاتا ہے۔ کتنی ہی ترقی کریں، اپنے کو اللہ کا بندہ اور رسولؐ کا غلام جاننا کمال ہے۔ وہ تو بہت بڑے ہیں، اپنے کو حضرت غوث اعظمؓ کا غلام دیکھے تو معلوم ہو کہ کیا رحمتیں، نصرتیں ملتی ہیں۔

**کمالات** سب سے بڑا کمال اپنے کو بے کمال سمجھنا ہے۔ پھر غیب سے سارے کمالات ظاہر ہوتے ہیں۔ جو کمال کا خواہش مند ہو اُسے کمالات و کرامات نہیں ملتے حضرت موسیٰؑ کی طرح آثار (کمالات) کا اظہار ہونا چاہیئے کہ خود کو خبر نہیں عصا پھینکا تو سانپ بن گیا۔ یہاں تک کہ خود ڈر گئے تو اللہ تعالیٰ نے لَا تَخَفْ فرمایا۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ خود کو خبر نہیں ہوتی اور صورت سے کمالات ظاہر ہوتے ہیں۔ ایک دوست نے بیان کیا کہ مغرب کے وقت جنگل میں ان کی موٹر کا پہیہ نکل گیا۔ بہت پریشان ہو گئے اس پریشانی میں انھوں نے مجھے دیکھا کہ کہہ رہا ہوں۔ موٹر چلاؤ۔ چنانچہ انھوں نے موٹر چلائی اور بخیر و خوبی حیدرآباد پہنچے اور مجھ سے

سے بھی علاج کرتے ہیں۔ اس میں ہر دو سے ذرا سی غلطی ہو تو جان جاتی ہے۔ اسی طرح بعض مرشدین نے کبھی کسی ایک مرید کے اقتضا کے تحت عشقِ مجازی کی شرط لگائی تاکہ محبت کی نازبرداریوں میں اس کی انیّت فنا ہو جائے۔ اور وہ عشقِ حقیقی کے اعلیٰ اعتبارات سمجھ سکے۔ مثلاً محبت، وصل، فراق، فنائیت، محبوبیت، ایثار، قربانی وغیرہ۔ یہ اعتبارات دونوں طرف مشترک ہیں۔ اگر کوئی شخص ان جذبات سے عاری ہو تو سلوک کے تعلق سے بھی یہ اعتبارات اس کی سمجھ میں نہ آسکیں گے لیکن ملحد عشقِ مجازی ہی کو جہالت سے اصل سمجھتا ہے اور اسے تقدس کا رنگ دینے کے لئے کہتا ہے کہ عورت و مرد دہر شئی اللہ ہے۔ ایک صاحب نے قلندر کے متعلق میری رائے پوچھی۔ میں نے کہا، قلندر صالحین سے کمتر، نامردوں سے بہتر ہیں۔

اس سلسلہ میں ایک نکتہ سمجھنے کے قابل ہے۔ رجولیت و مردانگی کا ایک جذبہ تو وہ ہے جو فطری ہوتا ہے کہ جسمانی صحت اور شباب سے حاصل ہوتا ہے۔ دوسرا وہ جو مصنوعی ہے کہ مقویات یا خارجی تحریکات سے پیدا کیا جاتا ہے۔ قرآنی علم شباب ہے حیات ہے۔ اگر شباب ہو تو خود بخود اس کے آثار پیدا ہوں گے۔ اسی لئے قرآن کے بڑے بڑے اعلیٰ اعتبارات پڑھ کر بھی اکثر لوگ متاثر نہیں ہوتے لیکن ان ہی اعتبارات کا سواں حصہ تحلیل شدہ شکل میں اگر کوئی بیان کرے تو لوگ وجد کرنے لگتے ہیں۔ یہ توفضلِ الٰہی ہے کہ انسان کو قرآن کے اٹھانے کے قابل بنایا۔ ورنہ پہاڑ بھی نہ اٹھا سکتے۔

## ۳۹۔ صحیح علم و عمل کے آثار

مکشوفات دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک تو مختلف نادر چیزیں اور شکلیں نظر آتی ہیں دوسرے یہ کہ اشیا نظر آئیں اور ان کے ساتھ ان کا منشا، محل، افعال و نتائج بھی معلوم ہوں۔ مثلاً ایک شخص صرف موٹر دیکھتا ہے اور دوسرا شخص موٹر کے ساتھ مشینری کی حکمتوں

## ۳۷- شغل مطلق - شغل مقید

اصل سلوک یہ ہے کہ قرآن کے مطابق اپنے علم و عمل کی تصحیح ہوجائے اور قرآنی علم حال بن جائے۔ یہی اصل نعمت ہے۔ اس کے مقابل بعض لوگ اشغالِ مقیدہ کو اہمیت دیتے ہیں اور اسی کو مدارِ سلوک سمجھتے ہیں۔ اس کی افادیت بھی اپنی جگہ مسلّم ہے کیونکہ ذکر کے بھی انوار ہیں، آثار ہیں، اجور ہیں لیکن تصحیح علم کے بغیر اگر ہماری زبان، اعضا جوارح، بلکہ بال بال بھی ذکر کرتے رہیں تو اصل نعمت تو حاصل نہیں ہوگی۔ ایسے بعض لوگوں کا علم و عمل بھی قرآن کے خلاف دیکھنے میں آتا ہے۔ قرآن کے مطابق تصحیح علم کے بعد اس علم پر قیام اور اس کو اپنا حال بنا لینا شغلِ مطلق کا حکم رکھتا ہے۔ شغلِ مطلق مقام بن جائے تو ہر حال حال ہو جاتا ہے۔ اس سے عمل میں قوت پیدا ہوتی ہے۔ علم عین ذکر اور ذکر عین علم ہو جائے تو کمال ہے لیکن اکثر لوگوں کا ذوق سلوکِ ذکری اور اشغالِ مقیدہ کی طرف رہتا ہے یعنی چلّوں، زکاتوں اور مجاہدہ کی طرف، ان سے صحت، بحث مناسب نہیں۔ یہ لوگ ہمیشہ لطائف اور ان کے الوان و انوار وغیرہ پر زور دیتے ہیں۔ جو اکثر تصورات سے بھی پیدا ہوتے ہیں اور خیالی بھی ہوتے ہیں۔ اس میں بڑے دھوکے ہیں شیطان بعض اوقات خوب چکر دیتا ہے، مختلف رنگوں، روپوں میں خود ظاہر ہوتا ہے پس اصل معیار قرآن ہے کہ علم و عمل حال و قال قرآن کے مطابق ہو جائے۔ اس لئے علمی سلوک ذکری سلوک سے بہتر ہے اخصّ ہے، اسلم ہے۔ اس میں بجلی کی رفتار سے مقامات طے ہوتے ہیں اور حفاظت الٰہی شاملِ حال رہتی ہے۔

## ۳۸- عشق مجازی - عشق حقیقی

ہر ایک کا اپنا طریق علاج ہے۔ بعضوں نے عشق مجازی کے ذریعہ تکمیل کرائی ہے جو شاذ ہے، اور بہت احتیاط طلب ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ بعض اطبّا زہر

جوش ہے اور عمل پر زور ہے، واقعی عمل ضروری چیز ہے لیکن عمل پر علم کی تقدیم سے انکار کرنا سخت جہالت ہے۔ علم و عمل کا ربط انھیں معلوم نہیں۔ قرآن میں کتاب و حکمت کا علم اور علم لدنی کی برتری بتائی گئی ہے۔ حدیث میں عالموں کی روشنائی کو مجاہدین کے خون کے مماثل بلکہ افضل بتایا ہے۔ اس لحاظ سے علماء کو دین کا خادم سمجھا جائے گا یا نہیں۔ یہ لوگ علم کی اہمیت سے لاعلم رہ کر نادانی سے صرف عمل پر زور دیتے ہیں، حالانکہ علم کے بغیر عمل کوئی چیز نہیں۔ علم روح ہے تو عمل جسم۔ قرآن میں کافروں کے متعلق کہا گیا۔ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ( ) ان کے سارے اعمال غارت ہو گئے۔ آخر عمل والوں کے سوا یہ کن پر منطبق ہو گا۔ وجہ یہ کہ علم صحیح نہ ہونے یا علمی نقص کی بنا پر ہی عمل کالعدم ہو جاتا ہے۔

## ۴۱۔ حقائق و معارف کے بیان کے نقصانات

بڑے حضرت قبلہ ایک عقیدتمند

غیر مسلم سے حقائق و معارف بیان فرماتے تو میں اختلاف کرتا کہ یہ انبیاء کے طریقہ کے خلاف ہے۔ جو لوگ اصحاب شمال ہیں، قرآنی طریق یہ ہے کہ ان سے حقائق و معارف نہ بیان کئے جائیں، بلکہ تفہیم کی ضرورت باقی رکھی جائے فتوح الغیب اور فتوح ربانی سے بھی حضرت غوث اعظم کا یہی اصول ظاہر ہوتا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرعون سے حقائق نہیں بیان کئے۔ بلکہ سیدھے سادے اسلامی عقاید پیش کئے۔ اسلام اختیار کرنے کے بعد، علم و عمل کی استقامت پر، مقربین کا علم بطور انعام عطا ہوتا ہے اور فضل سے کھلتا ہے۔ محض حقائق کہنے سے نہیں کھلتا۔ اسی حد تک ہماری تبلیغ ہو۔

## ۴۲۔ پیری فقیری

سر رچرڈ برٹن کو انگریزوں نے حرمین شریفین کے حالات معلوم کرنے کے لئے بھیجا تھا۔ خوب ذہانت و ذوق کا آدمی

کا علم پایا جاتا ہے۔ صحابہ کے پاس مکشوفات کی اہمیت نہ تھی۔ ایمان کو اصل سرمایہ جانتے تھے۔ ان کے پاس فلسفہ کا پھیرا نہ تھا۔ وہ راست حضورؐ سے قرآن لیتے۔ یَآاَیُّھَا النَّاسُ اَنۡتُمُ الۡفُقَرَآءُ اِلَی اللّٰہِ ۔ وَ اللّٰہُ ھُوَ الۡغَنِیُّ الۡحَمِیۡدُ (۲۲/۱۵) پر ایمان تھا اور اس پر جمے ہوئے تھے۔ جاہل کہتے ہیں صحابہ میں اولیاءاللہ نظر نہیں آتے۔ حالانکہ ان میں ہر شخص ولی تھا۔ اعلیٰ مدارجِ ولایت کا حامل تھا۔ ان کا علم جزوِ زندگی تھا۔ وہ علم کے ساتھ عمل میں سرگرم تھے۔ ان کا صرف قال نہ تھا بلکہ حال تھا۔ لوگ بلا عمل محض قیل وقال سے متاثر نہیں ہوتے۔ نہ فیوض وبرکات حاصل ہوتے۔ صادقین اولیاءاللہ کو جتانے، بتانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ زندگی میں جو اعمال کرتے ہیں وہ علمِ الٰہی اور سنتِ رسولؐ کے تابع ہوتے ہیں۔ اس نسبت سے قلوب متاثر ہوکر فیضان جاری ہوتا ہے۔ سوائے اس کے کہ اللہ کو کسی کا اشتہار پسند ہو۔ محض علم کا ہونا اور عمل نہ ہونا ایسا ہے، جیسے کسی کے پاس انجکشن کی شیشی ہے۔ فائیدہ اس وقت ہوگا جب انجکشن لیا جائے۔ یعنے اگر قرآنی علم قلب وروح میں سرایت کرے تو اعلیٰ آثارِ حیات ظاہر ہوں گے۔ محض دین کا دعویٰ کرنے سے کچھ حاصل نہیں۔ دوسروں کی مصیبت کے وقت بے نفسی، خلوص ظاہر ہوں تو معلوم ہوگا وہ اللہ والا ہے۔ اس کی امتحان گاہ غرباء، بچے، ضعیف ہیں۔ جن کو دیکھ کر اس میں اچھا جذبہ ابھرنا چاہیئے۔ اگر قلب وروح میں قرآنی علم سرایت کئے بغیر کوئی شخص عمل کرے تو وہ کمیونسٹوں کا سا عمل ہوگا۔ جسدِ بے روح ہوگا۔ کیونکہ اس کا مقصد نفس و دنیا ہے یہ بظاہر اولیاءاللہ کی طرح معلوم ہوگا جن کا عمل بے نفسی کے تحت ہوا کرتا ہے۔

## ۴۔ علم کی برتری عمل پر

ایک صاحب نے کہا مسلمان محض علم (ایمان) سے نہیں بنتا۔ عمل لازمی ہے۔ عمل کے بغیر علم کوئی چیز نہیں۔ فرمایا، آج کل ہر طرف سر پھروں کی فوج ہے جنہیں

نہ انکار می کنم و نہ ایں کار می کنم۔ یہ حضرت خواجہ بہاؤ الدین نقشبندؒ کا مشہور قول ہے
میں نے جہاں تک مطالعہ کیا، اصل سوال ذوق اور طبعی مناسبت کا ہے۔
جن کو موسیقی سے مناسبت نہیں وہ اسے ناپسند کرتے ہیں اور جن کو مناسبت ہو،
وہ پسند کرتے ہیں جن نقشبندیوں کو موسیقی سے طبعی مناسبت ہوتی ہے عجیب مشکل میں
پڑجاتے ہیں۔ کرتے ہیں تو سلسلہ کے مسلک کے خلاف، اور نہیں کرتے ہیں تو طبعی کوفت
دراصل فطرت وکائنات (ہوا، پانی وغیرہ) میں موسیقی ہے جب تک ہر چیز مطابق
حال نہ ہو بڑی دقت رہتی ہے۔ دراصل علم کی تصحیح کی ضرورت ہے۔

محفلِ قوالی کو اہلِ ذوق کی حد تک مخصوص کرنا مناسب اور ضروری ہے۔ اسے
تماشا نہ بنائیں صفائی، پاکیزگی، وضو، ادب، تعظیم شرطِ اولین ہیں۔ توجہ خاص کے
ساتھ درود شریف کی کثرت ہو۔ قوالوں کو عزت سے اچھے ممتاز مقام پر بٹھائیں۔
دراصل قوّال جلسہ میں فیض کا محرک ہوتا ہے جس کی طرف کُل محفل کو متوجہ ہونا پڑتا ہے
وہ بھی آداب کا پابند ہو اور مجلس میں باوضو رہے۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے (جو سلسلۂ نقشبندیہ کے اکابر میں سے ہیں) اپنی
کتاب ہمعات میں ایک قسم کے سالکین کے لئے سماع کو مفید بیان فرمایا ہے۔ اور
لکھا ہے کہ اس سے آہستہ آہستہ جامد طبیعت والے سالکین کی طبیعت کا جمود
ٹوٹ جاتا ہے۔ حضرت مجددِ الف ثانیؒ نے مکتوب ۲۸۵ جلد اول میں تحریر فرمایا ہے کہ
سماع و وجد مبتدی کے لئے مُضر ہے اور اس کے عروج کے لئے رکاوٹ ہے، خواہ
شرائط کے مطابق ہی کیوں نہ ہو۔ متوسط کے لئے اور ایک قسم کے منتہیوں کے لئے
مفید ہے۔ حضرت مجددؒ نے تصریح فرمائی ہے کہ مبتدی سے ہماری مراد وہ شخص
ہے جو اربابِ قلوب یعنے صاحبانِ دل میں سے نہیں ہے۔ اور اربابِ قلوب وہ
لوگ ہیں جو مبتدیوں اور منتہیوں کے درمیان متوسط ہوتے ہیں اور منتہی وہ ہے جو

تھا۔ چھ مہینے میں حجاز و مصر وغیرہ کا سفر کیا۔ اول وہ سندھ میں مسلمان بن کر رہا اور یاس مرشد سے قادریہ طریق میں خلافت حاصل کی اور مکہ مدینہ رہ کر دو جلدوں میں ایک زار صفحات کا سفر نامہ مکہ مدینہ لکھا۔ وہ لکھتا ہے: مسلمانوں میں درویشی اور مرشدی ہی سب سے زیادہ خطرناک چیزیں ہیں، اور سب سے زیادہ پُر لطف بھی۔ اگر مسلمانوں میں بے خطر، بلا بازپرس رہنا مقصود ہو تو پیری، فقیری اختیار کریں۔ مجھے اسی سے بہت مدد ملی، درویشی ہی ایسی چیز ہے جس میں ساری برائیاں نبھ جاتی ہیں۔ کتنا ہی میلا آدمی ہو، صاف لوگوں سے بہتر سمجھا جائے گا۔ کتنا ہی بدمزاج ہو، خوش اخلاقوں سے بہتر سمجھا جائے گا۔ کتنے ہی عیوب ہوں، عیب شمار نہ ہونگے، بلکہ خوبیاں سمجھی جائے گی۔ ہر قسم کی بے اعتدالیاں، جہالتیں، بدتمیزیاں سب نبھ جاتی ہیں اور شریف سے شریف، خوبصورت عورتوں کو دیکھنے کا موقع ملتا ہے۔

## ۴۳۔ قوالی کی حقیقت

فرمایا۔ قوالی صرف چشتیوں کے پاس جائز ہے۔ اس کا خاص زور حضرت خواجۂ اعظم اجمیریؒ کے وقت سے رہا ہے۔ قادریوں کے ہاں ایک شاخ میں قوالی جائز ہے سب میں نہیں۔ قوالی کا جواز حضور انورؐ کی مدینہ طیبہؐ میں تشریف آوری کے وقت، مدنی بچوں، بچیوں کے نعتیہ اشعار گانے اور دف بجانے سے لیا جاتا ہے جس کو حضورؐ نے سنا اور پسند فرمایا۔ چشتیوں میں حضرت نصیر الدین چراغِ دلیؒ سماع نہیں سنتے تھے لیکن حضرت محبوب الٰہیؒ کے مریدِ خاص حضرت امیر خسرو نے قوالی کو خوب فروغ دیا۔ آپ فنِ شعر و موسیقی کے بڑے ماہر تھے۔ ہمارے بڑے حضرت قبلہ فرماتے تھے۔ ؎

زندہ دلاں مُردہ تناں را رواست | مُردہ دِلاں زندہ تناں نارواست

اس سلسلہ میں حضرت مظہر جانِ جاناںؒ کا مسلک بہت اسلم ہے۔ آپ فرماتے تھے

خاص پابندیوں کے ساتھ ہوتی تھی۔ خاص احباب کے سوا کسی کو اجازت نہ تھی دورانِ سماع میں ایک صاحب نے اجازت طلبی کا خط بھیجا۔ مجھے تکلف ہوا لیکن مروت سے بعض بزرگوں نے اجازت دینے کے لئے ارشاد فرمایا۔ میں نے کہا، لطف کرکرا ہو جائیگا۔ مجبوراً اجازت دی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قوالوں کی تین چوکیاں یکے بعد دیگرے بیٹھیں لیکن رتی برابر فیض نہ آیا۔ سب نے میری بات کی تصدیق کی۔

## ۴۵۔ درود شریف اور جذب

قوالی کی ایک محفل میں ایک صاحب پر شدید وجد و حال طاری ہوا۔ فرمایا۔ رسول اللہ کہو، درود پڑھو سکون ہو جائے گا۔ درود شریف باعث تسکین قلب ہے۔ اسی سے ساری کائنات کا قیام ہے۔ حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ اور ملائکہ درود پڑھ رہے ہیں۔ "ھُو" میں کسی اور کی گنجائش نہیں، سارا عالم بھسم ہو جاتا ہے۔ انبیاء تک حضور انورؐ کے پاس سہارا لیتے ہیں۔ توحید میں حرارت ہے۔ رسالت میں ٹھنڈک ہے کتنا ہی زیادہ حقیقی جذب کیوں نہ ہو۔ درود شریف پڑھنے پر جذب رفع ہو کر ہوش و حواس درست ہوتے ہیں۔ ورنہ سمجھو کہ مصنوعی جذب ہے، یہی اس کی پہچان ہے۔ اس طرح بڑے بڑے مجذوبوں کو آزمایا گیا ہے۔

ایک دفعہ مولانا عبدالقدیر صاحب حسرتؒ کے پاس قوالی تھی۔ ایک درویش کو اپنی توجہ کی قوت کا دعویٰ تھا۔ انھوں نے توجہ دے کر واقعی پوری محفل کو بسمل بنا دیا۔ اس کے بعد مجھ پر توجہ دینے کا خیال ظاہر کیا۔ میں نے کہا، بسم اللہ کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں ڈیڑھ گھنٹہ زور آزمائی کی، تھک کر چور ہو گئے۔ مخلص تھے، اپنا کان پکڑ کے سب کے سامنے کہا، ہار مانتا ہوں، معافی چاہتا ہوں۔ آئندہ ایسا دعویٰ نہ کروں گا۔ آپ نے تو میرے جذب توحید کی انگیٹھی ٹھنڈی کر دی۔ اس کو روشن کرنے میں مجھے عرصہ لگے گا اصل راز یہ ہے کہ میں رسالت کے تحت درود شریف کے ذریعہ حضور انورؐ کے پاس تھا

فانی فی اللہ اور باقی باللہ اور واصل کامل ہو۔

## ۴۴۔ خاص و عام محفل قوالی

اولیاء اللہ جو عوام کو اپنی محفلوں میں نہیں آنے دیتے۔ دین و ایمان کے تعلق سے اس میں حکمت ہوتی ہے بخل نہیں، بلکہ طالبوں کی حفاظت مقصود ہوتی ہے بعض وقت ایسی باتیں بیان میں آتی ہیں جن سے کسی کو اختلاف ہوتا ہے حجت تمام ہو کر اس کا ایمان سلب ہو جاتا ہے۔ اولیاء اللہ کی محفلوں میں ایک جہت تعمیم کی ہوتی ہے اور ایک جہت تخصیص کی، عام محفل میں وہ ایسے اعتبارات رکھتے ہیں کہ اولیا فیض ہوتا ہے جو سب کو حاوی ہو اور خاص محفل میں خاص خاص لوگ ہی آسکتے ہیں اگر کوئی دوسرا آئے تو فیض بند ہو جاتا ہے۔

حضرت شاہ کلیم اللہ جہان آبادیؒ اپنے ایک امیر مرید کے گھر قوالی کا انتظام فرماتے تھے۔ خاص خاص اصحاب آتے۔ ایک دن اُن امیر کے دوسرے امیر دوست نے اصرار کیا تو شرکت کی اجازت دیدی۔ سماع شروع ہوا۔ حضرت نے تھوڑی دیر بعد فرمایا۔ کیا کوئی نیا آدمی ہے؟ فیض بالکل بند ہے۔ مرید نے کہا، میرے ایک دوست حضرت کے معتقد آئے ہیں۔ ناخوش ہو کر وہاں سے روانہ ہو گئے۔ راستہ بھر سربازار اس امیر نے اپنی دستار حضرت کے قدموں پر رکھی ساری خلقت کے سامنے معافی چاہی لیکن حضرت نے توجہ نہ فرمائی اور گھر تشریف لے گئے۔ اس کے بعد اس امیر نے کہلایا میں خطا وار ہوں۔ حضرت کی ناراضی کے بعد اس دنیا میں رہنا نہیں چاہتا۔ حضرت نے اس کے اخلاص کے مدنظر اپنا چغہ عطا فرمایا۔ لوگ حیران رہ گئے اور عرض کیا۔ چغہ تو خلافت کی نشانی ہے۔ فرمایا۔ جس مرتبہ کے اخلاص کا سربازار اس امیر نے اظہار کیا ہے۔ اس اخلاص کا یہی بدل ہے۔

فرمایا۔ میرے گھر میلاد شریف کی قوالی سال میں ایک مرتبہ بڑے اہتمام اور

بتاؤں کہ اللہ تعالےٰ تم سے کتنا بڑا کام لے رہا ہے۔ اسے معمولی نہ سمجھو۔ مسجد میں تو ہر کوئی وعظ کہتا ہے اور وہاں سننے والے موجود ہوتے ہیں لیکن تم نے سینما جانیوالوں کو وعظ کہا ہے جس کو دوسرے نہیں کر سکتے۔

اصل میں سینما کی طرزیں بچوں بڑوں میں مقبول ہوتی ہیں۔ گو اُن میں اچھے شعر برائے نام ہوتے ہیں۔ تم نے اُن کی مقبول طرزوں میں بہتر خیالات اور کلام دیدیا، جو بڑی خدمت ہے۔ جب بچے دوا نہیں کھاتے اور چاکلیٹ چاہتے ہیں تو چاکلیٹ یا مٹھائی میں دوا رکھ کر بچوں کو کھلاتے ہیں تو دوا کا فائدہ ان کو پہنچتا ہے۔ اس طرح تم نے فلمی طرز پر جو نظمیں ڈھالی ہیں وہ گویا چاکلیٹ ہیں جس میں اللہ، رسولؐ اور اولیاء اللہ کی محبت بھری ہے۔ پبلک اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ یہہ بہت بڑی خدمت ہے، ممکن ہے تم نے شوق میں کیا ہو، اہمیت سے واقف نہ ہو۔ لیکن یہ توفیق کی چیز ہے۔ گو کلام ناقص سہی، لیکن محبت اور غیرتِ دین کا آئینہ ہے۔ بعض شعر تو تمہارا حصّہ ہیں۔ خصوصاً فلم شباب (جلے) پر نظم خوب ہے اسے نمبر ایک یا آخر میں رکھو تاکہ اس پر دل ٹھیرے۔ میں نے معنے کی وضاحت کے لئے اپنی طرف سے اس نظم میں ڈھائی شعر کا اضافہ کیا ہے۔ جس پر وہ بہت خوش ہوئے حضرت شائق اور حمزہ حیدرآبادی مرحوم نے بھی اپنے زمانہ کی تھیٹروں اور طوائفین کی مقبول ہندی، اُردو بحروں میں نعتیں لکھیں جو بہت مقبول ہوئیں۔

## ۴۸۔ فقیری کے نکتے

۱۔ عبادت توجہ اِلیٰ اللہ کا نام ہے۔ ہر نعمت و رحمت کو اُس کے حبیبؐ کا صدقہ جانیں۔

۲۔ فقیر سے بات کرنی بہت مشکل ہے۔ وہ حکمت و فراست سے ایسی بات کہہ دیتا ہے کہ سب لاجواب ہو جاتے ہیں۔

۳۔ کوئی چیز خیر محض نہیں، البتہ خیر غالب کہہ سکتے ہیں۔ خیر محض اللہ کی ذات ہے۔

رسالت میں ٹھنڈک ہے توازن ہے۔ وہاں کون زور چلا سکتا ہے۔ وہ خود ٹھنڈے ہو گئے

## ۴۶۔ اُردو نعت

اُردو میں محسنؔ کاکوری اور کیفؔ ٹونکی وغیرہ نے خوب نعتیں کہی ہیں۔ ان کی بندشیں غالبؔ و سوداؔ کے قصیدے کی طرز پر ہیں۔ ان میں محبت کا خوب جوش ہے کیف ہے لیکن ان میں اعلیٰ معارف وحقائق کا بیان کم ہے۔ وجہ یہ کہ معارف ان کا میدان نہیں، البتہ محبت کے میدان کے مرد ہیں کلام میں محبت کا توازن اور علمی حقائق کا بیان بڑے پیمانہ پر ہونا بھی ضروری ہے۔ اسی کے ساتھ عبدیت کے چھینٹے ایسے دیئے جائیں کہ شائخ و وہابی دونوں دم بخود رہیں۔ وہابی عبدیت پر زور دے کر اپنا مطلب نکالنا چاہتے ہیں کہ رسول کچھ نہیں۔ حالانکہ قرآن کی رُو سے اسی عبدیت میں انتہائی رفعت و محبوبیت مُندرج ہے۔

(افسوس ہے کہ نعت میں قصیدۂ بُردہ شریف، اور درود شریف میں دلائل الخیرات جیسی کتابیں حرمین شریفین میں ممنوع ہیں اور ضبط کرلی جاتی ہیں۔ ملمؤلف حلیم)

## ۴۷۔ فلمی طرز پر نعتیں

فریدالدین متین اور یوسف خلیق دو ہونہار نوجوان نے فلمی طرز پر نعتوں کا ایک مجموعہ مرتب کیا جو ندرت و اپج کے لحاظ سے مجھے پسند آیا۔ یہ مجموعہ میں نے حضرت کی خدمت میں پیش کیا آپ نے اس خاص خدمت پر اظہارِ خوشنودی فرمایا اور ہمت افزائی کے لئے ان نوجوانوں کو بلایا اور فرمایا۔ یوں تو شہر میں بیسیوں شاعر ہیں۔ میں کسی سے نہیں ملتا! ورنہ میرے پاس وقت ہے۔ لیکن تم بچوں کو دیکھنے کا خیال اس لئے آیا کہ تم نے اپنے لئے ایسا میدانِ عمل اختیار کیا ہے جس میں کسی اور شاعر نے قدم نہیں رکھا۔ اس میں ندرت اور اپج ہے۔ قرآن میں حکم ہے۔ تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى (۵/۲) نیک کام کرنے والوں کی خدمت دامے، درمے، قدمے، سخنے ہونی چاہیئے۔ بعض وقت کام تو بڑا کرتے ہیں لیکن اس کی اہمیت سے واقف نہیں ہوتے۔ اس لئے میں نے چاہا کہ تمھیں

یہ تو مدینہ کی خاک پر لوٹا ہوا فقیر ہے (۱۶) عمل میں اخلاص، بے نفسی ہو تو اللہ کی طرف سے حفاظت یقینی ہے (۱۷) مخلصین کی جماعت ہمیشہ غیب سے بنتی ہے بنائی نہیں جاتی نظم قایم ہوتا ہے قائم نہیں کیا جاتا۔ (۱۸) اللہ کو سب کچھ معلوم رہنے کے باوجود اس سے دعا کرنا ربط کا اقتضا ہے عبدیت ہے۔ (۱۹) اُس گستاخی پر زبردست مار پڑتی ہے جب کوئی شخص نفسانیت کا کام کرکے للّٰہیت وخلوص کی توجیہہ کرے۔ نفسانیت کے کام پر گناہ کا اقرار ہو یا سکوت۔ (۲۰) اگر غوث اقطاب کی ساری عمر کی حضوری کی عبادتیں ملائی جائیں تو رسول کریم صلعم کے ایک گھونٹ پانی پینے کی نیکی کے برابر نہیں۔ (۲۱) عارفین اللہ کو خطرہ کے مقام پر وکیل بناتے ہیں۔ ربوبیت سے خطرہ کے ذریعہ ربط پیدا ہوتا ہے۔ (۲۲) اصول یہ ہو کہ کسی بُرے سے بُرے شخص کو اندرونی دِل سے بُرا نہ جانیں سزا بھی دیں تو اس معاملہ کی شدّت دل کے اندرونی پردہ میں نہ رہے۔ (۲۳) انکسار وہ کرے جو بڑا ہو کر اپنے کو چھوٹا سمجھے یہاں کچھ ہیں ہی نہیں۔ یعنی عدم محض ہیں تو یہ بے معنی لفظ اپنے لئے کیسے استعمال کریں۔ (۲۴) ہر وقت شر تیار ہے لیکن فضلِ الٰہی خیر بھیج رہا ہے۔ شر کے امکان کی وسعت خدا کی پناہ (۲۵) بے نفس بندہ کو مصیبت میں وہ لطف آتا ہے جو نفسانیت والے کو نعمت میں نصیب نہیں ہوتا تو پھر بے نفس بندہ کی نعمت کا کیا عالم ہوگا۔ (۲۶) ظالم رہنے سے مظلوم رہنا بہتر ہے۔ اللہ کی حمایت مظلوم کے ساتھ ہے۔ ہمیشہ مدافعت پر رہیں حملہ کرنے والا ہمیشہ خطرہ میں رہتا ہے۔ (۲۷) کسی کی پریشانی کے علم کے بعد اُس کی مدد لازم ہو جاتی ہے۔ زیادہ تحقیق مناسب نہیں۔ اللہ تعالیٰ اسکی حال وعلم کو قبول فرماتا ہے۔ (۲۸) اکثر اس راز سے بے خبر ہیں کہ ایمان پر ٹھیرنے ہی سے توحید کھل جاتی ہے لیکن ان کو معلوم نہیں ہوتا کہ توحید کھلی۔ (۲۹) خواب میں گھر دیکھیں تو حدیث شریف کے لحاظ سے گھر سے قرب اور ذات کی تجلی مراد ہے

۴۔ رشک محبوب ہے۔ حسد مذموم ہے۔ رشک کے معنی یہ ہیں کہ ہم دوسروں کی طرح اچھے ہو جائیں حسد کے معنی یہ کہ دوسرے ہم جیسے بُرے ہو جائیں۔

۵۔ جو چیز حکمت کے تحت اسباب کے پیچول کے ساتھ آتی ہے اُس کو رد کرنا ہو تو اسماء کے ساتھ لپیٹ کر اُلٹے پیچ آہستہ آہستہ کھولنے پڑتے ہیں عجلت نہیں کر سکتے۔

۶۔ نسبت کے لحاظ سے وقت پر، علاج وغیرہ کے لئے جو قرانی اعتبار قلب میں آئے وہی مفید ہوتا ہے۔

۷۔ اولیاء اللہ کی شان میں بے ادبی کے بعد سر پٹک لیں تو قلب میں ایک چیز نہیں اُتر سکتی۔

۸۔ وہ فقیر ہی کیا جس میں استغنیٰ نہ ہو۔ اللہ تعالےٰ فقیر کی غیرت کو ضائع نہیں کرتا جب وہ منشائے الٰہی کے تحت کسی پر بار نہ ڈال کر تکلیف میں بیٹھ جاتا ہے تو غیب سے کشود کار ہوتا ہے۔

۹۔ تجربوں اور استدلال کے بعد جو علم ملتا ہے وہ فیضان نہیں۔ فیضان یہ ہے کہ صحیح اعتبار بلا تکلف قلب میں آجائے۔

۱۰۔ بڑی سی بڑی مصیبت آئے تو فکر کی بات نہیں۔ اپنے کام جاری رکھو تاکہ قوتِ ارادی اور اعصاب اچھے رہیں۔

۱۱۔ سعی، قابلیت بھی نعمت ہے لیکن اپنی ذات کی طرف خیال نہ جائے۔

۱۲۔ مقامِ قرب میں تعریف اور شہرت کی خواہش بدترین چیز ہے۔

۱۳۔ فطرۃ اللہ اور قانونِ فطرت ایک ہی بات ہے۔ اجمال تفصیل کا فرق ہے۔

۱۴۔ ایک دفعہ کی رفع حاجت میں اللہ کے فضل کا جو ظہور ہے اس کا شکرانہ تمام عمر کی طاعت گذاری اور عبادات سے نہیں ہوسکتا۔

۱۵۔ ایک عارف کی تدفین کے موقع پر دوسرے عارف نے کہا۔ اللہ نکتہ نواز ہے

۴۱۔ زینت و آرائش کرنا اقتضائے مسرت و محبت ہے۔

۴۲۔ ہر چیز جتنی فطرت سے قریب ہوگی مفید ہوگی اور جس قدر فطرت سے دور ہوگی فائدہ سے دور۔

۴۳۔ لطافت میں قوت ہے۔ جو چیز جتنی لطیف ہوگی قوی ہوگی۔ مثلاً مٹی سے زیادہ قوت پانی میں ہے۔ اور اسی نسبت سے ہوا۔ آگ۔ نور وغیرہ میں۔ اِنَّ رَبِّی لَطِیْفٌ لِّمَا یَشَاءُ۔ (۱۳/۵)۔

## ۴۹۔ نفسیاتی نکتے

۱۔ قانونِ فطرت ہے۔ اعتماد کرو تو دوسرا اعتماد کرے گا۔ ورنہ وہ بھی بے اعتمادی کرے گا۔

۲۔ علاج میں نفسیات و اعصاب کام کرتے ہیں۔ اعصاب کا اندرونی حصہ نفسیات ہے اور وہی سب کچھ ہے۔

۳۔ تعلیم و تلقین میں حکم دینا اصول کے خلاف ہے۔ البتہ اشارے کئے جائیں کہ وہ موثر ہوتے ہیں۔ چاہے تو کوئی اختیار کرے ورنہ نہیں۔

۴۔ سزا اتنی موثر نہیں جتنا کہ سزا کا خوف۔ خوبی اور سمجھ سے خوف کو برقرار رکھنا کمال ہے۔

۵۔ ڈسپلن کے معنیٰ یہ ہیں کہ ہر شخص اپنے فرائض کا ذمہ دار ہے۔ ذمہ داری محسوس کرتا ہے اور پوری کرتا ہے۔ لہٰذا اعتماد کریں اور کنٹرول کریں۔

۶۔ نصیحت کا قاعدہ یہ ہے کہ غیر شعوری حالت میں بات پہنچا دی جائے علم و شعور کو بیدار کر کے سمجھانا زیادہ موثر نہیں ہوتا۔

۷۔ قوتِ مردمی جتنی زیادہ ہوگی اتنا زیادہ کنٹرول ہوگا۔ کنٹرول کا نہ ہونا کمزوری کی علامت ہے۔ انتہائی جوش بلکہ خواب میں رُکنا کمال ہے۔

۸۔ اپنی طرف سے چھیڑ شروع نہ کرو لیکن اگر کوئی چھیڑ شروع کرے تو آخیر تک

۳۰۔ بندہ کسی کام کو شروع کرکے اعلان کرے اور دوسرے لوگ اس پر ہنسیں تو اللہ کو بندہ پر غیرت آتی ہے اور وہ کام مکمل ہوجاتا ہے۔

۳۱۔ دل میں کسی کے متعلق اچھا یا برا جو خطرہ آئے گا وہ مخلوق کے دلوں پر اپنا اثر ضرور دکھائے گا۔

۳۲۔ جو شخص کھانے کی برائی کرے وہ ہمیشہ مفلس رہے گا۔ سب کچھ رکھ کر محروم رہے گا۔

۳۳۔ ہمیشہ اچھی مثال دینی چاہیئے۔ بری چیز کی تمثیل دے کر کسی کا دل نہ دکھائیں یہ بدمذاقی ہے بعض لوگ کہتے ہیں۔ آپ کے بچہ کی عمر کا ہی ہمارا بچہ مرا۔

۳۴۔ سب سے بڑی عقل مندی یہ ہے کہ ہم پر اپنی بے وقوفیاں کھل جائیں۔

۳۵۔ ناشکری برکت کی دشمن ہے۔ دوسری دشمن نسبت کی خرابی ہے۔ اس لئے اچھی نسبت کے ساتھ شکر میں لگے رہیں۔

۳۶۔ جب انتہائی کوشش و دعا کے بعد کامیابی کے آثار پیدا ہو ہو کر کوئی چیز نہ ملے تو اس میں بڑی حکمت و خیر ہوتا ہے۔ اس کو رسماً خیر نہ سمجھیں بلکہ قلباً راضی رہیں مقصود حاصل ہوگا۔

۳۷۔ بے اصولی نفس ہے اصول سکون بخش ہے۔ اصول کے تحت رہیں تو اللہ کو غیرت آتی ہے اور مدد فرماتا ہے۔

۳۸۔ حال و قوت کا ظہور خطرہ کے بغیر نہیں اور خطرہ بندہ کا اختیاری نہیں۔

۳۹۔ جس دل میں ایمان ہے اس میں اطمینان ہے جس میں اطمینان ہے اس میں قوت ہے جس میں قوت ہے۔ وہ مشکلات پر غالب آتا ہے۔

۴۰۔ کسی ولی سے استفاضہ مقصود ہو تو صفر درجہ پر رہیں۔ قلب کو صاف تختہ بنالیں تو ملاقات مفید ہوگی۔

# فصل ششم

## ارکانِ اسلام ـ صفاتِ ایمان

**۱۔ اسلام ہی دنیا کا حل**

فرمایا۔ دنیا کی تاریخ میں اسلام سے بڑھ کر کسی تحریک نے انقلاب نہیں کیا۔ اس کی برکت سے دیگر ادیان شرک سے گھبرا رہے ہیں، انکار کر رہے ہیں، تاویل کر رہے ہیں۔ ع
کافر نتوانی شد ناچار مسلماں شو۔ فطرت پر رہیں تو اسلام کی طرف آنا لازمی ہے دوسرے ادیان اسلام پر طعن کرتے تھے۔ اب بخوشی اسلام کے مختلف احکام روز بروز اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ پھر بھی بہت سے ممنونیت کا اظہار نہیں کرتے مثلاً غیر قوموں کو اسلام کے احکام عقدِ بیوگان، خُلع، طلاق، وراثت، حُرمتِ سود وغیرہ پر اعتراض تھا۔ لیکن اب بعد از خرابئ بسیار، اسلام کے مطابق قوانین بنا رہے ہیں۔ چار شادیوں کے جواز پر اعتراض تھا۔ اب یورپ وغیرہ میں اتنی آوارگی پھیلی اور پھیل رہی ہے کہ گو ظاہر میں ایک کی پابندی ہے، لیکن بہت سے تو شادی ہی نہیں کرتے۔ آوارگی میں کوئی گنتی مقرر نہیں ہے۔ اور نہ حقوق و فرائض اور ذمہ داریوں کا احساس ہے۔ حیوانیت کے مظاہرے ہیں۔ فطرت (اسلام) کہتی ہے کہ لڑائی کے موقع پر مدافعت کرو۔ مقابلہ کرو۔ انتقام لو یا معاف کرو۔ فطرت اس سے اِبا کرتی ہے اور دنیا میں کسی قوم کا اس پر عمل نہیں کہ کوئی ایک

پورا مزہ چکھاؤ۔

۹۔ کسی کو مشورہ دینے میں شدت و اصرار سے کام نہ لیں۔ صرف اشارے کریں تو کامیابی ہوگی۔

۱۰۔ اصول یہ ہو کہ ہر ایک کا بیان سنے۔ تعارض نہ کرے اور جب تک ضرورت نہ ہو اختلاف کا اظہار نہ کرے۔ ہر ایک کو اختلاف کا حق دے۔

۱۱۔ اکثر بے جا مروّت میں نفاق ہوتا ہے کیونکہ دل راضی نہیں رہتا۔

۱۲۔ ماننا اور ہے، احساس اور ہے۔ کسی کو قائل کر سکتے ہیں لیکن احساس بدلنا اور چیز ہے۔

۱۳۔ انسانی نفسیات یہ ہے کہ پیار سے بے زار اور دھتکار پر نثار۔

۱۴۔ ہر فن میں اس کے اصول (روح) کو معلوم کریں۔ اس کے بعد سینکڑوں شکلیں خود بنا سکیں گے۔

۱۵۔ مداخل سے پہلے مخارج کو سوچنے والا عقلمند ہوتا ہے۔

۱۶۔ مذاق میں کبھی تعلّی نہ کرے۔ اور نہ کسی کو حقیر سمجھے ورنہ سخت نقصان ہوگا۔

۱۷۔ قوتِ ارادی، طبیعت اور دماغ کے اثر کے تحت عمل وقوع میں آتا ہے۔ یہ غلط ہے کہ علم سے عمل پیدا ہوتا ہے۔ البتہ اگر کوئی عمل کرنا چاہے تو علم مُعِین ہوتا ہے۔

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد
پہ طبیعت ادھر نہیں آتی

ہوجاتے ہیں۔
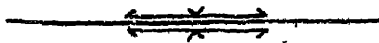
**۳۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی کُلِّ حَال** دائماً مسرور رہنا ناممکن ہے جو محض فلسفہ ہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی کُلِّ حَال کا مطلب لوگوں نے غلط سمجھا۔ انبیاء اولیاء پر غم کی تجلّیاں رہیں تو عمریں تڑپ میں گزار دیں مثلاً حضرت یعقوبؑ، حضرت ایوبؑ۔ نعمت کی جدائی پر رنج فطری ہے۔ خود حضور صلعم حضرت ابراہیمؓ کے وصال پر آبدیدہ ہوگئے۔ ہر محل کا اقتضا ہے منشائے الٰہی کی تکمیل مقصود ہے۔ ہر وقت خوشی کیسے ممکن ہوسکتی ہے، جبکہ جلال و جمال کی تجلیاں ہورہی ہیں۔ اس کے معنی یہ ہونگے کہ فسق و فجور، کفر والحاد، بلکہ بیماری، موت پر بھی الحمد اللہ ہو، مسرّت ہو جو جہل محض ہے۔ اگر کوئی موت یا مصیبت پر شکر کرے تو دعویٰ استقامت ہے جو شرک ہے۔ ایسے موقعوں پر اولیاء اللہ نے جو شکر ادا کیا ہے۔ وہ صبر و استقامت اور توبہ کی توفیق و عطا پر تھا جس پر الحمد للہ کہا۔ نعمتوں پر شکر و مسرّت اور الحمد للہ تو ہونا ہی ہے۔ اس کی تمیز ضروری ہے۔

مصیبت میں عروج سکنڈ وِل میں ہوتا ہے اور نعمتوں میں عروج بر سول میں ہوتا ہے شکر کا سلوک مشکل ہے۔ صبر کا سلوک نسبتاً آسان ہے کہ چار و ناچار صبر کرنا ہی پڑتا ہے۔

ایک صاحب نے کہا، ہم الحمد للہ کہتے ہیں۔ ہر نعمت کو اللہ کی جانتے ہیں۔ فرمایا، آپ کو اس کی ہوا نہیں لگی۔ بزرگوں سے یہ الفاظ سن لئے ہیں۔ سمجھے نہیں اور نہ یہ آپ کا حال ہے۔

**۴۔ بہترین حال و ترقی** ایک تو محض اعتقاد ہوتا ہے کہ ہم کو اللہ نے جس حال میں رکھا وہ بہترین حال ہے۔ یہ بھی

کلہ پر طمانچہ مارے تو دوسرا کلہ بھی پیش کرے۔ خاموش رہے۔ اِس لئے تمام غیر مسلم منصف مزاج محققین اس وقت کہہ رہے ہیں کہ دنیا میں اسلام ہی زندگی کے ہر مسئلہ کا حل ہے۔ لہٰذا اگر دنیا کو ہر قسم کی تباہی سے بچانا مقصود ہو تو اسلام کی طرف آنا لازمی ہے۔

## ۲۔ اسلام کے ارکان

اسلام ایک نظام ہے۔ انسان اس نظام کی جان ہے۔ وہ مقصدِ کائنات ہے۔ قرآن و رسالت سے فیض حاصل کرنے کا ذریعہ صرف ایمان ہے۔ بعض مذاہب سے وابستگی کے لئے کوئی حدود معیار مقرر نہیں لیکن اسلام کے حدود واضح معیّن ہیں۔ قرآن کی رو سے اسلام کے پانچ ارکان ہیں۔ کلمۂ طیبہ یعنی توحید و رسالت کا اقرار۔ نماز روزہ۔ زکوٰۃ۔ حج۔ ایمان کے صفات یہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ۔ اس کے رسولوں کتب سماوی۔ ملائکہ۔ تقدیر۔ خیر و شر۔ اور حیات بعد الموت (حشر و نشر) پر ایمان لانا۔ ان کی تفصیلات پر ہم مکلّف نہیں۔ کیا قرآن سب پر منکشف ہوا کسی پر کچھ آیتیں کھلیں تو کسی پر کچھ۔ ہر معاملہ میں یہ کہنا چاہیئے کہ اللہ رسول کا جو علم ہے اس پر ہمارا ایمان ہے۔ اس ایمان پر مومنین کو رَاسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ (۳/۷) یعنے علم میں پکّے کی قرآنی سند ملتی ہے۔ اس کے بعد ایمان کے مقابل میں کسی کی پرواہ نہ کریں۔ اور نہ اُسے دماغی لحاظ سے سمجھانے کی کوشش کریں ہم داروغہ نہیں۔ اگر ہم ایمان پر جمیں تو فراستِ ایمانی عطا ہوتی ہے جو ان معترضین کے مقابل تعلیم و تبلیغ میں کام آتی ہے۔ ایمان و ادب ہدایت کی جان ہیں۔ اور تقویٰ کے بعد اللہ خود معلّم بن جاتا ہے۔ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ (۲/۲)

انبیاء اور اولیاء اللہ سے محبت ہی کا نام دین ہے۔ دین کا مقصد اہل اللہ کی محبت پیدا کرنا ہے اور بس جب محبت پیدا ہو تو ضمناً تمام محاسنِ اسلام حاصل

ہے کہ اس میں نفس کی شکستگی ہوتی ہے۔ انفعال ہوتا ہے۔ گناہوں سے توبہ ہوتی ہے۔ عدم اصرار و تکرار کا وعدہ ہوتا ہے۔ اسی شکستگی کو اللہ پسند فرماتا ہے۔ دعا قبول ہوتی ہے اور تائب محبوب ہو جاتا ہے۔ وَاللّٰہُ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ (۲/۲)

مصیبتوں میں پریشان ہو کر کبھی یہ نہ سمجھیں کہ اللہ نہیں سنتا ہے۔ اِنَّ رَبِّیْ لَسَمِیْعُ الدُّعَاءِ (۱۳/۱۸) اِنَّ رَبِّیْ قَرِیْبٌ مُّجِیْبٌ (۱۲/۹) یعنی میرا رب دعا کو ضرور سنتا ہے۔ قریب ہے، قبول بھی کرتا ہے۔ البتہ جو چیز مضر اور نامناسب ہو ہمیں نہیں دیتا۔ ایک اور راز یہ ہے کہ کہیں ہمارے فسق و فجور کی وجہ سے یہ مصیبتیں نہ آ رہی ہوں اس کے لئے پڑھتے ہیں۔ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِیْنَا اَوْ اَخْطَأْنَا الخ (۳/۸)

**۶۔ دعا کا راز** ذکر اللہ کے بعد دعا کا بھی بڑا مقام ہے۔ تمام انبیاء و مرسلین نے دعائیں مانگی ہیں۔ وجہ یہ کہ عبدیت و ربوبیت کا یہ خاص اقتضا ہے کہ بندہ مالک سے مدد مانگے۔ محتاج غنی سے طالبِ امداد ہو۔ دعا نہ مانگو تو یہ ربط مُستَتر رہ جائے۔ چنانچہ قرآنِ کریم دعاؤں سے بھرا ہوا ہے اور دعا کی تاکید ہے۔ قبولِ دعا کا وعدہ ہے البتہ دعا کی طرح دعا مانگے۔ اکثر دعا جو دل سے نکلتی ہے قبول ہوتی ہے۔ اگر کبھی قبول نہ ہو یا تاخیر سے قبول ہو تو بد دل نہ ہونا چاہیئے۔ ہماری جہالت کی مضرتت سے ہم کو محفوظ رکھنا قبولِ دعا کی یہ بھی ایک شان ہے۔

یہ عالم جلال و جمال کی تجلیوں سے بھرا ہوا ہے۔ آج کل جلال کا زور ہے۔ اس کے تحت خوب دعا کریں اور امید وار رہیں۔ ہمارا فرض دیوٹی انجام دینا ہے۔ نتیجہ کے ہم پابند نہ ذمہ دار۔ یہ بات کہنے میں آسان ہے لیکن سب میں چور رہتا ہے۔ اور ہر شخص دعا کے بعد لزوم جانتا ہے کہ اس کی دعا سے ایسا ہونا تھا یہی غلط اعتبار ہے۔ اپنا فرض کامل سپردگی ہے جس کے بعد نتیجہ سے بے فکر ہوں لیکن ایک

درست ہے لیکن مجھے تو یہ دکھایا، بتایا یا سمجھایا جاتا ہے کہ تم بہترین حال میں ہو۔ حتٰی کہ بعض موقعوں پر کسی ترقی کا نہ ملنا خود خیر بتایا جاتا ہے۔

یاد رکھو! اس عالم میں تدبیر کو اتنا ہی دخل ہے جتنا کھانے میں نمک کو۔ اس میں سکون اور امن ہے۔ اس سے زیادہ کا نتیجہ حیرانی پریشانی ہے۔ جو مقدّر ہے وہ ہو کر رہے گا۔ تجربہ کریں تو زیادہ تدبیروں کا نتیجہ بے شمار رکاوٹیں حیرانیاں ہی ہوتا ہے۔ ہم سے بعض کہتے ہیں کہ آپ کوشش و تدبیر کرتے تو اپنی صلاحیتوں کے مدنظر کیا کچھ نہ بنتے۔ وہ ترقی کا لفظ جانتے ہیں لیکن اس کے لوازم نہیں جانتے۔ ان لوگوں کی ترقی کے لوازم سے یہ ہے کہ وہ کسی تعیّنِ باطلہ کے بندے بن جائیں اور ترقی حاصل کریں۔ ان کے نزدیک اس کے بغیر ترقی متصوّر نہیں۔ اور اسے ہم کبھی گوارا نہیں کر سکتے۔ اصل ترقی دولت میں نہیں، بلکہ عبدیتِ الٰہی میں ہے۔ اور عبد کے استغنیٰ، غیرتِ دین، حق گوئی اور خودداری میں ہے کہ اپنی احتیاجی نسبت اللہ کے سوا کسی سے وابستہ نہ ہو۔ اور یہ اوصاف اِن اِلٰہِ بَاطِلَۃ کی عبدیت میں کبھی حاصل نہیں ہو سکتے۔

**۵۔ دعا کے لوازم**

ارشاد ہے۔ اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ (۲۰/۱) مصیبت کی دوری کے لئے اضطرار و بے چینی، دعا، دوا، سعی لازمی ہیں۔ ان میں کسر ہو تو دعا کی قبولیت رُک جاتی ہے۔ دعا کے معنی یہ ہیں کہ اسباب و عِلَل و حِکَم سے نظر اٹھا کر، قبولیت کی پوری امید کے ساتھ، اللہ تعالیٰ کی شانِ اقتدار پر نظر جما کر دعا کریں۔ ورنہ مادی نقطۂ نظر ہو گا جس میں قوت نہیں۔ صرف فضل پہ بھروسہ رہے۔ جب بندہ اضطرار میں دعا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ غیب سے کسی مقبول بندے کی شکل میں مدد کا انتظام فرماتا ہے۔ دعا کی حقیقت یہ

صراط الحمید جلد دوم ص۲۹ پر حضرت فرماتے ہیں۔

"مزید برآں دعا کی ایک لہر آتی ہے۔ یہ کچھ عجب ذوق ہے عجیب کیفیت ہے۔ ایک وقت ادراک ہوتا ہے کہ دعا کی کشتی میں مقبولیت کے بادبان لگے ہوئے ہیں۔ اور رحمت کی ہوا اُسے اُڑا لئے جا رہی ہے۔ ایک وقت ہے کہ ہوا کم ہے لیکن ہمت اور توجہ کے پتوار کشتی کو کھے رہے ہیں۔ کشتی آگے بڑھ رہی ہے لیکن کوشش کے ساتھ اور بعض وقت صاف معلوم ہوتا ہے کہ ہوا ناموافق ہے۔ ہزار پتوار مارے کشتی انچ بھر آگے نہیں بڑھتی۔ بلکہ پلٹا چاہتی ہے، ڈوب جائے تو عجب نہیں۔ ایسے نازک وقت کشتی آنا بڑی غلطی ہے۔ موقع پہچاننا لازم ہے۔ اور بڑا فضل اُس وقت ہے کہ جو دعائیں کبھی وہم و گمان میں بھی نہ گذری ہوں وہ بے تکلف دل میں اتریں۔ زبان پر آئیں اور مقبولیت کی خنکی سے دل باغ باغ ہو جائے لیکن جب کہ سوچی سمجھی دعائیں ہوا ہو جائیں۔ بہ تکلف بھی دل میں جگہ نہ پائیں محض برائے گفتن زبان پر آئیں۔ ایسی نامقبولیت سے اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے۔ اس کوچے میں عجب عجب احوال گذرتے ہیں ؎

عاقل را اشارہ کافیست

**۹۔ استغفار کی اہمیت** ایک مُسلم لیڈر نے طوفان باد میں جلسہ کے تمام خیموں کے اڑ جانے کا ذکر کیا تو فرمایا۔ آپ نے اس موقع پر اسلامی اسپرٹ دکھائی یا فرنگی ذہنیت۔ حضور انورؐ تو طوفان یا دو باراں کے موقع پر استغفار فرماتے تھے اور حضرت عمرؓ جوتی کا تسمہ ٹوٹنے پر توبہ استغفار فرماتے لیکن معلوم ہوا آپ لوگوں نے کوتاہیوں پر توبہ و رجوع الی اللہ کے بجائے غیر اسلامی طریق پر کہدیا پرواہ نہیں۔ ہم مستقل مزاجی دکھائیں گے اور طوفان کا مقابلہ کریں گے۔

سورۃ نوحؑ میں تمام آفات و بلیات سے بچنے کے لئے اور ہر مقصد کے حصول

محل تحتِ امتزاز کا ہوتا ہے جہاں اُتر جائیں تو کامیابی ہوتی ہے۔ اس کے لئے مزاج شناسی اور تمیز کی ضرورت ہے۔

**۷۔ دعا کا طریق** اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھنا چاہیئے کہ ہر چیز کا مالک و متصرف اللہ ہے، بندہ نہیں۔ ہماری دعا عام ہو۔ اگر کوئی چیز خصوصیت سے مطلوب ہو تو بہت احتیاط سے بقدرِ ضرورت عرض کرے۔ اضطرار کی بات اور ہے کہ وہ وقتی چیز ہے، جس کو دوام نہیں۔ اضطراری دعا قلبی تقاضوں کے تابع ہے اور بہت مقبول ہوتی ہے۔ کبھی مطالبہ یا حکم نہ کریں کہ یہ دعا قبول کرو اور خیر کرو۔ بلکہ یہ کہیں۔ اگر یہ میرے حق میں خیر ہو تو عطا فرمائیں۔ خیر کر کے دو، ہرگز نہ کہیں، یہ تو حکم کرنا ہے جو بے ادبی ہے۔ مار پڑنے کا اندیشہ ہے۔ اَسْتَغْفِرُ اللہ

عملیات میں دعا کے جو سیٹ پڑھے جاتے ہیں وہ نیچے مرتبہ کی چیزیں ہیں۔ بلند مقامات پر بہت احتیاط لازم ہے۔ بعض وقت منشاء کے خلاف دعا ہو تو نقصان پہنچ جاتا ہے۔ دعا کر کے مطلوبات و آثار کے ظہور پر اصرار کرنا بے ادبی ہے۔ اگر دروازہ بند ہو تو صرف دستک دے نہ کہ باہر نکلنے پر اصرار کرے ورنہ ملاقات سے روک دیا جائے گا۔ عام بات کہنا الگ ہے خصوصیت چاہنا الگ ہے۔ بعض وقت خلافِ منشاء کسی کے لئے دعا کرنے پر دعا تو قبول ہو جاتی ہے لیکن اس شخص کی مصیبت یا بیماری دعا کنندہ کے حصہ میں ڈال دی جاتی ہے۔ کسی کی دعا کی فرمائش پر ہرگز وعدہ نہ کرے، نہ دعا کرے۔ بلکہ دیکھے حالات کیا ہیں منشاءِ الٰہی کیا ہے۔ اس کے مطابق عمل کرے۔

**۸۔ دعا کی لہر** بالعموم دعا کا منشا حصولِ مقصد ہے۔ لیکن جب بندگی کا ذوق نکھرتا ہے تو دعا خود بھی مقصود ہو جاتی ہے گویا ؎

خدا اور بندے میں رشتہ دعا ہے  دعا جس کو کہتے ہیں خود مدّعا ہے

**۱۱۔ حضرت عمرؓ کی نماز**

ناچیز نے عرض کیا حضرت عمرؓ فرماتے ہیں میں نماز میں سارے امورِ مملکت طے کرتا ہوں۔ کیا اس سے حضوریٔ قلب میں فرق نہیں آتا۔ کیا فہم کلماتِ قرآنی لازمی نہیں۔ فرمایا۔ متوجہ الی اللہ ہونے کے بعد، رحمٰن اور ربّ العالمین سے کونسی چیز ہٹ سکتی ہے۔ اس توجہ خاص کے بعد جو تفصیلات معلوم ہونے لگیں گی وہ صراطِ مستقیم کے تابع ہونگی اور غلط راہ نہ ہوگی۔ اس کے بعد وہ چاہیں تو مملکت کے اسرار سمجھا دیں یا قرآن کے اصولی اجمالی علم کے بجائے تفصیلی علم کھول دیں جو حق اور مقصود ہوگا۔ جب ہم ربّ العالمین، رحمٰن، رحیم کی طرف متوجہ ہوں تو اب وہ جو چیز بھی دیں گے عالمین سے اور رحمٰن و رب کی تجلیوں سے ہٹ کر نہ ہوگی اس لئے وہ توجہ الی اللہ میں مانع نہ ہوگی۔

**۱۲۔ استخارہ**

ایک موقع پر استخارہ کا ذکر آیا تو فرمایا۔ استخارہ کے لئے خالی الذّہن رہ کر اللہ سے عرض کریں تو خود بخود کشود کار ہو جاتا ہے۔ اور فضل سے کام کی بات سوجھتی ہے۔ یہی اپنا استخارہ ہے۔

مجھے تو حضرت فاروقِ اعظمؓ کی نماز والا استخارہ ٹھیک معلوم ہوتا ہے کہ امورِ سلطنت وغیرہ کے متعلق تمام علم نماز میں مل جاتا تھا۔ نماز در اصل اللہ تعالیٰ سے سرگوشی ہے۔ مجھے بھی نماز میں مختلف خطرات آجاتے ہیں کہ فلاں چیز فلاں جگہ لکھو یا یہ کرو۔ لیکن جو لوگ حضرت عمرؓ کے خطراتِ نماز کو اپنی نماز کے وساوس پر قیاس کرتے ہیں ان کو حضرت عمرؓ کی نماز کی ہوا نہیں لگی۔

**۱۳۔ نماز اور تصوّرِ رسولؐ**

ایک سوال پر کہ نماز میں رسول اللہؐ کا تصور ہونا چاہیئے یا نہیں۔ فرمایا۔ نماز میں حق تعالیٰ کی تجلّیات پر نظر رہے ورنہ متجلّی (حق تعالیٰ) سے کیسے ربط پیدا ہوگا۔

کے لئے استغفار ہی علاج بتایا گیا ہے چنانچہ ارشاد ہے۔ فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ۔ إِنَّهُ كَانَ غَفَّارًا ۔ يُرْسِلِ السَّمَاءَ عَلَيْكُمْ مِدْرَارًا ۔ وَ يُمْدِدْكُمْ بِأَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ أَنْهَارًا ( ۲۹/۹ ) یعنے استغفار کی برکت سے رحمت و مغفرت، بارانِ رحمت مال و منال، آل اولاد، باغات و انہار، اللہ تعالیٰ عطا فرمائے گا۔ بے روزگاری دور ہو جائے گی۔ غفور و غفّار کے معنے صرف گناہ بخشنے والا نہیں۔ بلکہ یہ اتنا وسیع مفہوم رکھتا ہے کہ بیان میں نہیں آسکتا۔ مغفرت کے معنی نہ صرف معافی گناہ بلکہ دفعِ سیّات و رفعِ درجات ہیں۔

## ۱۰۔ فرض کی اہمیت اور وظیفے

فرمایا۔ کتاب "قادیانی مذہب" میں نے رمضان شریف میں لکھی۔ اس کام میں اتنا شغف رہا کہ نہ تلاوت کا موقع ملتا، نہ تراویح کا، نہ تہجّد کا۔ تینوں ت غائب تھیں۔ صرف ایک دھن خدمتِ دین کی تھی۔ فرض نماز اور اپنا کام تالیف کا۔ تعمیلِ فرائض میں اوّلیت و تقدیم کا لحاظ لازمی ہے۔ بعض لوگ اپنے روزانہ کے وظائف چھوٹنے پر افسوس کرتے ہیں۔ مجھے اپنے اوراد و وظائف کے چھوٹنے پر تکلیف نہیں ہوتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ إِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيْلًا ( ۲۹/۱۳ ) کی گویا اتباع ہے جب اس سے فرصت پا جائیں تو پھر وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيْلًا ( ۲۹/۱۳ ) ہے۔ ورنہ اُمت کا فرض، منصبِ رسالت کی اتباع (یعنی حقوق العباد) متاثر ہوتے ہیں جو سرکاری کام ہے۔ وَتَبَتَّلْ شخصی چیز ہے۔

قربِ فرائض سے متعلق بخاری و مسلم کی حدیث یہ ہے کہ میرا بندہ کسی ایسے ذریعہ سے قرب حاصل نہیں کرتا جو میرے نزدیک ادائے فرض سے زیادہ محبوب ہو

حضرت خوبصورت پلنگ پر سیج پر آرام فرما ہوئے۔ مولوی صاحب رات خوب عبادت میں مصروف ہوئے اور دل میں خیال کیا۔ اچھے مرشد ہیں، رات میں عبادت نہیں۔ دن میں دسترخوان اور قوالی سے فرصت نہیں، عبادت سے تھک کر ذرا لیٹے تو دیکھا کہ حضرت کے پلنگ سے عرش تک نور کا بڑا ستون کھڑا ہے۔ ہزاروں فرشتے حضرت کو دیکھ کر نور کے ستون پر پروانہ وار قربان ہو رہے ہیں۔ انھوں نے اپنی عبادات کے باوجود مثال میں اپنی حالت ایک ٹمٹماتے چراغ کی سی دیکھی۔ توبہ کی اور صبح حضرت کے قدموں پر گر پڑے اور معافی چاہی اور سارا حال بیان کر دیا۔

حضرت نے فرمایا۔ ماں کو بچہ پر سوتے میں بہت پیار آتا ہے۔ دراصل عارفِ کامل کا سونا، جاگنا تحتِ امر ہوتا ہے۔ ہر بات پر مدارج ہیں۔ سورۂ مزمل میں حضورؐ کو پیار سے کہا گیا۔ اے نبیؐ، آنا مت جاگو، سو جاؤ، دن میں تم کو بہت کام کرنا ہے!

**۱۶۔ رمضان کے روزے** بعض بچے اور بیمار روزہ کے معاملہ میں عزیمت پر عمل کرتے ہیں۔ رخصت (اجازت و رعایت) پر عمل نہیں کرتے۔ اسی روزہ کے بیان میں یُسر و عُسر کے احکام صاف ہیں۔ قانونِ صحت کی خلاف ورزی دراصل اللہ کی نافرمانی کے مرادف ہے۔ اگر روزہ کی وجہ سے سفر میں دقت ہو یا بیمار کا مرض بڑھنے کا احتمال ہو تو روزے ملتوی کرنے کا حکم ہے۔ کیونکہ اللہ ہمارے لئے آسانی چاہتا ہے تکلیف نہیں۔ منشائے الٰہی کے خلاف تکلیف جوئی، تکلیف پسندی نامناسب ہے۔ ایسا کرنے سے بعض شکلوں میں رہبانیت ہو جاتی ہے۔ اگرچہ عزیمت کے بھی اجر ہیں۔ ناگزیر حالات میں تو جہاد میں جان تک پیش کرنی چاہیئے۔

**۱۷۔ شبِ قدر** بعض کہتے ہیں۔ سب اوقات اللہ کے ہیں۔ سب برابر ہیں۔ کیا وجہ ہے کہ شبِ قدر ہزار مہینوں سے بہتر ہے اور بہت

علم صحیح کے مطابق جو کرو درست ہے۔ عرش سے فرش تک رسول اللہ ہیں کہ آپ تجلی اعظم ہیں۔ رحمۃ للعالمین ہیں عرش سے فرش تک رحمت ہی کا ظہور ہے۔ اَلتَّحِیَّات واجبات نماز میں ہے جس میں اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ اَیُّهَا النَّبِیُّ شریک ہے حضورؐ کے تصور کے بغیر آپ پر سلام کیسے ممکن ہے۔

## ۱۴۔ مسئلہ امامت

ہمارے پاس امامت کا مسئلہ ایسا نہیں جیسا کہ شیعہ صاحبان کے نزدیک ہے کہ امام معصوم ہو اور وہی نماز پڑھائے اور وہی دعا پڑھے۔ ہمارے پاس کسی شخص کو بھی امام بنایا جا سکتا ہے جس پر جماعت کا اتفاق ہو۔ اُسی امام کی دعا مقبول ہونا بھی ضروری نہیں، بلکہ مقتدیوں میں سے بھی کسی کی مقبولیت کی وجہ سے وہ دعا قبول ہو سکتی ہے۔ تحدید نہیں ہے۔

## ۱۵۔ بعض سونے والے شب بیداروں سے بہتر

حضرت مجدد الف ثانیؒ نے لکھا ہے نفل روزوں کے بہت ثمرات و ثواب ہیں لیکن ایک فقیرانہ نکتہ یاد رکھنے کے قابل یہ ہے کہ بہت سے کھانے پینے والے روزہ داروں سے بہتر ہیں۔ راتوں میں عبادت کرنے کے بڑے اجر ہیں لیکن بہت سے سونے والے رات کے عبادت گذار بندوں سے زیادہ اعلیٰ مرتبے اور ثواب پا جاتے ہیں۔ ہر چیز اپنے محل پر اہم ہے۔ اللہ کا فضل ہے، جسے چاہے دیدے۔ کیا معلوم کون، کس امر کے تحت کھاتا ہے، سوتا ہے۔ مثال میں فرمایا، ایک تنگ خیال، ظاہری معیار رکھنے والے مولوی صاحب حضرت نظام الدین محبوب الٰہیؒ کی خوبیاں سنکر مرید ہونے کے لئے آئے۔ دیکھا کہ حضرت دنیوی شوکت آرام و اسباب اور دستر خوان کی وسعت کے لحاظ سے بادشاہ کو مات کر رہے ہیں۔ آپ کے ملازمین کا لباس شاہی ملازمین سے بہتر تھا۔ حضرت نے رات اُن کو اپنے پلنگ کے قریب سونے کو فرمایا۔ دِن کا تو وہ حال دیکھا تھا۔ رات میں دیکھا کہ

جب اس رات کی یہ اہمیت وقوت ہو تو قرآن کی اور قرآن لانے والے کی کیا عظمت ورفعت ہوگی، قیاس سے باہر ہے۔

**۱۸۔ حج** فرمایا، حج کو وہی جائے جس کا نقطۂ نظر اور اعتبارات یہیں درست ہو جائیں ورنہ اُسے نقصان ہوگا۔ بے سروسامانی اور ہلچل کا عادی ہو تو جائے۔ صحت اچھی ہو کیونکہ سب ارکان قوت چاہتے ہیں۔ اس سفر میں عشق و محبت، بیماری وموت کے اعتبارات میں غرق رہے اور احرام کو کفن سمجھ کر باندھے اور مردہ پن طاری رہے۔ صبر اور اس کی توفیق پر شکر نصیب ہو کیونکہ وہاں صبر آزما واقعات پیش آتے ہیں۔ پہلے زیادہ تھے، اب بھی کافی ہیں۔ وہاں پر نظم وصفائی کی اُمید بے سود ہے۔ لاکھوں کا ہجوم، گھنٹوں میں کیمپ لگنا، منٹوں میں اُکھڑنا ہوتا ہے، جن کا نقطۂ نظر درست نہ ہو اُن پر رجعت پڑ جاتی ہے۔ ایمان تک خطرہ میں پڑ جاتا ہے۔ حج میں مرشد، مرید، باپ بیٹے تک کے تعلقات خراب ہوتے دیکھے ہیں۔ حتی الوسع غیروں، اجنبیوں کے ساتھ سفر کرے تو بہتر ہے۔ جدید ذہنیت کے لوگ تو وہاں کے انتظامات کو وحشیوں کے عمل جانیں گے۔ لندن، پیرس کی طرح اگر وہ وہاں انتظامات دیکھنا چاہیں تو ناممکن ہے۔ حج کے بعد حاجی کے احوال وروابط میں انقباض نہ ہو تو یہ مقبولیتِ حج کی علامت ہے۔

حج اور عام سفر میں یہ اعتبار رہے کہ ہمارا کسی پر کوئی حق نہیں اور نہ حق مطلوب ہے۔ اس میں عافیت رہتی ہے۔ ورنہ توقعات باندھنے سے رنجش، تلخی پیدا ہوتی ہے۔ بندہ کو نیک کام میں نیت وارادہ کا ثواب مل جاتا ہے۔ اس کو بھی توفیق و فضل جانے، اس نیت وارادہ کے بعد اللہ اگر مزید کام کرا دے تو اس کا فضل ہے اگر اپنے کو مختار سمجھے تو غلطی ہوگی کہ فلاں کام کیوں نہیں ہوا۔؟ گویا قدرت کا دعویٰ ہے۔ بندہ کو لا دعویٰ رہنا چاہیئے۔ رادّ عا و طلب نہ ہو کیونکہ وجود ہی اپنا

متبرک ہے۔ فرمایا، اگر ہم عقل سے غور کریں تو معلوم ہوگا کہ جمادات، نباتات، حیوانات میں بھی خاص اوقات ہی کو اہمیت حاصل ہے مثلاً موتی، مونگے، خاص زمانہ میں سمندر میں بنتے ہیں اور نکلتے ہیں حالانکہ سمندر وہی۔ ہوا وہی۔ بارش وہی اسی طرح خاص پھول خاص موسم ہی میں ہوتے ہیں اور ہوتے ہیں حیوانات کی پیدائش وغیرہ کا بھی یہی حال ہے بلبل اور دیگر پرندے صبح میں بولتے ہیں دوپہر میں خاموش۔ اسی طرح انسانوں میں بچپن کی کیفیت اور جوانی کی اور بڑھاپے کی اور مذہب نے بتایا ہر کام کا وقت اور محل اہمیت رکھتا ہے مثلاً اگر وقت پر نماز نہ پڑھیں تو قضا کی نوبت آئے بمقام عرفات پر خاص وقت میں قیام نہ کریں تو حج نہ ہو، دو فرض کے بجائے ہزاروں نفل ادا کریں تو اس کا مقابلہ نہ کر سکیں اللہ ہی نے بعض مہینوں اور وقتوں اور مقامات کو اہم بتایا۔ ان میں جو معروف و مشہور ہیں ان کی اتباع فرض ہے۔ اور اگر غیر معروف ہیں تو اختیاری ہے۔ البتہ کہانت و نجوم کی نحوست کو مومن علمِ صحیح سے دور کرتا ہے۔ نجوم کے آثار ہیں لیکن تارے مستقل، بالذّات اور موثر نہیں۔ اللہ موثرِ حقیقی ہے۔ تارے اللہ کے احکام کے تابع ہو کر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ان کی نحوست کو مومن حق کی قوت، ان شاء اللہ اور ماشاء اللہ سے توڑ دیتا ہے اور متاثر نہیں ہوتا۔

قرآن نے شبِ قدر کی بڑی فضیلت بیان فرمائی ہے۔ اس کی وجہ بتائی کہ اس رات میں قرآن اترا۔ قرآن کیا ہے۔ علمِ الٰہی ہے۔ اور عقل سے بھی دیکھو تو عالم میں علم ہی قوت ہے۔ چاہے ظاہری علم ہو یا باطنی۔ بڑے بڑے ہزاروں پہلوان ہوں لیکن ایک دبلا پتلا جوہری بم والا اپنے سائنس کے علم کی قوت سے سب کو ایک سکنڈ میں ڈھیر کر دیتا ہے۔ قرآن میں ظاہری و باطنی علوم ہیں، خیال کرو، وہ رات کتنی مبارک، اہم اور قوی ہوگی جس میں اتنی بڑی عظیم الشان قوتوں کا علم نازل ہوا

قرآن پڑھا کرتے ہیں۔ ہمارا ربط اور تھا، رسول اللہ صلعم زندہ مجسم قرآن ہیں، وہ جو علمِ دین ہم لیں قلب کہتا تھا، صاحبِ قرآن کے ہوتے قرآن کیسے پڑھیں مثلاً کسی عالم کے پاس جائیں تو اصل مقصود ملاقات ہونا چاہئیے۔ اس کے بعد اگر وہ خود پڑھے یا پڑھنے کو کہے تو اور بات ہے۔ مواجہہ شریف میں بفضلہ درودوں کے ساتھ کل وقت گذرا۔ تمنا تھی کہ مواجہہ شریف میں ایک رات تخلیہ ہو سکے۔ بفضلہ معمول کے خلاف خصوصیت سے اجازت مل گئی اور سرفرازی رہی الحمد للہ۔

**۲۱۔ محرابُ النبیؐ** مسجد نبویؐ میں ہر کوئی روضۃ الجنۃ میں نماز و تلاوت کی کوشش کرتا ہے لیکن محرابُ النبیؐ کی تقدیس کا کیا کہنا۔ اللہ اکبر! جہاں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم معمولاً نماز میں امامت فرماتے تھے، اس مقام کے نماز کی فضیلت بیان سے باہر ہے۔ ؎

بر زمینے کہ نشانِ کفِ پائے تو بود
سالہا سجدۂ صاحب نظراں خواہد بود

جس طرح عزیزوں کی طرف سے بیت اللہ شریف کا طواف کیا جاتا ہے اور مقامِ ابراہیمؑ اور حطیم میں نفل پڑھے جاتے ہیں، اسی طرح محرابُ النبیؐ میں اپنے سوا والدین اور مخلصین کی طرف سے نفل نمازیں پڑھی جاتی ہیں۔ جس کے خاص آثار ہیں۔

**۲۰۔ جہاد** وہ عارف ہی کیا جو مجاہد نہ ہو۔ باطل سے مقابلہ ہی عرفان ہے۔ اصل عرفان حق کو حق اور باطل کو باطل سمجھنا ہے۔ اور باطل سے مقابلہ کر کے اُسے شکست دینا ہی جہاد ہے۔ چاہے جسمانی ہو یا روحانی۔

ایک صاحب نے کہا "جب محبت ہی دین کا بڑا مسلک ہے تو جہاد کیوں کیا جاتا ہے۔؟

نہیں تو اس کے لوازم، افعال وغیرہ کہاں سے آسکیں گے جیسا ربط رکھو ویسا معاملہ کیا جاتا ہے۔

## ۱۹۔ بیت اللہ اور روضۂ نبویؐ

اس عالمِ ظاہر میں اللہ رسولؐ کے پاس ہماری رسائی اور بازیافت اس سے بڑھ کر کیا ہوسکتی ہے کہ بیت اللہ (اللہ کا گھر) دیکھ لیا۔ اور روضۂ نبویؐ پر حاضری دی۔ انکو ایسا دیکھا کریں کہ دونوں دل میں اتر جائیں۔ ہر وقت نظر میں رہیں۔ اور اس عالم سے جاتے وقت وہی نقشہ آنکھوں میں لے جائیں۔ وہ بدبخت ہیں جن کو تصوّر پر بار ڈالنے کے باوجود بیت اللہ اور روضۂ انورؐ کا نقشہ ذہن میں نہ آئے۔ حدیث شریف ہے۔ حجرِ اسود کو بوسہ دینے پر یا تو ہمارے گناہوں کی سیاہی حجرِ اسود میں چلی جاتی ہے، یا حجرِ اسود کی سیاہی خدانخواستہ زائر میں آجاتی ہے۔ گویا سیاہیوں کا تبادلہ ہوتا ہے۔ اس لئے دعا کرکے بوسہ دینا چاہیئے۔ لہسن، پیاز کی بُو حضورؐ کو ناپسند تھی۔ اس لئے وہاں لہسن، پیاز، تمباکو کی بُو سے منہ کو پاک صاف رکھیں تو مناسب ہے لیکن بدبختوں کو دیکھو کہ سعودیوں کی ضد میں ناپسندیدگی کے باوجود، مواجہہ شریف میں تمباکو پینا چاہتے ہیں۔ نواب ولی الدولہ بہادر نے عشقِ نبیؐ میں شراب اور تمباکو کو یکلخت چھوڑ دیا۔ اس کے لئے قوتِ ارادی کی ضرورت ہے۔ ملازم، ماما تک ساتھ نہ لی اور کہا "میں غلام بن کر مدینہ جانا چاہتا ہوں۔ مالک بن کر جانا نہیں چاہتا۔

## ۲۰۔ مواجہہ شریف

رقت طاری ہوئی اور فرمایا ہر محل کے آداب الگ ہیں۔ اور پھر اپنا اپنا ربط ہے۔ کل قیامِ مدینہ میں ایک پارہ نہ پڑھ سکا سوائے فرض نماز کے، کل وقت مواجہہ شریف میں حضور صلعم کی طرف توجہ کے سوا کام نہ تھا۔ لوگ رَوضَۃُ الجَنَّۃ میں نمازیں پڑھتے ہیں۔

مومن موت سے نہیں گھبراتا، بلکہ بے خوفی میں تمنا کرتا ہے کہ آ بھی جائے تو فکر کی بات نہیں۔ آرام ہی آرام رہے گا۔

**۲۵۔ اصیل کی پہچان** دین کے لئے غیرت، صبر و ضبط بہت ضروری ہیں۔ سکندر آباد میں ایک فوجی ڈاکٹر ہنٹ رہتا تھا۔ اس کے پاس بہترین اصیل کتے تھے۔ چار چار، پانچ پانچ بچے ہوتے تو لوگ اصرار کر کے مانگ کے لے جاتے۔ ایک دفعہ مجھ سے کہا، گو میرے پاس اصیل کتے ہیں لیکن اُن کی سب اولاد اصیل نہیں نکلتی۔ اور میں اصیل کتوں کو کسی قیمت کسی کو نہیں دیا کرتا۔ میں نے کہا۔ اس کی کیا پہچان ہے۔ بولا، جب یہ بڑے ہوں تو میں دونوں کان پکڑ کر خوب جھولا جھلاتا ہوں۔ اگر کسی بچہ نے "کُوں" کیا تو اس کو میں دوسروں کو دیتا ہوں اور اگر دیر تک جھکولے دینے پر بھی وہ چپ سادھے رہیں تو میں ان کو اپنے پاس رکھتا ہوں۔ لوگوں کو اصلیت کا یہ راز معلوم نہیں۔

اسی طرح دین میں جس کا ظرف اصل ہو، صادق الایمان ہو، وہ غیر معمولی ڈسپلن (ضبط) دکھاتا ہے۔ اللہ رسولؐ پر جان مال فدا کرتا ہے لیکن اُف نہیں کرتا۔

**۲۶۔ کفر کا شرحِ صدر** قرآن کے لحاظ سے اسلام و کفر، حق و باطل دونوں میں شرحِ صدر ہوتا ہے جب کفر کا شرحِ صدر ہوتا ہے تو باطل والا حق والے کو حجت و بحث سے پریشان کر دیتا ہے اور سوائے ایمان بالغیب کے اس کو کہیں پناہ نہیں ملتی چنانچہ حضرت فخر الدین رازیؒ کا مشہور واقعہ ہے کہ انتقال کے وقت شیطان نے اتنے وسوسے ڈالے کہ وہ حیران ہو گئے۔ صرف ایک مرشدِ کامل کی نسبت و تائید سے ایمان بالغیب کی بنا پر وہ بچ گئے اور خاتمہ بالخیر ہو گیا۔

**۲۷۔ موت کے متعلق قرآنی علم** بدن سے روح کی جدائی کا نام موت ہے۔

فرمایا: محبت تو ازل سے ابد تک مسلک ہے لیکن اسی محبت کے ایک ایمانی محل کا اقتضا اور حکم یہ ہے کہ کفر کی روک تھام کی جائے۔ لہٰذا تعمیل حکم میں یہ عمل کیا جاتا ہے جو محبت کے مسلک کے منافی نہیں۔ نفرت، محبتِ معکوس کا نام ہے۔ جہاد میں عام جنگوں کی طرح، نفسانی اعتبار کے تحت قتل و خونریزی نہیں کی جاتی۔ بلکہ امرِ الٰہی کے تحت بے نفسی سے حق کے لئے جنگ کی جاتی ہے۔

## ۲۳۔ خود کشی اور جہاد کا فرق

اگر خود کشی حرام نہ ہوتی تو اس دنیا میں ایک مومن بھی باقی نہ رہتا۔ کلمہ پڑھتا اور الحمد للہ کہہ کر خود کشی کر لیتا اور جنت کی راہ لیتا۔ لیکن اللہ نے اپنی ارادت سے آنے کو حرام کیا ہے۔ اور خود کشی کی سزا جہنم مقرر کی ہے لیکن مومن دوسرے محل پر یعنی جہاد میں امرُ اللہ اور ارادۃُ اللہ کے تحت جا کر جان دیتا ہے تو شہید ہو کر جنتِ نعیم اور حیاتِ ابدی کا مستحق بنتا ہے۔

## ۲۴۔ شہادت اور قرآن

ایک صاحب نے مغلوبیت سے گھبرا کر کہا، اب ہم شہید ہو جائیں گے۔ فرمایا اسلام قُنُوطِیَّتْ (ناامیدی) کی تعلیم نہیں دیتا۔ بات کہنے میں نفسیات دیکھنی پڑتی ہے کہ اس سے کس کی کمزوری یا کس کا غلبہ ظاہر ہو رہا ہے۔ اسلام کی تعلیم قرآن کے لحاظ سے یہ ہے کہ ہم کسی حال میں نتیجہ سے مایوس نہ ہوں۔ بلکہ دشواریوں کے باوجود، اللہ کا بھروسہ، کامیابی کی امید رکھیں۔ دشواریوں کو دشواریاں سمجھیں لیکن نتائج کو ان پر منحصر نہ سمجھیں۔ یہاں تک کہ اسی کامیابی کی امید میں شہادت بھی واقع ہو سکتی ہے۔ لیکن موت و تباہی کو مقصود نہ بنائیں۔ قرآن میں موت سے نہ ڈرنے بلکہ موت کی تمنا کرنے کی تعلیم و حکم ہے۔ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۲۵/۱۱) آخرت اور موت کے اجور و نتائج کے پیشِ نظر

لحاظ سے اور الٰہی تعلق کے اعتبار سے انتہائی عظیم ہوگی۔ جہل ہی نار ہے مصیبت و تکلیف کا منبع ہے۔ علم و صدق ہی نور ہے۔ مسرت و سکون کا منبع ہے۔ اسلام دینوی زندگی کی اہمیت کو نہیں گراتا بلکہ بتاتا ہے کہ یہاں کی زندگی آخرت کی ابدی زندگی کے مقابل، ہیچ ہے لیکن دنیا ہی آخرت کی کھیتی ہے۔ کذب، تفاخر، بے ہودہ باتیں زندگی میں رنج و تکلیف کا باعث ہوتی ہیں جن کا جنت میں بالکل دخل نہ ہوگا۔ امن و سلامتی ہی وہاں کا امتیازی نشان ہوگا۔ ارشاد ہے۔ لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّلَا تَأْثِيْمًا اِلَّا قِيْلًا سَلٰمًا سَلٰمًا (۲۷/۱۴) ترجمہ: نہیں سُنیں گے اس میں بیہودہ بک بک اور نہ گناہ کی باتیں۔ مگر ہر طرف سے سلام ہی سلام ہوگا۔

دراصل ہمارے جذبات و خواہشات کی عدم تکمیل اور ہماری عدم استطاعت ہی انتہائی رنج و تکلیف کا باعث ہے۔ قوت و استطاعت ہی مسرت و اطمینان کا سرچشمہ ہے، جو صدق و تقویٰ کی بنا پر انعاماً عطا ہوتا ہے۔ لہٰذا جنت کی زندگی کا اصول یہ ہوگا کہ جو چاہے دل بھر کرو۔ لَهُمْ مَا يَشَاءُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ الخ (۲۴/۱)

بعض لوگ جنت کے نعماء، باغ و بہار، حور و قصور، میوے کھانے وغیرہ کو اشارت پسندی، مجاز و استعارہ سے تعبیر کرتے ہیں جو نامناسب ہے۔ یہ حقیقتِ نفس الامری کے مطابق ہیں۔ قرآن سے لفظی حقیقی معنیٰ کی توثیق ہوتی ہے ارشاد ہے: هُمْ وَاَزْوَاجُهُمْ فِيْ ظِلٰلٍ عَلَى الْاَرَآئِكِ مُتَّكِـُٔوْنَ۔ لَهُمْ فِيْهَا فَاكِهَةٌ وَّلَهُمْ مَّا يَدَّعُوْنَ ۔ سَلٰمٌ ۔ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ (۲۳/۳) ترجمہ: وہ اور اُن کی بیبیاں سایوں میں تختوں پر تکیہ لگائے بیٹھی ہونگی۔ ان کے لئے وہاں ہر طرح کے میوے ہوں گے۔ اور وہ جو چاہیں گے ملے گا۔ مہربان پروردگار کی طرف سے ان کو سلام کہا جائے گا۔

**۲۹۔ عالمِ شہادت و غیب** | جس طرح ہم اس عالمِ شہادت کو حقیقت سمجھتے

یہاں کی موت دراصل نقلِ مقام کا نام ہے۔ مومن کا حال ہر جگہ اچھا ہی ہوتا ہے، چاہے اِس عالم میں رہے چاہے اُس عالم میں۔ بلکہ اُس عالم میں خاص لطفِ مہمان نوازی ہوتا ہے۔ مومن کے اُس عالم کی زندگی دنیا کے تخت و تاج سے بہتر ہے۔ مومن کے انتقال کے موقع پر ملک الموت، ملائکہ اور اولیاء اللہ تشریف لاتے ہیں۔ انتقال کے وقت انسان جیسا علم رکھے گا ویسا ہی اس کا حال دوسرے عالم میں ہوگا۔ قرآن کے لحاظ سے مقربین کو مرنے کے بعد روح و ریحان اور جنّت نعیم ملینگے۔ اُن کے لئے حشر و نشر نہیں کیونکہ وہ اِس عالم میں ہی موت سے متحقق ہوگئے۔ شہداء لذّاتِ طعام وغیرہ میں رہیں گے۔ اصحابِ یمین کو نعماء اور سلامتی کی بشارتیں ملینگی اور آرام سے رکھا جائے گا۔ کافروں کے لئے برزخ کا عذاب اور دوزخ کا داخلہ ہے۔

دعا، استغفار، ایصالِ ثواب، شفاعت اور کاملین کے قدم مزاروں پر آنے سے اصحابِ یمین کو فائدہ پہنچتا ہے۔ اور ان کے گناہ معاف ہوتے ہیں۔ اصحابِ یمین کی نعمتوں کی جو انتہا ہوگی وہ مقربین کی ابتدا ہوگی۔ اصحابِ یمین حشر و نشر سے گذریں گے تب جنّت کے لطف اٹھائینگے۔ اگرچہ انھیں پہلے بھی مرنے کے ساتھ ہی نعمتیں، رفاقتیں حاصل رہیں گی۔ شہداء و مقربین (صدیقین) اِس عالم میں جسم کے ساتھ بھی آسکتے ہیں۔ قرآن کے لحاظ سے اُن کے لئے کھانا پینا ثابت ہے۔ قرآن ہی نے آخرت کی زندگی کے متعلق کہہ دیا کہ اشتہا ہوگی لیکن تکلیف نہ ہوگی۔ کھانا پینا ہوگا لیکن پیشاب وغیرہ نہ ہوگا۔ فِيهَا أَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ (۴/۵۷) یعنی ان جنّت میں پاک صاف جوڑے ہوں گے۔ تمھارے نفس جو جو چاہیں گے وہاں ملے گا۔ (۴۱/۳۱)۔

**۲۸۔ جنّت کی زندگی**

اسلام حیات بعد الموت کے متعلق بہت قطعی علم دیتا ہے۔ وہاں کی زندگی مسرت و رنج کے

فصلِ ہفتم

# کشف وکرامات، جنّات وشیاطین

**۱۔ باطنی توجہات کے دو پہلو** فرمایا۔ اشراقی طریقہ کے لوگ سمجھتے ہیں کہ آنکھ، کان، ناک، منہ بند کرکے مراقبہ کرنے سے ہی عرفانِ حق حاصل ہوتا ہے۔ حالانکہ عرفان نہ ظہور میں محدود ہے، نہ بطون میں مقیّد۔ ورنہ اِنَّ لَکَ فِی النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيلًا (۲۹/۱۴) باطل ہوجائے گا۔ اِس عالمِ ظاہر میں اللہ کے صفات واسماء کی تجلیات ومظاہر زیادہ نمایاں ہیں۔ عالمِ باطن میں بھی لامتناہی تجلیات سے انکار نہیں ہوسکتا مگر کسی ایک ہی جانب خواہ ظاہر ہو یا باطن ساری توجہ منعطف کرنا، اپنی منزل کو کھوٹا کرنے کے مرادف ہے۔ ہر عالم میں عرفانِ حق کے ساتھ تجلّیات باری کو دیکھنا ہی عبادت ہے لیکن اس کے برخلاف یہ لوگ آنکھ، کان بند کرکے خدا کا تصوّر باندھتے ہیں، جو حقیقت کے خلاف ہے اور اپنے نفس کا مخلوق ہے اور نفس ہے۔ ایسا شخص جب تک خود ساختہ یکسوئی میں رہتا ہے خوش رہتا ہے۔ ورنہ ضیق محسوس کرتا ہے۔ ظلمت وضیق جہل کا خاصّہ ہیں۔ علم وعرفان سے نور آتا ہے۔ یہی حق وباطل کی پہچان ہے۔ عارف کو ہر محل پر نور نظر آئے گا۔

**۲۔ عجائب وغرائب کا شوق** بعض سالکین کو عجائب وغرائب اور کشف

ہیں اور یہ ایک حقیقت ہے۔ اُسی طرح جب ہم انتقال کے بعد قبر میں داخل ہونگے یا عالم حشر میں پہنچیں گے تو وہ عالم ہمارے لئے شہادت کا حکم رکھے گا اور دنیا کی زندگی خواب معلوم ہوگی۔ جیسے کہ اس دنیا میں جب تک ہم عالم خواب میں رہتے ہیں وہ عالم ہم کو شہادت محسوس ہوتا ہے۔ جب خواب ختم ہوجائے تو بیداری کے بعد معلوم ہوتا ہے وہ خواب (غیب) تھا۔ یہی حال جنّت، دوزخ کی زندگی کا ہوگا کہ وہ شہادت بن جائے گی۔ ہر عالم میں پہنچنے کے بعد وہاں کی زندگی شہادت بن جائے گی اور دوسرے عوالم غیب بن جائیں گے۔

اللہ تعالیٰ کے علم و خلق کی انتہا نہیں نہ معلومات کی نہ مخلوقات کی۔ نہ ہماری عبدیت (احتیاج) ختم ہوتی اور نہ اللہ کی الوہیت و ربوبیت و خلّاقیت ختم ہوتی۔ وَھُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِیْم (۳۶/۸۱) ازلاً ابداً جاری و ساری ہے۔

تمیز نہیں کرتے اور خلط ملط کر دیتے ہیں۔ ایمانِ بالغیب والے کا مقام بہت اعلیٰ ہے۔ اس عالم شہادت میں آثار اللہ اور قدرت اللہ دیکھنا کیا کم دید ہے لیکن بعضوں کو اس کے بجائے کشف و آثار مطلوب ہوتے ہیں۔ قرآن کے لحاظ سے انبیاء نے آثار طلبی پر معجزات نہیں دکھائے بلکہ ہمیشہ ایمان پر زور دیا۔ البتہ اللہ نے کافروں کو بطورِ سزا اور کمزور مسلمانوں کی تقویتِ ایمان کے لئے معجزے اور آثار دکھائے جن کے قوی ایمان ہیں اُن کو تو آثار کی ضرورت ہی نہیں۔

بعض قطب عالم ایسے ہوئے ہیں کہ اُن کے خطرہ پر سارے عالم میں احکام جاری ہوتے ہیں لیکن خود اُن کو خبر نہیں ہوتی۔ انتقال سے دو تین روز قبل بعض کو اُن کے مقام کا علم دیا جاتا ہے۔

## ۳۔ مرشدین اور آثار طلبی

آج کل اکثر مرشدین آثار کی طرف مائل ہیں اور اسکو ایمان و مشیخت کا نشانِ امتیاز سمجھتے ہیں۔

انبیاء سے آثار و معجزات کے اظہار کے باوجود کافروں کے کفر میں شدت باقی رہی تھی۔ ایمان کے لئے غیب کی ضرورت ہے۔ قرآن کہتا ہے "اگر ہم فرشتوں کو اتار دیتے، مُردے اُن سے بات بھی کرتے، اور ہم اُن کے سامنے حشر بھی کر دیتے تو بھی یہ جاہل ایمان نہ لاتے" (۸) پھر آثار کا مقصود کیا ہوا سوائے تمتع، تفاخر اور نفس کے۔

پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ انبیاء اولیاء سے کرامات کیوں ظاہر ہوئے؟ دراصل بے ارادی میں آثار ظاہر ہوئے۔ وہ تو کرامات کو چھپاتے ہیں اس کے بیان سے شرماتے ہیں، اِلّا یہ کہ امر ہو۔ حضرت غوث اعظمؒ فرماتے ہیں۔ میں غسّال کے ہاتھ میں مُردہ کی طرح ہوں۔ یعنے اللہ کے یدِ قدرت میں مردہ ہوں۔ اصل میں اسلام نے صدق، ایمانِ بالغیب اور استقامت علی الایمان کی تعلیم دی ہے۔ جس کے

و آثار کا بہت شوق ہوتا ہے۔ وہ علم صحیح کی عظمت و اہمیت نہیں سمجھتے اور اس کو کمال نہیں مانتے یا اُس وقت تک کمال نہیں تسلیم کرتے جب تک کشف و خواب اور آثار حاصل نہ ہوں۔ بعضوں کے کشفی مشاہدات غیر معمولی ہوتے ہیں لیکن اُن پر علم منفتح نہیں ہوتا جس کی وجہ سے وہ حیران رہتے ہیں۔ اور اپنے مشاہدوں، تجربوں اور نظریوں میں تطبیق نہیں دے سکتے۔ حالانکہ کامیابی کے لئے عملی اور نظری علم میں مطابقت لازمی ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ ایف۔ اے کے نظریات پڑھ کر اگر ام۔ اے کے عمل (لیبوریٹری) کے عملیات دیکھیں تو حیرانی ہوگی۔

حضرت امام ربّانی مجدد الف ثانیؒ نے حضرت شہاب الدین سہروردیؒ کی کتاب عوارف المعارف کے حوالہ سے لکھا ہے۔ آثار و کشف تحتانی مرتبہ کی چیزیں ہیں صرف ضعفِ ایمانی کو دور کرنے کے لئے دی جاتی ہیں۔ جب علم صحیح قائم ہوا ایمان پختہ ہو تو ان کی ضرورت باقی نہیں رہتی شغلِ مطلق والوں کو ایمان کافی ہے کیونکہ عالم میں جو کچھ ہے سب آیاتِ قرآنی میں مندرج ہے اور آیاتِ قرآنی کے انکشاف و انفتاح سے عالم کی حقیقت بموجب علمِ الٰہی کھل جاتی ہے۔

عالمِ شہادت کے آثار اصل ہیں۔ عالمِ مثال میں خواب دیکھ لیا۔ لیکن شہادت میں کوئی چیز نہ آئی تو کیا فائدہ ہوا۔ کشف کو آثار میں مشغول رہنے والوں کی حالت سطحی ہوتی ہے۔ اور قوی ایمان والے آثار سے بالا ہوتے ہیں۔ ایمان طلب کشف کا مانع ہے۔ ایمان بالغیب اصل نعمت ہے جس کے بعد بہت سے آثار خود آتے ہیں لیکن ان کے پیچھے نہ پڑیں۔ دراصل ہر آیت پر ایمان ہو تو لاریب فیہ کا مقام حاصل ہو اور متقی بن جائے۔ اس کے لئے نہ دلیل کی ضرورت، نہ منطق کی حاجت لہٰذا آثار مطلوب نہ رہیں۔

بعض سالک اپنے نفسانی مطالبوں اور مرضی الٰہی کے تحت مطالبوں میں

کو کنٹرول کر کے اعتدال پر رکھا جائے تو جوانِ صالح بنتا ہے ورنہ آوارہ گردی میں صحت اور اخلاق تباہ ہو جاتے ہیں۔ یہی حال روحانی بلوغ کا ہے کہ اس کے بھی مطالبات ہیں، تقاضے ہیں۔ اگر ان کو کنٹرول میں رکھیں تو روحانی صحت ترقی کرتی ہے، حقیقی روحانی کمالات حاصل ہوتے ہیں۔ ورنہ استدراج والوں کے چکر میں آ کر قلبی و روحانی عوارض میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور اس کے باوجود روحانی ترقیوں کا مغالطہ رہتا ہے۔

پس دین پر عمل کر کے حقیقی روحانیت پیدا کرو۔ پنجوقتہ نماز پڑھو۔ درود پڑھو۔ استغفار کرو۔ محض خواب دیکھنے، آیندہ کے واقعات معلوم ہو جانے اور استدراج کے تماشوں سے ہماری زندگی کیا خاک بنے گی۔ آثار پرستی اور ندرت پرستی کے چکر میں پڑ کر استدراج والوں کے چیلے بن جائیں تو ایمان کے کھونے کے سوا کچھ حاصل نہ ہو گا۔

**۵۔ کشف** ہر چیز پہلے عالمِ مثال میں بنتی ہے۔ اس کے بعد یہاں عالمِ شہادت میں اس کا عکس آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بعض بندوں کو اس کا علم دیتا ہے۔ بعض اولیاء اللہ نیند کی حالت میں کسی کے قلب سے تعلق پیدا کر کے خواب میں علم دیتے ہیں لیکن کبھی بیداری کی حالت میں بھی تعلق ہوتا ہے۔ نیند تو نہیں ہوتی لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم فلم دیکھ رہے ہیں۔ بہت سی ہونے والی چیزیں دکھائی جاتی ہیں۔ بعض وقت وہ صاف کہتے ہیں اور ہمیں سنائی بھی دیتا ہے لیکن اکثر چیزیں قطعیت سے نہیں بتائی جاتیں۔ ورنہ اس عالم کا نظم درہم برہم ہو جائے گا۔ لوگ اکثر قضائے معلق کو دیکھتے ہیں۔ اور قضائے مبرم سمجھتے ہیں۔ قضائے مبرم بہت کم دکھائی دیتی ہے۔

**۶۔ کشفِ کونی۔ کشفِ الٰہی** اکثر لوگ کشفِ کونی کی طرف مائل تھے

نتیجہ میں آثار تقدم ہو کر تَعْرِفُهُم مَا يَشَاءُونَ (۲۴) کی شان پیدا ہو جاتی ہے۔
ایمان بھی بڑھیا کا ساپختہ سچا ہونا چاہئیے نہ کہ کچا۔

ایمان کے بعد جسم سے آثار قلب سے آثار روح سے آثار شروع ہوتے ہیں تو مُسلم و کافر کے آثار میں مشابہت ہو کر دھوکا ہوتا ہے جسم عبادت میں لگتا ہے۔ تو تمیز نہیں ہوتی جیسے جائز اولاد اور ناجائز اولاد میں صورۃً کوئی تمیز نہیں ہوتی۔ لیکن ہر ایک کے آثار جدا گانہ ہیں۔ اسی طرح کفر اور اسلام کے آثار صورۃً مشابہ لیکن باطناً زمین آسمان کا فرق ہے۔ لہٰذا اشراقیت کے کمالات پر نہ جائیں اور نہ ان کو مطلوب بنائیں۔

**۴۔ آثار پرستی کے چکر** انبیاء کو معجزے، اولیا کو کرامات اور کفار کو استدراج (خرقِ عادات امور کا ظاہر ہونا) ملے آج کل لوگ ایسوں کے چیلے بن رہے ہیں جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ کھاتے نہیں حبسِ دم کرتے ہیں منتر بتاتے ہیں۔ ایک مسلمان امیر ایسے ایک شخص کے معتقد ہو گئے اور مجھے بھی ملنے کو کہا، میں نے کہا بکری کمزور ہے، تھوڑا دودھ دیتی ہے۔ لیکن انبیاء تک نے چرایا۔ سوّر بہت قوی ہوتا ہے لیکن بکری پاک حلال اور سوّر نجس حرام۔ اسلام میں ایسوں کے آثار و کمالات کی کوئی حقیقت نہیں۔ ہمارے پاس ایمان بالغیب کی اہمیت ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ نے فرمایا "کبھی آثار پر نہ جائیں اصل چیز ایمان ہے۔ ایمان پر جمنا سب سے بڑی کرامت ہے" اگر ایک بچہ کو ہزار روپیہ کی کتاب اور ایک گراما فون دیں تو بچہ کتاب کو پھینک دے گا اور گراما فون لے لیگا۔

حضرت مجددؒ فرماتے ہیں جس طرح جسمانی بلوغ ہوتا ہے اسی طرح روحانی بلوغ ہے۔ جسمانی بلوغ کے کچھ مطالبے ہوتے ہیں، تقاضے ہوتے ہیں۔ ان تقاضوں

کشفِ الٰہی ہے۔ کشفِ کونی نہیں غیر مسلموں کو بھی بہت کشف ہوتا ہے جس سے لوگ
دھوکا کھاتے ہیں۔ کشفِ کونی کھیل تماشا ہے۔ اس سے سیرت نہیں بنتی۔ اعلیٰ مقام
علمِ الٰہی ہے۔ آثار میں دھوکے ہیں شیطان متشکل ہو کر دھوکے دیتا ہے کئی واقعات
ہیں کہ مراقبہ کر کے بعضوں نے سمجھا کہ صاحبِ مزار سے ملے، حالانکہ جن سے ملے، وہ صاحب
صاحبِ مزار نہ تھے۔ کشفِ کونی میں بھی اعلیٰ اعتبار مقصود ہونا چاہئیے۔ نہ یہ کہ دل میں
کیا ہے۔ گھر میں کیا ہے جس میں اکثر لوگ مبتلا ہیں اور اسی کو غلطی سے اپنی روحانی
برتری سمجھتے ہیں۔

## ۸۔ کشف و کرامت محبوبیت

اکثر مرشدین کرامات کے مدّعی ہوتے ہیں۔ یعنی علم و قدرت کو اپنا مقام
بنانا چاہتے ہیں جو انسان کا مقام نہیں۔ ہمارا مقام تو جہل و عجز ہے۔ کشف و
کرامت مطلوب نہ ہوں۔ صرف اللہ اور اس کا رسولؐ مقصود ہوں۔ ہم عدم ہیں
صرف رسول اللہؐ کی نسبت رکھتے ہیں۔ وہی مقصود ہوں۔ اِنَّكَ مُدَّ عَاسَلَامٌ
عَلَيْكَ ۔ رسول اللہؐ کے ذریعہ ہم اللہ اور اس کی نعمتوں کو پا سکتے ہیں۔ کشف و
کرامت ترغیب و تحریصِ ایمانی کے لئے دیئے جاتے ہیں۔ جیسے بچوں کو اعلےٰ
چیزوں کی طرف متوجہ کرنا ہو تو پہلے کچھ تماشے بتاتے ہیں، اس کے بعد اصلی چیز
دیتے ہیں۔ اصل مقصود مکین ہو، نہ کہ مکان اور اس کی رنگا رنگی اور چمن کے گل بوٹے
گو بچوں کو پھولوں اور رنگوں میں لطف آتا ہے لیکن سمجھدار کا مطلوب مکین ہوتا
ہے۔ اگر مکین خود سیر کرائے تو انکار نہیں ہوتا اور خوب دیکھتا ہے بعض وقت
مکین بہت دکھاتا ہے اور کبھی کم۔ لیکن کم دکھانے سے محبوبیّت کی کمی لازم نہیں۔
اور نہ کشف و کرامت زیادہ ہو تو محبوبیّت کی زیادتی لازم۔ بعض اکابر سے عمر بھر
میں ایک کرامت بھی ظاہر نہیں ہوتی۔

ہیں کشف الٰہی کی طرف میلان کم ہے۔ کشفِ کونی کافر و مومن میں مشترک ہے۔ امتیاز کی چیز کشفِ الٰہی ہے کیونکہ اس میں ایمان بالغیب اور علم صحیح ہوتا ہے۔ ایمان و قرب کے لئے کشفِ کونی کی ضرورت نہیں۔ اکثروں کا ذوق خوابوں اور کشفِ مثالی کی طرف رہتا ہے ان سے تعارض نہ کریں۔ لیکن اپنا ذوق کشفِ الٰہی کا ہے جو اصل مقصودِ قرآنی ہے۔ ایمان کو قوی کرنے کے لئے بعض وقت کرامت و معجزہ دکھایا جاتا ہے۔ اکثر لوگ آثار پرست ہوتے ہیں۔ آثار میں نُدرت ہے اور نُدرت پسندی عام طور پر پائی جاتی ہے۔ قرآن کہتا ہے: وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتَابًا الخ (۷/۲) ترجمہ:- اگر ہم کاغذ میں لکھی ہوئی کتاب اتارتے اور وہ اپنے ہاتھ سے چھو بھی لیتے تو یہ کافر یہی کہتے کہ یہ صریح جادو ہے (۷/۲) آثار اور کشفِ کونی سے ایمان پیدا نہیں ہوتا۔

دراصل علم صحیح ملا تو سب ملا۔ اس مرتبہ میں علم عین عمل ہوتا ہے مثلاً کلمہ طیبہ، صبر، تسلیم، رضا، یافت و شہود میں علم عین عمل ہوتا ہے لیکن یہ معاملہ کیفیت کا ہے نہ کہ کمیت کا۔ ننانوے فی صد لوگ کمیت کا ذوق رکھتے ہیں، گنتے رہتے ہیں، نمازیں کتنی پڑھیں۔ زکوٰتیں کتنی دیں۔ یہ بھی اپنے محل پر ٹھیک ہے۔ لیکن قرآن کہتا ہے۔ وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا (۳/۵) حکمت (علم صحیح) ملی تو خیر کثیر ملا۔ اس کو کون گن سکتا ہے اس خیر کثیر کے اجر و آثار کی حد نہیں اس کا ظہور عالم آخرت میں ہے کیونکہ یہ عالم اس کا متحمل نہیں لیکن علماء ظاہر اور شغلِ مقیّد والے کہتے ہیں۔ علم ملا تو کیا ملا۔ کیا نور دکھلا۔ کیا دل ہلا کیا سلطان الاذکار ملا۔ کیا کوئی خواب دیکھا وغیرہ۔

## ۷۔ کشفِ کونی اور شیطان

شیطان کو جتنا کشفِ کونی ہے لاکھوں کو نہیں ترقی کی مابہ الامتیاز چیز دراصل

وَ تَعَالٰی عَمَّا یُشْرِکُوْنَ (۱۶/۱) ترجمہ: اللہ کا امر آگیا پس اس کے (آثار و نتائج کے) متعلق عجلت مت کرو۔ پاک ہے وہ اور بلند ہے اس چیز سے کہ شریک کرتے ہیں۔ (اپنی باتیں آثار کے متعلق)۔

یورپ میں بعض لوگ اس بناء پر ولی سمجھے جاتے ہیں کہ وہ قوتِ متخیلہ اور قوتِ ارادی سے مختلف کمالات نہ صرف دکھاتے ہیں بلکہ اپنے چیلوں میں پیدا کرتے ہیں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں کیونکہ قرآن نے اسے واضح کر دیا ہے۔ فرعون نے کافر جادوگروں کے ذریعہ سانپوں کا استدراج دکھایا۔ حضرت موسیٰؑ ایمان پر تھے امرِ الٰہی کے تحت عصا پھینکا۔ وہ اژدھا بن کر سب کو کھا گیا۔ اس میں حضرت کے علم و ارادہ کو دخل نہ تھا۔

اصل چیز ایمان ہے جس سے علم و عمل میں قوت و فیضان آتا ہے۔ اس سے ہٹ کر کتنا ہی بڑا کمال ہو ہمارے پاس اہمیت نہیں رکھتا۔ چنانچہ اکابر نے کمالات کو مقصود بالذّات نہیں سمجھا۔ کبھی اُن سے ایسے کمالات کا ظہور ہوا بھی تو صاف کہہ دیا کہ ان کا اسلام سے تعلق نہیں۔ یہ اسلام و کفر کے مابین وجہِ امتیاز نہیں۔ غیر مسلم سے بھی ان کا ظہور ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت خواجہ نقشبندؒ نے فرمایا "جو کچھ دیکھیں، سنیں، سب کو تحتِ لا رکھیں۔ نامرادی ہا مرادِ ما ست"۔ کمالات، مکشوفات، مطلوب نہ ہوں۔ اصل مقصود قرآن، اسلام، ایمان ہو۔ وہ ہو تو سب کچھ۔ وہ نہ ہو تو آسمان میں بھی اڑیں تو کیا فائدہ۔ چڑیا بھی اڑتی ہے۔ فلاح کے لئے قرآن ہم سے ذکر اللہ چاہتا ہے۔ اصل نعمت توحید و رسالت کا علم ہے۔

اللہ کی طرف سے ماموریت ہو تو برکات و فتوحات خود آئینگی۔ نفس کے تحت اپنی ارادت و سعی سے ہم کسی کو قائل و متاثر کرنا چاہیں تو برکت نہیں ہوتی۔

دوسرا راز کشف و کرامت میں یہ ہے کہ بعض وقت بہت سی چیزیں دیکھنے میں آتی ہیں لیکن وہ ملحوظ نہیں رہتیں کیونکہ وہ مقصود نہیں ہوتیں۔ اس کی نظر مالک پر رہتی ہے۔ بعض لوگ عالم مثال کی بہت سی چیزیں دیکھتے ہیں لیکن اس ڈرامہ کی ترکیب اور پلاٹ کو نہیں سمجھ سکتے اور مغالطوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ کشف وغیرہ بھی ایک قسم کا تماشا ہے۔ اصل ہیں تماشے والے سے ربط رہے۔ تماشا مطلوب نہ ہو۔ اسی لئے عالی استعداد والوں کو کرامتیں عطا نہیں ہوتیں، کیونکہ انکو ترغیب کی ضرورت نہیں۔ مثلاً صحابہ کرام کہ ان سے بہت کم کرامتیں ظاہر ہوئیں۔ ضرورت کیا تھی۔ ان کا مقصود رسول اللہ ﷺ تھے اور وہ حاصل تھا جس کے بعد وَالَّذِیْ جَآءَ بِالصِّدْقِ .... جَزَآءُ الْمُحْسِنِیْنَ (۲۴) ان کا مقام تھا۔ لہٰذا ہم کو مقام صفر (عدم) پر رہنا چاہیئے۔

## ۹۔ کرامت۔ اِستِدراج

بعض اوقات بعض ایسے پیر صاحبان سے بھی غیر معمولی آثار ظاہر ہوتے ہیں جن کا مقصود دنیا داری ہوتا ہے۔ یہ استدراج شمار ہوں گے کرامات نہیں کیونکہ کرامات کا ظہور ایمانی بنیاد پر ہوتا ہے جس میں ارادت کو دخل نہیں ہوتا۔ اگر ارادت کو بھی دخل ہو تو وہ ایمانیات کے تابع رہتا ہے۔ اصل مقصود اپنا فرض اپنے دائرہ میں انجام دینا ہے، چاہے کامیابی ہو، نہ ہو۔ اس سے بحث نہیں۔ کامیابی، دولت یا عزت کو مقصود نہ بنائیں۔ نہ ملے تو خلش نہ ہو۔ اس ایمانی علم و عمل پر جمنا جسے استقامت کہتے ہیں وہی سب سے بڑی کرامت ہے۔ اصل مقصود امر اللہ اور اللہ ہونا چاہیئے۔ کتنے ہی آثار دیکھیں نظر مستمی پر رہے۔ لیکن لوگ تماشوں کو مقصود بنا تے ہیں جو اخلاص کے منافی ہے۔ حکم ہے۔ فَاسْتَقِمْ کَمَآ اُمِرْتَ (۱۲) یعنے امر اللہ کی تعمیل میں استقامت دکھاؤ۔ آثار کے متعلق فکر نہ کرو۔ اَتٰۤی اَمْرُ اللّٰہِ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْہُ۔ وَسُبْحٰنَ اللّٰہِ

انتہا نہیں جسے قرآن میں استدراج کہا گیا ہے۔ وَالَّذِیْنَ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا سَنَسْتَدْرِجُھُمْ مِّنْ حَیْثُ لَا یَعْلَمُوْنَ (۹/۱۲۳) مطلب یہ کہ ہم ان جھٹلانے والوں کو اس طور پر استدراج دیتے ہیں کہ ان کو خبر بھی نہیں ہوتی۔ چنانچہ بچہ اچھا ہو گیا۔ ان لوگوں کا عقیدہ مورتی پر جم گیا۔ مسلمانوں کے گھر بت پرستی شروع ہو گئی۔ میں ایک دفعہ پہنچا تو انھوں نے کہا۔ اب تو گھر کا ایمان رخصت ہو چکا ہے۔ مورتی کی پوجا چل رہی ہے میں نے کہا، توحید سے شیاطین بھاگتے ہیں۔ آپ توحید سے بھاگ کر شیطان سے ربط پیدا کر کے سمجھ رہے ہیں کہ بچہ اچھا ہو گیا اور محفوظ ہے۔ یاد رکھیئے۔ انبیاء تک اللہ کے حکم کے تابع ہیں شیاطین کا تو ذکر ہی کیا۔ آپ کا بچہ منٹوں میں پھر مبتلا ہو جائے گا۔ جان جائے تو پھر نہ کہنا۔ آپ آزمانا چاہتے ہیں تو آزما لیجئے۔ وہ پریشان ہوئے اور کہا، اس بچہ کی خاطر ایمان سے ہاتھ دھویا تھا۔ میں نے کہا، مورتی نکال دو۔ ایمان پر جمو۔ ایمان میں حفاظت ہے۔ چنانچہ انھوں نے مورتی نکال دی۔ الحمدللہ ان کا بچہ اور گھر سب محفوظ ہو گئے۔

## ۱۲۔ ایک لڑکے کی غیر معمولی کرامت

ہماری بیعتِ خلافت کے موقع پر فرمایا۔ مراکش میں بارہ چودہ سالہ مسلمان لڑکا تھا جس کی غیر معمولی کرامت میں نے ایک انگریزی کتاب میں پڑھی جو میرے پاس موجود ہے۔ اس میں فرنچ گورنمنٹ کی مثل، نمبر، تاریخ، گواہوں کے حوالہ کے ساتھ لکھا ہے اور اس کا تفصیلی ریکارڈ پیرس میں موجود ہے۔ وہ بڑا صاحبِ کمال تھا۔ اس سے ملنے کے لئے فرنچ گورنر گیا اور کہا معلوم ہوا آپ بزرگ ہیں۔ اس نے کہا، اللہ بزرگ ہے۔ اس کا حبیب بزرگ ہے۔ اولیاء اللہ بزرگ ہیں۔ میں تو ایک بچہ ہوں۔ یہاں سمندر کنارے جھونپڑی ڈال کر کھیلتا ہوں۔ اور پوچھا، آپ لوگ کیا چاہتے ہیں؟ گورنر نے کہا ہم یہ چاہتے ہیں کہ یہ سمندر خشک ہو جائے

بعض لوگ لباس اور نام وغیرہ کے ذریعہ کام کرنا چاہتے ہیں لیکن اگر ان کی غرض خود نمائی اور جلبِ منفعت ہو تو بظاہر کتنی ہی کامیابیاں ہوں کالعدم ہو کر رہ جاتی ہیں دیرپا نہیں ہوتیں۔ یا اُن کا انجام اسلامی نہیں ہوتا۔ اللہ چاہے تو آثار پیدا کرے گا۔ ورنہ آثار بھی مطلوب نہ ہوں یہی کیا کم فضل ہے کہ ہمارا دل کچھ نہ ہونے پر مطمئن ہے۔

## ۱۰۔ کافروں کے کمالات پر روحانیت کا دھوکا

آج کل اہلِ یورپ میں بھی جنّات اور عالم ارواح کی تحقیق کا شوق بڑھ رہا ہے۔ اس خصوص میں کافی لٹریچر ہے۔ خاص خاص چھوٹے بچوں اور عورتوں کو بعض ارواح سے ربط ہوتا ہے۔ ان کے ذریعہ گفتگو کر سکتے ہیں۔ چنانچہ ایک کروڑپتی کے انتقال پر وراثت کی تقسیم پر جھگڑا ہوا۔ اور اس کے وصیت نامے کے کاغذ کا پتہ نہ چلا تو روحانی تحقیقاتی کمیٹی میں رجوع کیا گیا۔ اُس میّت نے کہا۔ میں خود اس فکر میں تھا لیکن مجھے تمھارے ساتھ ربط نہیں مل رہا تھا۔ اس بچہ کے ذریعہ میں بتا سکتا ہوں۔ اور کہا، تم فلاں کنجی سے فلاں الماری کھولو تو وصیت نامہ ملے گا۔ اس طرح کامیابی ہوئی۔

افسوس ہے بعض مسلمان ایسے کمالات سے مرعوب ہو جاتے ہیں حالانکہ ہماری امتیازی چیز ایمان ہے۔

## ۱۱۔ استدراج کا تماشا

انسانی فطرت میں انتہائی لچک اور وُسعت ہے خیر اور شر دونوطرف، ایک طرف پابندی و احتیاط کی حد نہیں تو دوسری طرف حماقت اور بے راہ روی کی انتہا نہیں۔ ابھی حال تک ہمارے گھر کے قریب ایک مسلمان عہدہ دار کے گھر مورتی کی پوجا ہو رہی تھی۔ ان کے لڑکے پر آسیب کے اثرات تھے بعض عاملین کے علاج سے فائدہ نہ ہوا تو کسی نے کہا، ہم بھگا دیں گے، اور لا کر بچے کے سرہانے ایک مورتی رکھ دی شیطانی کھیلوں کی

میں آئیتیں آتی ہیں۔ اُن کا ظہور اس عالم میں اس کے مطابق نہیں ہوتا تو آدمی کو شک ہوتا ہے۔ شک کی بات نہیں یا ایک واقعہ تھا گذر گیا۔ جیسے اس عالم میں کئی مختلف واقعات گذر جاتے ہیں۔ ہر واقعہ کا تسلسل یا اس کا نتیجہ ظاہر ہونا ضروری نہیں اسی طرح خواب کے نتائج ظاہر ہونا ضروری نہیں ممکن ہے مرنے کے بعد اُس کا ظہور ہو۔ لہٰذا خواب کے متعلق احتیاط برتی جائے۔

## ۱۴- نبوت کا چالیسواں حصہ

فرمایا۔ یاد رکھو ہزاروں آدمی خوابوں میں مار کھا رہے ہیں۔ عالم مثال (خواب) میں شیطان خوب دھوکے دیتا ہے۔ اچھے اچھے دھوکے کھاتے ہیں توفیق ہو تو سنبھلے ورنہ بہک جائے۔ یہ لوگ حدیث بیان کرتے ہیں۔ خواب نبوت کا چالیسواں حصہ ہے لیکن اس نکتہ کی طرف توجہ نہیں کہ نبوت میں ۳۹ حصے تو قرآن ہے اور چالیسواں حصہ بھی خواب ہیں جو قرآن ہی کے مطابق ہوں جو خواب مطابق قرآن نہیں، وہ شیطانی دھوکا ہے۔ توفیق وادب ہو تو سمجھ میں آتا ہے ورنہ نہیں۔

واضح رہے کہ اصلی سچے خواب بہت شاذ ہوتے ہیں۔ اُن کا منشا بھی صرف اطلاع ہوتا ہے باقی اکثر بدہضمی کے خواب ہوتے ہیں۔ یا اپنے خیال کی پیداوار جس میں شیطان چکر دیتا ہے جیسا سوچا ویسا خواب دیکھا۔ شیطانی خواب کی پہچان یہ ہے کہ اس میں کوئی نہ کوئی بات قرآن و شریعت کے خلاف ہوگی جس کی غلطی کو فراستِ مومن محسوس کرتی ہے۔ بہت سے خواب معلقات ہوتے ہیں۔ بہت سے خوابوں کی تعبیر کا ظہور اپنے وقت پر ہوتا ہے۔

ایک ہے شہادت کی دید۔ ایک ہے غیب کا علم۔ علم بالغیب کا مرتبہ اعلیٰ ہے جو حق سے حاصل ہوتا ہے۔ دوسرا شہادت کی دید ہے! عالم خواب و مثال کے تماشے کھلونوں کے مانند ہیں جن کو دیکھ کر کنڈرگارٹن کے بچے خوش ہو جاتے ہیں۔

اور ہم اس میں بیٹھ کر فرانس اور اٹلی کے فلاں فلاں میوے کھائیں۔ اس نے کہا۔ بس اتنا ہی۔ فوراً اس نے کچھ پڑھا اور کنکریاں پھینکیں تو سمندر کے سامنے کا حصہ دور تک خشک ہو گیا۔ کہا، اب چلو، سب گھبرائے اور بولے، ہم کو آپ کی کرامت کا اطمینان ہو گیا۔ اس نے کہا، نہیں۔ آپ کو دعوت کھانی پڑے گی۔ دعوت کے بعد جب ہم واپس آئیں گے تو پھر سمندر بن جائے گا۔ ہم یورپ والوں کی طرح دھوکا نہیں دیتے۔ وہاں اندر لے گیا اور کچھ پڑھا تو سب مطلوبہ میوے آ گئے۔ اور جب سب کھا کر لوٹے تو پھر سمندر بن گیا۔ اس کرامت کو دیکھ کر گورنر نے حیران ہو کر پوچھا۔ اتنی طاقتوں کے بعد تم ہمارے محکوم کیوں ہو؟ جواب دیا، ہم اللہ کے امر کے تحت زندگی گذارتے ہیں۔ اس کی حکمت میں دخل نہیں دیتے اس کی حکمت یہ ہے کہ ہم تمہارے محکوم ہیں۔

دوسرے موقع پر فرمایا۔ میں نے ایک چھوٹے بچے کو بے اسبابی میں کامیابی کی آیت بتائی تو اس نے ایک دن بغیر پیٹرول کے صرف پانی سے بیس ۲۰ میل تک موٹر چلائی اور ایک بھینس جو خشک ہو چکی تھی وہ دودھ دینے لگی۔ یہ دیکھ کر چند لوگ اس کے مرید ہونے کو تیار ہو گئے مجھے معلوم ہوا تو اسے بلا کر ڈانٹا اور کہا کہ ایسے کھیل تماشے کرو گے تو یہ نعمت چھن جائے گی۔ سرکاری اختیارات بغیر حکم و اجازت استعمال نہیں کیا کرتے۔ کیا تم کو بغیر پیٹرول موٹر چلانے کا آرڈر ملا تھا۔

**۱۳۔ خواب** خواب اہم بھی ہیں اور غیر اہم، بے معنی بھی۔ ان کا انحصار ذاتی صلاحیت اور ماحول پر ہے۔ بعض وقت یہ اتنے سچے ہوتے ہیں کہ جن چیزوں کی تکمیل اس عالم میں نہیں ہوتی ان کی تکمیل خواب میں کر دی جاتی ہے۔ بعض وقت جو مصیبتیں اس عالم میں آنے والی ہیں ان کو خواب میں گذار دیا جاتا ہے۔ عالم خواب میں خوشی یا تکلیف ہوتی ہے تو اس کا اثر ہمارے اعصاب، اعضا، جوارح تک پر پڑتا ہے لیکن بعض خواب بدہضمی کے ہوتے ہیں، جو بے معنی ہیں۔ بعض وقت خواب

دی اور نکلا مدینہ۔ فرمایا نبی امت کے لئے علم و عمل کا نمونہ ہوتا ہے اس کا علم کامل قطعی ہوتا ہے کیونکہ وہ وحی ہوتا ہے۔ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى۔ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى (پ ۲۷ ع ۵) البتہ امت کی تفہیم و تربیت کے لئے عام انسانوں کی سطح پر اس کو نزول بھی کرایا جاتا ہے اور جس طرح ایک اچھا معلم بچوں کی زبان میں تلفظ کر کے انکی غلطیاں بتاتا ہے اور کبھی ایک استاد پہلوان کشتی سکھانے کے لئے خود پچھڑ جاتا ہے تاکہ فن کے توڑ جوڑ سکھائے۔ اس سے اس کی کمتری ظاہر نہیں ہوتی بلکہ فن کا لازمہ ہے۔ استاد معذوری میں کمال دکھاتا ہے۔ اسی طرح نبی پر سہو و نسیان بھی طاری کیا جاتا ہے۔ تاکہ انسانوں کی تربیت کے لئے کامل نمونہ بن سکے۔ وَاِمَّا يُنْسِيَنَّكَ الشَّيْطٰنُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرٰى مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ (پ ۷ ع ۱۴) ترجمہ۔ اگر تجھ کو شیطان بھلاوے تو یاد آنے کے بعد ایسے ظالموں کے ساتھ مت بیٹھ۔ لیکن وحی اور تعلیم کے ذریعہ عصمت نبوی کی حفاظت کی جاتی ہے۔ اس میں اُن مرشدین کی اصلاح کا سامان ہے جو اپنے ہر کشف و خواب کی تعبیر کو یقینی سمجھتے ہیں۔

**۱۶۔ خلاصہ ۱۳ تا ۱۵** | خواب تو خواب ہے لیکن یہ بیداری بھی تو خواب ہے۔ بلکہ مرنے کے بعد برزخ بھی تو خواب ہے۔ غیب تو غیب، عالم شہادت میں بھی ایک پتہ کا کس کو علم ہے۔ خواب ہو کہ بیداری، نبی کا علم بہرحال قطعی ہوتا ہے۔ ہمارا حال تو بیداری میں بھی علم کے بارے میں خواب سے کمتر ہے۔ خواب کے معنی، وہ علم جو بیداری سے ہٹ کر حاصل ہو۔ جب بیداری کا علم پکا نہیں تو خواب کا کیسے پکا ہوگا۔ لَا عِلْمَ لَنَا اور هُوَ عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ۔ ہمارا مقام دعلم رہے خشیت طاری رہے۔ ایمان و شکر کے بعد ہی سکون ہے۔ عبدیت کے سوا پناہ نہیں۔

**۱۷۔ تن مثالی** | مقام برزخ میں زمان و مکان کے احکام اس عالم کی طرح

علم کی مثال ایک بڑے کتب خانہ کی ہے جہاں کھلونے نہیں ان کے اوپر کا علم ہے اعلیٰ سے اعلیٰ چیزیں دیکھو تو ان پر نہ جاؤ بلکہ قرآن کے تحت رہو خواب و مثال کہیں کتنے ہی بڑے مقامات کی بشارت ہو وہ مقبولیت کی دلیل یا وحی نہیں ہے۔ دعا کا مقام باقی ہے ورنہ دھوکا ہوگا اور مطمئن ہو کر سب لوگ علم و عمل و سعی چھوڑ دیں گے۔ حالانکہ اخیر وقت یعنی خاتمہ تک کوئی چیز قطعی نہیں۔

اس سے بڑھ کر کیا کہ شیطان حضرت غوث اعظمؒ سے کانپتا ہے لیکن اس نے حضرت کے سامنے تجلی نوری میں متمثل ہو کر کہا تیرے اعمال مقبول تو عبادات سے مستثنیٰ۔ لیکن حضرت نے سمجھ لیا کہ یہ شیطانی چکر ہے کیونکہ یہ بات شریعت اور نانا جان کی نسبت کے خلاف ہے۔ اس پر شیطان نے کہا میں نے اس ذریعہ سے ہزاروں کی قطبیت چھینی ہے۔ ایک صاحب نے دیکھا کہ وہ مقام کُن پر فائز ہیں اور سارا عالم اُن کے ارادہ پر چل رہا ہے۔ اسی وقت حضورؐ تشریف لائے تو بہ ادباً اپنے منصب سے اٹھ کر سامنے کھڑے ہو گئے۔ اس کے بعد انھوں نے دیکھا کہ پیچھے کتنے آ رہے ہیں۔ انھوں نے پوچھا اس اعلیٰ ترین مقام پر کتنے کیسے۔ جواب ملا یہ بھی مقام کُن پر تھے لیکن حضورؐ کی تشریف آوری پر بے اعتنائی کی اور ادب سے کھڑے نہیں ہوئے اور اس شکل میں ظاہر ہوئے۔ ان بزرگ کے کان میں ایک بات پڑی ہوئی تھی جو اس وقت کام آ گئی تم عرش تک جاؤ یا عرش بن جاؤ لیکن اپنے کو حضورؐ کے قدموں کے نیچے کی گرد سمجھو کہ یہ سب عروج حضرتؐ کا صدقہ ہے۔ اس ادب کی وجہ سے محفوظ رہے۔

## ۱۵۔ نبی کا خواب اور عصمتِ نبویؐ

تاچیز نے حضورؐ کے مدینہ کی ہجرت والے خواب کا ذکر کر کے پوچھا۔ کیا نبی کے خواب کی تعبیر قطعی سمجھی جا سکتی ہے یا نہیں کیونکہ حضرتؐ نے کسی مقام کی تعبیر

علماء کا متفقہ مسئلہ ہے کہ عالم برزخ کھلنے کے بعد توبہ قبول نہیں ہوتی۔ اسی لئے نزع کے وقت فرعون کے اٰمَنْتُ بِرَبِّ مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ کہنے کے باوجود فرعون کے کفر پر علماء کا اتفاق ہے۔ عالم برزخ کے کھلنے سے پہلے توبہ کام دیتی ہے۔ وہ عالم بعض پر چند منٹ پہلے، بعض پر چند گھنٹے پہلے، بعض پر ایک ایک ہفتہ پہلے کھل جاتا ہے۔ ہر ایک کو اس کا علم رہنا لازمی ہے۔ ورنہ انسان اس عالم کے کھلنے پر وہاں کی شکلوں، فرشتوں وغیرہ کو دیکھ کر جہل و نادانی سے حیرانی میں پڑ جاتا ہے۔ اس میں بھی ایک تحیّر محمود ہے اور ایک تحیّر مذموم ہے۔ اللہ بچائے۔

حضرت یوسف صاحب شریف صاحبؒ کے پاس ابدالِ وقت محمد علی شاہ صاحب رہتے تھے۔ مجھ سے ہر ہفتہ ملتے۔ عالمِ مثال ہر وقت کھلا رہتا تھا۔ درگاہ شریف کے ایما پر آئندہ ہونے والے واقعات مجھ سے بیان فرماتے۔ ایک دفعہ حیدرآباد میں طاعون زوروں پر تھا، وہ ایک دن آئے اور کہا۔ ہاتھی کب تک تنکے گھاس کھائے گا۔ اسے تو گڑی کی ضرورت ہے اور بفضلہٖ اب بھی حضور اکرمؐ کے غلام بڑی بڑی گڑیاں ہیں۔ میں نے منشاء سمجھ لیا۔ جاتے وقت کہا، غالباً یہ آخری ملاقات ہے۔ دوسرے روز پلیگ میں مبتلا ہو گئے۔ میں پہنچا اور ایک اچھے قوال سے خاص نعتیں پڑھوائیں تو خوش ہو گئے حضورؐ کی یاد کی وجہ سے ٹھنڈک ہو گئی اور تھوڑی دیر بعد انتقال کر گئے۔ چہرہ خوش جسم نرم۔ چہرہ پر پسینہ کی بوندیں تھیں جو خاص مقبولیت کی نشانی ہیں۔ وزیر اعظم سر اکبر حیدری نے بوندیں لے کر اپنے منہ پر پوچھ لیں، ایک نعمت حاصل کر لی۔

ایک صاحب کا انتقال ہوا۔ درگاہ یوسفینؒ کے قریب انھیں دفن کیا گیا۔ محمد علی شاہ صاحب نے کہا۔ ان کی قبر کھولو۔ قسمیہ کہتا ہوں کہ ان کا جسم اجمیر شریف پہنچ گیا۔ اگر غلط ہو تو میں لکھ دیتا ہوں۔ اسی قبر میں مجھے زندہ دفن کر دینا۔

ایک صاحب نے انتقال کے وقت نازشروع کیا۔ یا رسول اللہ! ہم

نہیں ہیں لطیف ہیں۔ بعض اہلِ قبر اہلِ عالم سے تعلق پیدا کرتے ہیں لیکن انھیں چند خاص باتوں سے زیادہ بتانے کی اجازت نہیں ہوتی۔ اس عالم میں ہمارا تن وزنی ہے لیکن ہمارا تن مثالی خواب میں کام کرتا رہتا ہے۔ ایک سکنڈ میں اتنی وسعت ہوتی ہے کہ کئی سال کے کام شادی بیماری غمی سب دیکھ لیتا ہے۔ غور کرو تو ہم دراصل اب بھی وہیں ہیں جہاں ہمارا خیال ہے ورنہ بظاہر یہاں ہمارا ڈھانچہ رکھا ہے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ میں اپنے دوستوں کے ساتھ ایک کمرہ میں سو رہا تھا۔ دوستوں نے دیکھا، میں نے اپنے جسم سے نکل کر دوسرا جسم اختیار کیا۔ دوستوں سے باتیں کیں باہر گیا اور پھر آکر اسی جسم میں جو سو رہا تھا، داخل ہو گیا۔ یورپ میں ایک معلمہ تھی۔ جہاں اس کو کوئی خیال آیا وہیں موجود ہو جاتی۔ کرسی پر جماعت میں بیٹھتی اور اسی آن باہر چمن میں موجود ہوتی۔ تن مثالی پر یورپ کی جدید تحقیق یہ ہے کہ تن مثالی کے ساتھ کوئی شخص آسمانوں پر گھوم سکتا ہے بشرطیکہ کوئی بڑی روحانی قوت مثل حضرت عیسیٰؑ اسے سنبھالے۔ بعض اولیاء اللہ مثلاً حضرت ابن عربیؒ نے اسی تنِ مثالی کے ساتھ ستاروں میں جا کر حالات دیکھے اور لکھے۔ اگر ہم پر ایسے احوال گذریں تو پریشان نہ ہوں کیونکہ ہمیں ہر محل پر سنبھالنے والی قوت (قطب نما) رسول اللہؐ کی ذاتِ مبارک ہے یا حضرت غوث اعظمؓ ہیں جن کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے۔ ہم رسول اللہؐ کو ان لوگوں کی طرح رسول نہیں سمجھتے جو چودہ سو برس پہلے توحید بتا کر قرآن دے کر چلے گئے بلکہ آپ اب بھی ہر محل پر ہماری مدد فرماتے ہیں۔ وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتَابَ وَالْحِکْمَۃَ (۲/۲) کی شان تازہ ہے۔ ہر آن کتاب وحکمت کی تعلیم دیتے ہیں۔ تزکیہ فرماتے ہیں۔

**۱۸۔ عالمِ برزخ**

بعض کا کشفِ قبور قوی ہوتا ہے تو چلنا پھرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ راستہ میں اہلِ قبور روک کر کہتے ہیں۔ فاتحہ پڑھ کر جاؤ تاکہ ہمیں سکون ہو۔ اسلام نے عالمِ نزع اور عالمِ برزخ کے متعلق بہت علم دیا ہے۔

صدر ہے۔ یہ ملائکہ اور انسان کے بیچ میں ایسے ہیں کہ دونوں کی کچھ کچھ فطرت کے حامل ہیں۔ ان کے خاندان ہوتے ہیں' کلچر ہوتا ہے' مذہب ہوتا ہے۔ یہ نظر نہیں آتے' تمثّل کی قابلیت رکھتے ہیں۔ ان کو حضرت سلیمان ع' حضرت غوث اعظم رض اور دیگر اولیاء اللہ سے ربط رہتا ہے۔

## ۲۲۔ شیاطین

شیاطین کی جماعت گمراہ جنوں' اور اُن گمراہ انسانی ارواح سے بنتی ہے جو اُن کے رفیق اور متبعین ہوتے ہیں جس کی وجہ سے قرآن نے انھیں شَیٰطِیْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ (۶) کہا ہے۔ ذُرِّیَّاتُ الشَّیٰطِیْنِ سے مراد شر میں شیطان کے متبعین ہیں۔ شیاطین شر پسند اور بنی نوع انسان کے لئے ضرر رساں ہیں لیکن وہ آپس میں بہت متحد رہتے ہیں۔ اور اپنے پرستاروں کے حق میں بڑے ممد و معاون ہوتے ہیں۔ تاہم شیاطین کا دائرہ عمل زیادہ تر جہلا کے طبقوں میں ہوتا ہے' اور اعلیٰ درجہ کے منکرین کے طبقوں میں بھی۔ وہ انسانی خون کے شائق ہوتے ہیں اور انسانی قربانیوں کے طلبگار ہوتے ہیں۔

## ۲۳۔ انسان

انسان اشرف المخلوقات ہے۔ اپنی حقیقت میں ملائکہ اور جنوں سے افضل ہے۔ عالم میں آمِیْنَ وَخَلِیْفَۃُ اللہِ ہے۔ اللہ کا عبد و محکوم بن کر اپنے علم' عروج و نزول اور جامع ظہور کی بناء پر ساری کائنات پر حاکم و اثر انداز ہے۔ اور محبت و طاعتِ الٰہی کی بناء پر سب سے فائق ہے۔

ہر ایک جانور کی فطرت معین ہے۔ انسان ہی کی فطرت غیر معین ہے۔ اسکی فطرت میں بے انتہا رنگا رنگی ہے جنوں کی فطرت میں حیوانوں کی بہ نسبت وسعت ہے لیکن انسان کی فطرت کی نزاکت و وسعت کو جن بھی نہیں پا سکتے۔ جنوں میں بھی اولیاء اللہ ہوتے ہیں لیکن انسانی اولیاء اللہ کے تحت بھی جنوں کے علاقے رہتے ہیں۔ جنوں کی ہدایات' انسانی اولیاء کے ذریعہ ہوتی ہے۔ حضرت غوث اعظم غوث الثقلین

آپ کے تشریف لائے بغیر اس دنیا سے نہیں جائیں گے چنانچہ حضورؐ تشریف لائے۔
اس سرفرازی پر پہونچے۔ بعد کو اس انعام پر پہنچے اور وصال ہو گیا۔

# جنّات۔ شیاطین

**۱۹۔ ارواح کا وجود** ہمیشہ سے عقل پرستوں کی ایک جماعت رہی ہے جس میں خصوصیت سے فلسفی اور سائنس داں داخل ہیں۔ جو ملائکہ اور جنوں کے وجود کے متعلق شک و انکار کرتے ہیں اور روحانی تعلقات کے امکان کو نہیں مانتے۔ ان کے برخلاف ماہرین روحانیات جس میں اولیاء اللہ اور نفسیات کے ماہرین داخل ہیں ارواح پر اور روحانی تجربوں، مشاہدوں پر ایقان رکھتے ہیں۔ ایک زمانہ میں روحانیت کے نام سے بڑے دعوے چلتے تھے۔ اور سوسائٹی میں وہم و خوف پیدا کئے جاتے تھے جس کا ایسا فطری ردّعمل ہوا کہ لوگ اس کا مذاق اڑانے لگے بلکہ عاملین کو سخت سزائیں دینے لگے لیکن قرآن حقایق کی توثیق کرتا ہے۔ اور اب ان دونوں قدیم جماعتوں میں اتفاق ہوتا نظر آتا ہے۔

**۲۰۔ ملائکہ** قرآن کے لحاظ سے ملائکہ کی اپنی شکلیں ہوتی ہیں۔ عموماً ان کے پر ہوتے ہیں۔ ان کی تخلیق نور سے ہوتی ہے۔ آسانی سے تمثّل لیتے ہیں۔ جب چاہیں انسانی شکلیں اختیار کرتے ہیں۔ ان کا مسکن آسمان ہے۔ جہاں تسبیح و تقدیس کرتے ہیں۔ یہ ادائی فرض کے لئے زمین پر بھی آتے ہیں اور لوگوں سے ملتے ہیں کبھی پہچان میں آتے ہیں کبھی نہیں۔ اکثر فوق الفطرت امور انجام دیتے ہیں خصوصاً آخر وقت میت کی مناسبت سے اچھی یا بری بشارتیں لے کر آتے ہیں۔ خاص مواقع مثلاً شب قدر وغیرہ میں برکات و سلام کے ساتھ نزول کرتے ہیں۔

**۲۱۔ جن** ملائکہ کے بعد جن کا مرتبہ ہے، جو ناری مخلوق ہیں۔ اور شیطان ان کا

کے دوران میں جنوں کو دیکھا تو بے ہوش ہو گئے۔ جنوں کو دیکھنے سے آنکھ خراب ہونے کا اندیشہ رہتا ہے۔ نیچی نظر رکھنی چاہیئے کیونکہ وہ ناری مخلوق ہیں۔ مومن کی نظر عرفانی ہوتی ہے، ہمارے دیکھنے سے جنوں کو تکلیف ہوتی ہے۔

ایک استاد نے جماعت میں ایک چھوٹے بچہ سے پانی مانگا۔ وہ جن کا بچہ تھا۔ اس نے ایک دم ہاتھ بڑھا کر کئی گز سے پانی لے کر پیش کر دیا۔ دیکھنے والے گھبرا گئے۔ دوسرے دن سے اس کے باپ نے اُسے مدرسہ نہیں بھیجا۔

مدینہ طیبہ میں محبی ضیاء الدین قادری صاحب نے مجھے رات تیسری منزل پر سلایا۔ میں چٹخنی لگا کر سو گیا۔ اندھیرا تھا۔ رات میں دو جن آکر مجھے بھینچنے لگے۔ میں حضرت غوث اعظمؓ کی طرف متوجہ ہوا تو بھاگ گئے۔ میں نے کہا۔ مسخرو، تمہیں معلوم نہیں ہم رسول اللہ صلعم کے مہمان ہیں۔ ستاتے ہو۔ چھوٹے سرکار سے عرض کر دوں گا تو تمہارا بُرا ہو گا۔ خبردار جو یہاں آئے۔

## ۲۵۔ شیاطین اور انسانی نسل

جن و شیاطین انسانی نسل کی برتری سے واقف ہیں کہ یہ بات اُن میں نہیں آتی۔ اس لئے وہ انسانی عورتوں سے ربط پیدا کرتے ہیں اور مادہ جن و شیاطین مرد انسانوں سے، ان سے جنسی تعلقات قائم ہو جانے کے بعد عورتیں کبھی انسان کی صورت دیکھنا پسند نہیں کرتیں لیکن عام طور پر جن اور شیاطین، مرد، عورت کے تعلقات میں مانع ہوئے بغیر خود شریک ہو جانا چاہتے ہیں۔ اسی لئے حضورؐ نے بوقتِ صحبت بسم اللہ وغیرہ پڑھنے کی ہدایت فرمائی تاکہ شیطان مجامعت اور اولاد میں شریک نہ ہو۔ ورنہ شیطانی اثرات کے تحت بعض وقت عجیب الخلقت بچے پیدا ہوتے ہیں۔ غیر شادی شدہ عورتوں کے ساتھ جن و شیاطین کے جنسی تعلقات سے ان کی اولاد اس عالم میں پیدا نہیں ہوتی، اگر وہ اس عالم سے غائب

ہیں یعنی جن و انس دونوں کے غوث ہیں۔

**۲۴۔ جنّات کی خصوصیات** جن اچھے برے ہر جگہ اس کثرت سے ہیں کہ اگر لوگوں کو علم ہو جائے تو چلنا پھرنا مشکل ہو جائے۔ ناری مخلوق ہے۔ شر کا پہلو غالب ہے۔ ان کی خصوصیت غصہ اور بیوقوفی ہے وجود کی وجہ سے کچھ خیر رہتا ہے۔ ورنہ جو شیاطین ہیں بڑے شر ہوتے ہیں۔ ان کی اولاد کثرت سے ہوتی ہے۔ جن و شیاطین اپنی اصلی شکل پر نظر نہیں آتے۔ ہر شکل میں تمثّل لیتے ہیں۔ اور بلیوں، کتوں، سانپوں کی شکل اختیار کر کے آتے ہیں۔ ان کی اصلی شکل بعض سمندری جانوروں کی سی ہوتی ہے۔ بعض وقت اجنبیت اور خاص مشابہ کی وجہ سے پہچان میں بھی آتے ہیں۔ اگر سانپ وغیرہ ظاہر ہوں تو خاموشی سے تین مرتبہ کہیں۔ جن بھوت ہو تو چلا جا یا نظر نہ آ۔ جن یا شیطان ہو تو چلا جاتا ہے۔ ورنہ اُن کا خاندان بعد کو قوت سے بدلہ لیتا ہے۔

ان میں مسلمان ہیں اور کافر بھی۔ بڑی بڑی عمریں پاتے ہیں حضرت شاہ ولی اللہؒ کی ایک جن صحابی سے ملاقات ہوئی۔ اس بنا پر وہ اپنے آپ کو تابعی کہتے تھے۔ بہت سے جن ہم سے انسانی شکل میں مل کر جاتے ہیں اور ہمیں خبر نہیں ہوتی۔ اگر وہ چاہیں تو ہم کو اپنے عالم میں بھی لے جا سکتے ہیں۔ البتہ انسان کو تن مثالی کے ساتھ لیجاتے ہیں جس کی وجہ سے انسان پر نیم خوابی کی سی کیفیت رہتی ہے۔ اگر وہ انسان کو اس کے جسم کے ساتھ لے جائیں تو وہ اذیت برداشت نہیں کر سکتا۔ اولیاء اللہ اس جسم کے ساتھ وہاں جا سکتے ہیں۔ اُن کے جسم کی لطافت تنِ مثالی کے برابر ہوتی ہے۔ کیونکہ ان میں معلومیت کا اعتبار رہتا ہے۔ ان کو اصلی حالت میں دیکھنا خطرناک ہوتا ہے۔

حضرت غوث اعظمؓ کے صاحبزادے عبد الرزاقؒ نے حضرتؓ کے وعظ

ہیں۔ یا جسمانی امراض پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس کا علاج کسی ڈاکٹر یا حکیم سے کرانا چاہیئے۔ بالخصوص ایام کی باقاعدگی حرارت کے دفعیہ کے لئے ضروری ہے جس سے سکون حاصل ہوتا ہے۔ اگر دماغی خلل واقع ہو تو مریض کو غصہ، جوش و اشتعال سے بچائیں۔ کوئی چیز خلافِ طبیعت نہ کریں، بلکہ ممکنہ طور پر اس کے منشا کا ساتھ دیں یا سمجھ سے تمام موانعات کو ہٹائیں اور اُسے خوش رکھیں۔ دوائیں، غذائیں ٹھنڈی دیں اور قاص آیات سے ربط رکھیں۔ حضورؐ نے حفاظت کے لئے سورۂ فلق، سورۂ ناس اور اعوذ باللہ پڑھنے کی ہدایت فرمائی ہے۔

**۲۷۔ حصار** اللہ تعالیٰ عارف عاملین کو محفوظ رکھتا ہے اور حصار ان کی ذات کا جُزو بن جاتا ہے۔ وہ ہر وقت پہروں میں رہتے ہیں جس میں ان کی ارادت و اہتمام کو دخل نہیں ہوتا۔ عام عاملین اور عارفین کی مثال ایسی ہے کہ ایک شخص بارود، گولی، اسلحہ خرید کر اپنی حفاظت کر رہا ہے دوسرے کے ساتھ اس کے علم و اطلاع کے بغیر سرکاری توپ خانہ رہتا ہے اور حفاظتِ الٰہی کام کرتی ہے۔

لاکھ حصار بندی کرو، جن و شیاطین اپنی قوتوں سے حصار توڑ کر آتے ہیں اور بدلہ لیتے ہیں پھر ان کو بھگانا پڑتا ہے۔ قلعہ میں بھی بیٹھو تو دروازوں سے، کھڑکیوں سے جھانکنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ دراصل خیر و شر کی جنگ ہمیشہ چلتی رہتی ہے۔ انسان اور شیطان کے مقابلہ سے اس عالم میں تحلیل مطلوب ہے تعطل مقصود نہیں اللہ والا حق کے نور سے وساوسِ شیطانی کا دفعیہ کرتا ہے۔ عامل کو نہایت فراست سے مدافعت کی ایسی ترکیبیں کرنی چاہئیں کہ رعب قائم ہو اور وہ خود ڈر کر بھاگ جائیں اور ان کی پارٹی بھی ان کی حمایت نہ کرے ورنہ جنگ بہت طول کھینچتی ہے ان کی تعداد اتنی کثیر اور روز افزوں ہے کہ روزانہ ایک لاکھ مار ڈالیں بھی تو لاکھ برس

کر کے اپنے عالم میں لے جائیں تو وہاں ان کی اولاد ہوتی ہے بعض عورتوں کے ساتھ ان کے تعلقات رہتے ہیں لیکن کسی کو پتہ نہیں رہتا۔ چنانچہ ایک شادی کے موقع پر دولھا کے آکر بیٹھنے کے بعد، دولہن نے زیور لباس اتار پھینکا اور برہنہ باہر نکل آئی۔ اور کہنے لگی: دوسرا دولہا کیسے آسکتا ہے۔ عادت سے یہ لڑکی بیماری ہو چکی لڑکیوں کے لئے چودہ برس کا سن نہایت خطرناک ہوتا ہے۔ جن و شیاطین جنسی روابط کیلئے تاک میں لگے رہتے ہیں جب کسی لڑکی کو راضی کر کے شیاطین شادی رچاتے ہیں، تو پھر کوئی علاج مفید نہیں ہوتا اور نہ وہ واپس آنا گوارا کرتی بلکہ عاقبت بھی ان شیاطین کے ساتھ ہو جاتی ہے، اللہ محفوظ رکھے۔ بظاہر وہ گھر میں ہوتی ہے لیکن دراصل وہ اس عالم میں شیاطین کے پاس ہوتی ہے۔ اس لئے آیات سے حفاظت ضروری ہے۔

**۲۶۔ علاج** بعض وقت جن انسانوں کو روپیہ پیسہ بھی دیتے ہیں۔ اگر جن کے اثرات ہوں تو جمالی آیتوں کے پڑھنے سے وہ دبے رہتے ہیں، ظاہر نہیں ہوتے۔ البتہ امراض کو فائدہ ہو جاتا ہے۔ لیکن اچھے برے جن و شیاطین جلالی آیتوں سے تڑپ کر بھاگتے ہیں بعض وقت یہ عاملین کے ریکارڈ، تعویذ وغیرہ اڑانے کی فکر میں رہتے ہیں۔ ہوشیار رہنا چاہیئے بعض وقت بدلہ کے طور پر بیماریوں میں مبتلا کرتے ہیں جس کی تمیز نہیں ہونے پاتی۔ ان کی طرف سے شدت ہو تو مریض چیختا ہے خفیف نامعلوم ہو تو مرض کی وجہ سے ادھر خیال نہیں جاتا۔ امراض اور اثرات میں تمیز کی ضرورت ہے۔

حضرت زینب رضؓ بہت جلالی ہیں۔ ان سے جن و شیاطین کانپتے ہیں۔ خاص خاص اولیاء اللہ کی نسبتیں مصیبتوں میں ہماری مدد فرماتی ہیں۔ اس لئے ایسے مریض کے کمرہ کو صاف رکھنا چاہیئے تاکہ نسبتیں متوجہ ہوں۔ وہ بھی معذوری کا لحاظ رکھتی ہیں۔ بعض وقت روحانی شیطانی اثرات تو چلے جاتے ہیں لیکن دماغی اثرات آجاتے

ہیں اور پھر نکل جاتے ہیں۔ اسی طرح یہ بھی آکر گذر جاتے ہیں اکثر منزل نہیں بتاتے۔ اس لئے ان کے پیچھے نہ پڑیں۔

ایک اہم بات یہ ہے کہ جمالی روحوں کے لئے جلالی آیات نہ پڑھیں اور جلالی روحوں کے لئے جمالی آیات نہ پڑھیں۔ ارواحِ طیبہ کو بھگانے کے لئے تعویذ وغیرہ کرنا بے وقوفی ہے۔ انھیں تکلیف ہوتی ہے اور کہتے ہیں۔ ہم تو ان کو فائدہ پہنچانا چاہتے ہیں اور یہ ہم کو خراب سمجھ کر نکلوانا چاہتے ہیں، سمجھ سے کام لیں۔

میرے ایک دوست سے ایک بزرگ جن بہت بے تکلف تھے، تہجد کے وقت آکر اُن کی جانماز پر اُن کا قرآن پڑھتے تھے۔ اُن کی بچی کے سر پہ ہاتھ رکھتے تھے۔ میری ایک عزیزہ ایک جن سے بچوں کو بہلانے کی خدمت خوب لیتی تھیں۔ تقسیم ہند کے ہنگاموں کے وقت انھوں نے ایک شہید مرد سے رفاقت وحفاظت طلب کی، نیاز دی۔ اُن کو رتی برابر نقصان کسی نے نہیں پہنچایا۔ ایک مرتبہ حضرت کے نظر آنے پر سب گھبرائے تو نیاز دی اور عرض کیا۔ آپ کا آنا مبارک ہے۔ لیکن بچے ڈرتے ہیں۔ اس لئے آپ براہ کرم نظر نہ آئیں اور مدد فرمائیں، چنانچہ پھر نظر نہ آئے۔

## ۲۹۔ نسبت اور شیطان

شیطان کا مقابلہ اللہ کے ربط (ایمان) اور نسبتوں کی قوت سے ہوا کرتا ہے۔ حزبُ اللہ ہمیشہ کامیاب اور حزبُ الشیطٰن ہمیشہ ناکام ہوتے ہیں۔ شیطان کی توجہ اُن لوگوں پہ بہت ہوتی ہے جو آگے چل کر بڑے اولیاءاللہ بننے والے ہوں۔ وہ اُن کا تعاقب کرتا ہے۔ جال میں پھنسانے کی کوشش کرتا ہے لیکن یہ نسبتوں کی برکت سے جال میں پھنستے نہیں یا اگر پھنسیں بھی تو اس کے جال کو پارہ پارہ کر دیتے ہیں اور باہر نکل آتے ہیں۔ اس طرح ان کا عملی تجربہ اُن کے مریدین کے لئے بہت مفید ہوتا ہے اور شیطان اُن کے نام سے کانپتا ہے۔

میں یہ ختم نہیں ہو سکتے یہ مسلمان سے صرف نسبتوں اور آیتوں کی وجہ سے گھبراتے ہیں۔ لہٰذا حفاظت کے لئے آیات کی طرف متوجہ رہیں۔

## ۲۸۔ ارواح کے ربط کا فائدہ

بعض کو عالمِ جنات سے طبعی مناسبت ہوتی ہے ان پر وہ عالم کھلتا ہے بچوں وغیرہ کو معلومات دینا چاہیئے کہ انسانوں کے ساتھ اکثر ملائکہ، جن شیاطین اور اولیاء اللہ کی روحیں رہتی ہیں وہ متمثل ہوتی رہتی ہیں عموماً نظر نہیں آتیں۔ اس طرح خیر و شر، جلال و جمال ساتھ ساتھ چلتے رہتے ہیں۔ یہ نظر پڑیں تو ڈرنا نہ چاہیئے نسبتیں اکثر حفاظت کرتی ہیں۔ اگر وہ جمالی روحیں ہیں تو خوشی کی بات ہے۔ لوگ تو انکی تسخیر کے لئے کیا کچھ کوشش کرتے ہیں۔ بے مانگے ملیں تو کتنی خوش قسمتی ہے۔ البتہ پہلے پہلے ان کے نئے پن کی وجہ سے گھبراہٹ ہوتی ہے۔ ہمارے اصلاحِ خیال سے اور ان کے بار بار آنے جانے سے اجنبیت دور ہو جاتی ہے۔

قرآن میں اولیاء اللہ کی حسنِ رفاقت کی بشارت ہے۔ حَسُنَ أُولٰئِكَ رَفِيقًا (پ ۵) خصوصاً شہداء کی روحیں بہت مدد کرتی ہیں۔ گھبرائیں نہیں یہاں لفظِ رفاقت مطلق ہے۔ اس کے معنے کو دوسرے عالم کی حد تک محدود کرنا غلط ہے۔ مطلق کو مقید کرنا کیا معنی رکھتا ہے۔ انبیاء اولیاء رفیقِ سفر ہیں۔ دنیا کی زندگی بھی سفر ہے۔ اس کے برخلاف اگر جلالی روحیں شیاطین کی ہیں تو بھی نہ ڈریں۔ کیونکہ ہمارے پاس آیتوں کی توپیں اور ایٹم بم ہیں۔ نیک جنوں کی آمد پر حرارت کا احساس ہوتا ہے شیاطین کے آنے پر بدکیفی اور بدشکلیں نمایاں ہوتی ہیں۔ انسان سے جن و شیاطین گھبراتے ہیں، بھاگتے ہیں، ان سے تعارض نہ کریں۔ جن لوگوں میں ان سے تعلق پیدا کرنے کی صلاحیت ہے اُن سے وہ بآسانی مل سکتے ہیں۔ ایک بات سمجھ کی یہ ہے کہ جس طرح چیتے، کتے، سانپ وغیرہ ہمارے کمپونڈ میں کبھی گھس آتے

مجھے عالمِ شہادت کی جنگ میں بفضلہ کامیابی ہوئی اور نئی زندگی حاصل ہوئی ورنہ ختم ہونا یقینی تھا۔ میری زندگی میں اس قسم کا دسواں گیارھواں واقعہ ہے۔

عاملین و عوام میں ایک غلط فہمی یہ رہتی ہے کہ جب ہم اللہ کے لئے پڑھتے ہیں تو ہماری حفاظت و نصرت ضروری ہے۔ یہ نفس کا دھوکا ہے۔ اصولاً عبد کو بے ارادہ، بے مطالبہ ہونا چاہیئے۔ شہادت تک مطلوب نہ رہے۔ اللہ غازی بنائیگا یا شہید۔ يَقْتُلُوْنَ الْاَنْبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ (۳/۲۱) کے بعد کیا دعویٰ کر سکتے ہیں۔

## ۳۱۔ عاملین کے خطرات

عاملین چونکہ جنات و شیاطین کو سزا دیا کرتے ہیں۔ اس لئے ان کے انتقال کے بعد جن و شیاطین ان کی اولاد سے بدلہ لینے کی کوشش کرتے ہیں اور ستاتے ہیں۔ علاوہ ازیں انتقال کے بعد اُس عالم میں بھی عاملین سے خوب مقابلے چلتے ہیں۔ اللہ رحم فرمائے، سیدھے سادھے نماز روزے والوں سے یہ چھیڑ چھاڑ نہیں کرتے۔ اِلَّا مَاشَآءَ اللہ۔ اولاد والوں کو عملیات سے بچنا چاہیئے۔ کاملین چونکہ مامور ہوتے ہیں اس لئے محفوظ رہتے ہیں۔ ورنہ مبتدی، متوسط دونوں نقصان اٹھاتے ہیں۔

## ۳۲۔ غیب و شہادت کا علم

بیماریاں موجود رہتی ہیں لیکن ڈاکٹر، حکیم عقلِ سلیم استعمال کر کے کہتے ہیں کہ بیماری گئی۔ ہر مرتبہ میں غلطی کا امکان باقی رہتا ہے۔ قطعیت کا علم سوائے اللہ کے کسی کو نہیں ہو سکتا۔ انبیاء سے لے کر عوام تک يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ (۱/۲) میں رہتے ہیں۔ لاکھ شہادت ہو، جسم و بال تک کی شہادت میں کئی غیب داخل ہیں۔ آج تک کوئی شخص ایک بال کا علم بھی قطعیت کے ساتھ نہ دے سکا، تو جن، بھوت کا علم کیا دے گا جو غیبی مخلوق ہے۔

اگر کسی مکان کے متعلق اثرات کا علم ہو اور دل متاثر ہو تو مکان چھوڑ دیں۔ اگر دل متاثر نہ ہو تو ڈٹ کر رہیں یا صلح کل پالیسی رکھیں اور آیات کے ساتھ پیٹے رہیں۔ انشاء اللہ کچھ نہ ہوگا۔ ارادہ و تخیّل کی کمزوری کی وجہ سے اکثر خیالی صورتیں بھی نظر آتی ہیں جن میں کوئی حقیقت نہیں ہوتی، تمیز ضروری ہے۔

## ۳۰۔ باطن میں جلال کی جنگ

جب ہم عالم اسلام کے لئے اجتماعی یا انفرادی مقاصد کے تحت جلالی آیات پڑھتے ہیں تو باطن میں شیطانی قوتوں کو اعلانِ جنگ ہو جاتا ہے اور وہ باطن میں حملے شروع کر دیتے ہیں جو خواب وغیرہ کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں جسے قلب محسوس کرتا ہے بعض وقت وہ مغلوب ہوتے ہیں اور بعض وقت سنبھالنے والی قوت نہ ہو تو ہم مغلوب ہو سکتے ہیں۔ اگر اسلحہ زوردار، ہم تربیت یافتہ، اعضا (دل، دماغ، جسم) اچھے ہوں اور استاد بھی خطرہ کے موقع پر فوراً مدد کرے تو کامیابی ہو جاتی ہے۔ اسی لئے بغیر اجازت جلالی وظائف نہ پڑھنا چاہیئے۔ بتانے والے کو بھی بروقت مدد کرنی پڑتی ہے۔ بروقت متوجہ ہونے پر حضور انورؐ، حضرت علیؓ اور حضرت غوث اعظمؒ مدد فرماتے ہیں جن وغیرہ کے حملوں سے ہمیں یہیں پناہ ملتی ہے۔ ایک جرمن محقق نے نفسی تحقیق کی کتاب میں لکھا ہے۔ کتنا ہی اچھا عامل ہو خطرناک موقعوں پر اُسے کسی کی نسبت (اعلیٰ روحانی ربط) بچا لیتی ہے۔ یہی اسلامی اصول ہے۔ قرآن کے لحاظ سے شیاطین توحید سے بھاگتے ہیں۔ وَإِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَأَزَّتْ (الزمر ۴۵/۲۴) یا انیت قوی ہو تو قریب نہیں آتے۔

بعض وقت عالم مثال کے مقابلے ختم ہوتے ہیں اور جنگ عالم شہادت میں شروع ہوتی ہے۔ تلواریں کھنچ جاتی ہیں۔ جان خطرہ میں پڑ جاتی ہے۔ بفضلہ نسبت ٹھیک ہو اور منشائے الٰہی ہو تو کامیابی ہو جاتی ہے۔ ابھی چار پانچ روز قبل

اِن ہی جھمیلوں میں پڑ کر انسان انسان بنتا ہے۔ بے تعلقی و گوشہ نشینی۔ ریاضت و عبادت۔ یہ بھی بڑے کام ہیں۔ روحانی ترقی کے مقام ہیں لیکن ان سے ملکوتی صفات اُبھرتے ہیں۔ انسانی کمالات نمودار نہیں ہوتے۔

فرشتے سے بہتر ہے انسان بننا		مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ

رہبانیت میں انسان دنیوی حقوق و فرائض سے گھبراتا ہے اور پرسکون عبادت کی محویت چاہتا ہے۔ حالانکہ انسان کی دنیوی زندگی حقوق و فرائض سے لبریز ہے۔ رہبانیت میں بھی نفس چاہے تو اپنی راحت و تقویت کے سامان پیدا کر سکتا ہے۔ چنانچہ بہتوں نے اسے ہم خرما و ہم ثواب کا مصداق بنا لیا۔ گرچہ عبادت کا فیضان ولزوم مسلّم ہے۔ تاہم بعض نے رہبانیت کے خوف سے انسانیت کے پہلو کو اس درجہ مقدم رکھا کہ گویا عبادت کو بھی اس میں ضم کر دیا۔

عبادت بجز خدمتِ خلق نیست		بہ تسبیح و سجّادہ و دلق نیست

بہر حال انسان مدنی الطبع مخلوق ہے۔ مل جل کر رہنا اس کی فطرت میں داخل ہے۔ میل جول سے حقوق و فرائض کے بے شمار تعلقات پیدا ہوتے ہیں۔ اگر یہ تعلقات بخوبی سنبھالے جائیں تو ترقی ہی ترقی ہے۔ اور اگر ان تعلقات میں فتور پڑ جائے تو تباہی افراد و قوم پر آتی ہے۔

## ۴۔ اجتماع و تعاون

انسان کو بحیثیت فرد دیکھو تو بہت کمزور نظر آتا ہے۔ ادنیٰ جانوروں کا دوڑ، اُڑان، پیراکی میں مقابلہ نہیں کر سکتا لیکن جب تعاون سے اور دل و دماغ سے کام کرتا ہے تو کوئی اس کا مخلوقات میں مقابلہ نہیں کر سکتا۔ خالق کے سوا کوئی نہیں جس کے سامنے یہ سر جھکائے۔ پھر وہی عاجز کا عاجز بندہ کا بندہ۔

خلاصہ یہ کہ انسان کی ترقی اجتماع و تعاون میں مضمر ہے۔ تن تنہا انسان انفرادی

تو ان کے اجسام میں اعضا کا ردّ و بدل فی الجملہ آسان ہے۔ رہا طریقِ کار سو اس کی اصلاح و ترمیم تو کوئی بات ہی نہیں۔ قوانین و ضوابط میں یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔

اِن داخلی کے سوا کچھ خارجی اسباب بھی توجہ کے طالب ہیں۔ خاصکر معاش اور آب و ہوا۔ معاش بقدرِ ضرورت میسّر ہو اور اُس سے بطریقِ مناسب کام لیا جائے تو صحت و قوت قائم رہتی ہے۔ بلکہ ترقی کرتی ہے۔ اس کے ساتھ اچھی آب و ہوا بھی ضروری ہے۔ اچھی آب و ہوا ہو تو بیمار تندرست ہوتے ہیں۔ خراب آب و ہوا ہو تو اچھے آدمی بیمار پڑ جاتے ہیں۔ جامعہ ہو یا کانفرنس۔ اِن کی آمدنی کافی، مصارف معقول ہونا ضروری ہے۔ اس کے علاوہ اِن اداروں میں اخلاق و عادات، خیالات و جذبات، منقولات و روایات، مشاغل و معمولات ایسے ہوں کہ ادارہ ترقی کرے۔ مختصر یہ کہ انسانی اداروں کی حالت زندہ اجسام کی سی ہے۔ یہ پیدا ہوتے ہیں۔ مرتے ہیں۔ تندرست رہتے ہیں بیمار پڑتے ہیں۔ پھلتے پھولتے ہیں۔ عمر طبعی پاتے ہیں یا قبل ہی ختم ہو جاتے ہیں۔ بغداد و قرطبہ، نلندا اور ٹیکسلا کے کارنامے تو معلوم و مسلّم ہیں۔ آج برطانیہ کو آکسفورڈ اور کیمبرج پر جو ناز ہے وہ ہاؤس آف کامنس اور ہاؤس آف لارڈس سے کم نہیں۔ اِن کا فیضان حکومت، سیاست، معاشیات، صنعت و حرفت، تہذیب و تمدن میں نمایاں ہے۔

اغراض و مقاصد کے اعتبار سے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس مسلم یونیورسٹی کی دمساز ہے۔ بعض لوگوں کا شاید خیال ہو کہ اب اس دمسازی کی ضرورت باقی نہ رہی۔ اگر تعلیم کی انتہا ہو چکی۔ اگر بیداری کی انتہا ہو چکی ہے۔ اگر ترقی کی انتہا ہو چکی۔ اور اگر واقعی اِن چیزوں کی انتہا ہو سکتی ہے تو ممکن ہے کانفرنس کا کام بھی ختم ہو گیا ہو یا ختم ہو سکے لیکن اگر ابتدا کو انتہا سمجھ لیں۔ اگر پہلے قدم کو منزل بنا لیں تو انجام معلوم۔ اگر قوم کو کام کرنا ہے تو یونیورسٹی کے علاوہ ایجوکیشنل کانفرنس کی بھی ضرورت ہے۔

**۳۔ انسانیت** | تمدن، معاش و معاشرت انسان کی سرشت میں داخل ہے

ضروریاتِ تمدن کی بدولت چند علوم باقاعدہ مرتب ہو گئے جو انسان کے تعلقات
سے بحث کرتے ہیں اور سوشل سائنس یا عمرانی علوم کہلاتے ہیں۔ گرچہ متمدن زندگی
میں انسانی تعلقات اس درجہ ایک دوسرے سے ملے جلے ہیں کہ ان کو جدا کرنا محال
ہے۔ تاہم ان میں تمیز کر سکتے ہیں۔ جیسی ہی مثال ہے کہ زمان و مکان، نور حرارت،
ہوا، آواز یہ سب یکجا ملے جلے رہتے ہیں پھر بھی تمیز میں آتے ہیں مثلاً کسی کمرہ میں بیٹھ
کر ہم دیکھتے ہیں کہ بارہ بجے ہیں۔ کمرہ وسیع، روشن گرم ہے۔ ہوا چل رہی ہے آواز
آ رہی ہے یہی حال انسان کے تمدنی تعلقات کا ہے کہ یکجا وجود اور جدا ملحوظ
رہتے ہیں مثلاً حصول معاش کے ضمن میں جو گوناگوں تعلقات پیدا ہوں وہ معاشی
تعلقات کہلاتے ہیں جس سے علم معاشیات بحث کرتا ہے۔ بنک اور بازار میں
ان تعلقات کا خاص مظاہرہ ہوتا ہے۔ اسی طرح علم سیاسیات حاکم، محکوم اور حکومت
کے درمیان تعلقات سے بحث کرتا ہے پارلیمنٹ، سنیٹ، کونسل اور اسمبلی میں
اس کے مظاہرے ہوتے ہیں۔ علم قانون انسانوں کے حقوق و فرائض سے بحث کرتا
ہے سرکاری عدالتوں میں اس کے مظاہرے ہوتے ہیں۔ اور جو تعلقات سوسائٹی
کے زیرِ نگرانی اخلاقی تعلقات کہلاتے ہیں علم اخلاق ان ہی تعلقات سے بحث کرتا
ہے۔ اور برادری کی پنچایتوں میں اس کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ جو تعلقات ایک
اعلیٰ ہستی یعنی خالق کے زیرِ نگرانی دینی تعلقات کہلاتے ہیں۔ مسجد، مندر، گرجا میں
اس کے مظاہرے ہیں۔ ان سب تعلقات کے سوا جو سب سے معاشرتی تعلقات
پیدا ہوتے ہیں وہ عمرانی تعلقات کہلاتے ہیں گھر در میں ان کا مظاہرہ ہوتا ہے
اس طرح معاشیات، سیاسیات، قانون، اخلاقیات، دینیات اور عمرانیات
متعدد علوم عمرانی قرار پائے۔ آج کل ان میں بھی بالخصوص معاشیات اور سیاسیات
بہت فروغ پا رہے ہیں کہ یہی بجلی کے دو مثبت و منفی رو یعنے کرنٹ ہیں جو مل کر

طور پر ادنیٰ وحشیانہ زندگی کی ضروریات مہیا نہیں کر سکتا لیکن اجتماع و تعاون کی برکت
سے اعلیٰ تمدن کے سامان مہیا کر رہا ہے کہ عقل حیران ہے۔ چنانچہ دورِ جدید کے
دو ہی بڑے امتیازات ہیں۔ ایک تو وسیع پیمانہ پر انسان کا اجتماع و تعاون، دوسرے
تمدن کی ترقی اور لوازمِ تمدن کی فراوانی و ارزانی۔ جو تکلفات کبھی امیروں کو نصیب
نہ تھے وہ آج غریبوں کی ضروریات شمار ہوتے ہیں۔

**۵۔ زمان و مکان پر تصرف** زمان و مکان یہی دو اعتبار ہیں جو انسان
کے تعلقات میں بُعد و فصل پیدا کرتے
ہیں۔ سرعتِ رفتار سے مکان اس درجہ قابو میں آگیا ہے کہ دنیا کے ممالک عنقریب قدیم
بڑے شہر کے محلے معلوم ہوں گے۔ بات چیت کے لحاظ سے تو دنیا کے ممالک بذریعہ
ریڈیو، ٹیلی ویژن ایک مکان کے کمرے معلوم ہوتے ہیں بلکہ عجب نہیں کہ عنقریب
ایک ہی دیوان خانہ بن جائیں۔ صرف ہاتھ ملانے کی کسر رہ جائے۔ اور شاید وہ بھی
کبھی پوری ہو جائے۔ مکان سے بڑھ کر زمان پر تصرف بڑھ رہا ہے۔ برسوں کے کام
منٹوں میں بمقدارِ کثیر انجام پاتے ہیں۔ اگر کام کی انجام دہی کے اعتبار سے ہماری
عمر کا حساب لگایا جائے تو آج کل کام کرنے والوں کی عمریں پہلے لوگوں کی عمروں
سے ہزار درجے بڑی ثابت ہوں گی لیکن افسوس اس امر کا ہے کہ آج کل مادی پہلو
غالب ہے۔ اخلاقی اور روحانی پہلو مغلوب ہے جس سے توازن بگڑ رہا ہے۔ اور
عدمِ توازن حد سے گذرا تو پھر تمدن کی خیر نہیں۔

**۶۔ علومِ عمرانی میں تمیز** معاشیات و معاشرت کے علمی اعتبارات و تعلقات
اول عام فہم کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے تاکہ زیرِ بحث
مسائل بہتر سمجھ میں آئیں۔ انسان کی زندگی میں اجتماع و تعاون کی بدولت بے شمار
گوناگوں تعلقات وسیع پیمانہ پر پیدا ہو گئے اور بہت پیچیدہ ہو گئے۔ اس لئے

## ۸۔ اصلاحِ معاشیات و معاشرت

سب انسان مہد سے لے کر لحد تک بلکہ مہد سے قبل اور لحد کے بعد بھی معاشی تعلقات میں بندھے ہوئے ہیں۔ بزرگوں کے دم سے تو بوجہ نیاز نذر وغیرہ، زیارت گاہیں معاشی تعلقات کا مرکز بن جاتی ہیں۔ بہرحال تمدنی تعلقات میں معاشی تعلقات کو بہت وسعت، عمومیت اور لزوم حاصل ہے۔ حتیٰ کہ تارکُ الدنیا جوگی بھی کھانے، پینے، روشنی، ستر پوشی کی حد تک لازماً معاشی تعلقات سے کام لیتا ہے۔ جدید تمدن کا نصب العین تو معاشی ترقی ہی ہے۔ نت نئے ضروریات تجویز کرنا، ان کے لئے نت نئے سامان ایجاد کرنا۔ گویا راحت و آسائش کے ساز و سامان سے دنیا کو جنت بنا دینا۔ لیکن چونکہ فی الحقیقت مسرت و اطمینان کا منبع باطن میں ہے، باہمہ ساز و سامان مسرت و اطمینان کا فقدان ہے، عقل حیران، دل پریشان ہے۔

معاشیات کے تحت اصلاحِ معاشرت مقصود ہو تو ایک ہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ آمدنی و خرچ میں کیا تناسب کس طرح قایم کیا جائے کہ زندگی ایمانداری اور خودداری سے بسر ہو۔ اصل اصول تو سب کو معلوم ہے کہ آمدنی خرچ سے بڑھی رہے۔ اگر خرچ بڑھانے کی خواہش ہو تو آمدنی بڑھانے کا حوصلہ ہونا چاہیئے۔ ورنہ کمتر خرچ پر قانع رہنا چاہیئے۔

## ۹۔ مدّاتِ آمدنی

آمدنی کے چار مدّات ہیں۔ اول سب سے بہتر معاشی کمائی ہے جس کی تین شکلیں ہیں۔ زراعت، صنعت و حرفت اور تجارت۔ آمدنی کی دوسری مد چوری، غبن، رشوت خواہ دوستانہ تحفوں کی مہذب شکل میں وصول کی جائے اور قرض جس کا مقصد ادائی نہ ہو۔ تیسری مد بھیک، خیرات یا جس میں کافی حد تک قومی چندے اور مذہبی نذریں داخل ہو سکتی ہیں۔ چوتھی مد

جدید تمدن کی مشین چلاتے ہیں اور مادی علوم ریاضی، طبعیات و کیمیا وغیرہ ان ہی دو علوم کی فرمائشات کی تکمیل میں مصروف ہیں۔ سچ پوچھو تو سیاسیات بھی معاشیات کے اشارہ پر چلتی ہے۔

## ۷۔ حقوق و فرائض کی بے اعتدالی

جس طرح علوم طب کی مدد سے جسم انسان کے امراض کی تشخیص کی جاتی ہے، علومِ عمرانی کی مدد سے تمدن کی خرابیوں کی بھی تشخیص و اصلاح کرنی ضروری ہے۔ جس بندش نے تمدن کو کس رکھا ہے وہ حقوق و فرائض کا تعلق ہے۔ اگر یہ بندش ڈھیلی پڑ جائے تو تمدن میں بھی لازماً ڈھیل پڑ جائے گی۔ اور اگر یہ بندش ٹوٹ جائے تو تمدن کی پراگندگی لازم ہے۔ ہر حق کا دوسرا رُخ فرض ہوتا ہے، اور ہر فرض کا دوسرا رخ حق۔ یہ دونوں رُخ لازم و ملزوم ہیں۔ حقوق و فرائض کے متعلق عہدِ جدید کا مسلک قابلِ غور ہے۔ اول تو بالعموم حقوق و فرائض کے آثار و ثمرات چند روزہ زندگی تک محدود قرار دیے گئے جس سے اُن کی اہمیت کم ہو گئی۔ دوسرے ان کی نگرانی بھی انسانی عدالتوں تک محدود کر دی گئی جس سے گریز کی کافی گنجائش نکل آئی۔ تیسرے حقوق کے مطالبہ کو مقدم رکھا گیا اور فرائض کی تعمیل کو مؤخر۔ جس سے لازماً کشمکش بڑھ گئی۔ حالانکہ اگر فرائض کی تعمیل کو مقدم کر دیا جائے تو حقوق کی تکمیل خود بخود ہو جائے۔ چوتھے حقوق قوی جماعتوں کے اجارے میں آ گئے اور فرائض کمزور جماعتوں کے گلے پڑے۔ حالانکہ فلاحِ تمدن کے لئے اس کی تقسیم برعکس ہونی چاہیئے یعنی کمزور جماعتوں کی طرف حقوق کا پلہ بھاری رہے اور قوی جماعتیں فرائض کا بار اپنی طرف زیادہ رکھیں تاکہ تمدن میں صحیح توازن قائم رہے۔ موجودہ تمدن میں انتشار کی وجہ یہی حقوق و فرائض کی بے اعتدالی ہے۔

ذات بگڑنے کا خوف دل میں نہ لائیں۔ ملازمت کا دائرہ محدود ہے۔ پھر بھی حکومت میں ان کی شرکت بہر صورت ضروری ہے۔ کام سلیقہ سے کریں تو معمار، بڑھائی، دھوبی، حجام، موچی بھی گریجویٹ سے بڑھ کر کما سکتے ہیں۔ تجارت اتنی آسان نہیں جتنی ناتجربہ کاری سے سمجھی جاتی ہے۔ سرمایہ کے علاوہ اس میں وسیع معلومات اور کثیر تجربہ کی ضرورت ہے۔ پھر بھی موجودہ حالات میں ایجنسی اور خُردہ فروش تجارت میں تعلیم یافتہ نوجوان اپنی جگہ نکال سکتے ہیں۔

**۱۱۔ مسئلہ سود** آمدنی کے ان معاشی ذرائع کے ساتھ رقمی لین دین بھی کاروبار کی ایک خاص صورت ہے۔ عہدِ جدید میں اِسے اتنا فروغ ہوا ہے کہ اس کے بغیر کوئی معاشی کاروبار (تجارت، صنعت، زراعت) چلنا محال ہے۔ رقم لینے دینے کے دو طریقے ہیں۔ ایک شرکت۔ دوسرے قرضہ۔ شرکت میں بشرائطِ گنجائش غیر متعین منافع ملتا ہے۔ قرضہ کی صورت میں لازماً معیّنہ سود ملتا ہے۔ فقہ اسلام کی رو سے منافع تو ہر طرح جائز ہے البتہ سود میں کلام ہے۔ بڑی جماعت اس کو رِبوا کے تحت ناجائز قرار دیتی ہے۔ اور چھوٹی جماعت اِس کو ربوا سے خارج سمجھ کر جائز قرار دینا چاہتی ہے۔ بلکہ داخل مان کر بھی جواز کا فتویٰ دیتی ہے۔ بہر حال سود کے مسئلہ میں اختلاف ہے اور اکثریت اس کے جواز کے خلاف ہے۔ لیکن لطیفہ یہ ہے کہ شرعاً تو سود لینا اور سود دینا دونوں ناجائز قرار دیے جاتے ہیں لیکن تمام ترزور سود نہ لینے پر دیا جاتا ہے۔ سود دینے کی ذرا بھی روک ٹوک نہیں ہے۔ چنانچہ مسلمان سود پر قرض لیتے اور سود دیتے ہیں تو کوئی مضائقہ نہیں سمجھا جاتا۔ البتہ مسلمان کہیں سود لے بیٹھیں تو مطعون کیے جاتے ہیں۔ چنانچہ بنکوں میں مسلمان لاکھوں روپیہ سود چھوڑ دیتے ہیں۔ جو بالعموم عیسائی مشنوں کی تبلیغ میں صرف کیا جاتا ہے۔ اگر یہ عذر کیا جائے کہ قرض دینا

دستِ غیب سمجھی جاتی ہے لیکن وہ غیب ہی کیا جس کا پتہ چل جائے۔

**۱۔ پیشے اور عزت** ملک کی تین چوتھائی آبادی زراعت پر گذر کر رہی ہے، خستہ حال ہے۔ اصلاح کی کوشش ہے ممکن ہے کچھ سدھر جائے۔ کاشت کار، زمیندار، ساہوکار اور سرکار میں جو گڈا پیچ پڑا ہوا ہے۔ اس کش مکش میں زمیندار کی حالت روز بروز نازک تر ہوتی جا رہی ہے۔ ساہوکار کی بھی روک ٹوک ہو رہی ہے لیکن لین دین جاری رہے گا۔ کاشت کار کا ایک ہاتھ سرکار کے ہاتھ میں ہے اور دوسرا ہاتھ سیاسی لیڈروں کے ہاتھ میں ہے۔ کمائی کا دوسرا ذریعہ صنعت و حرفت ہے۔ کارخانوں کی وجہ سے گھریلو ملکی صنعتیں پامال ہو گئیں۔ مروجہ پیشوں میں اصلاح و ترقی کی گنجائش ہے مثلاً سنگ تراش، معمار، بڑھائی، لوہار، رنگ ریز، درزی، دھوبی، سنار، حجام، موچی، باورچی۔ یہ سب بالعموم جاہل ہیں۔ یہ سب پیشے رسماً ذلیل سمجھے جاتے ہیں۔ ہندو تعلیم کے زیر اثر پیشے ذات شمار ہونے ہیں لیکن اسلامی تعلیم نے حلال و حرام کا معیار قرار دے کر اکلِ حلال کو باعثِ عزت اور اکلِ حرام کو باعثِ ذلت قرار دیا۔ پیشہ کا ذات سے کوئی تعلق نہ رکھا۔ تعظیم و تکریم کا مدار تقویٰ پر رکھا جس سے مراد علمِ صحیح اور عملِ صالح کا اجتماع ہے۔ غرض کہ عام مفید پیشوں سے جو ذلت وابستہ ہو گئی تھی اسلام نے اس کو رفع کر دیا۔ چنانچہ بزرگانِ دین نے مختلف پیشے اختیار کر کے عملی طور پر پیشوں کی توقیر قائم کی۔ اور بنی نوعِ انسان کے لئے حصولِ معاش کے ذریعے پاک اور وسیع کر دیئے۔

مسلمانوں کے میل ملاپ سے ہندوؤں میں ذات، پات اور پیشوں کی بندشیں ڈھیلی پڑ گئیں لیکن مسلمانوں میں نئے سرے سے داخل ہو گئیں۔ تنگدستی گوارا لیکن پیشے اختیار کرتے جھجکتے ہیں۔ غرض مسلمان شریف نوجوان پیشوں میں لگ جائیں۔

خالص علمی نقطۂ نظر سے بھی علمِ معاشیات میں سود کے جواز کے متعلق اختلاف ہے۔ ایک جماعت مفید جائز سمجھتی ہے تو دوسری مُضر ناجائز قرار دیتی ہے۔ اور منافع کو دونوں سود پر ترجیح دیتے ہیں لیکن آج کل سود لابد و ناگزیر ہے اور اس سے نجات دشوار نظر آتی ہے۔

---

ہے کہ اس قسم کے اموال کا مسلمان قانونی طور پر مالک ہو جاتا ہے۔ اور یہی ان کا وہ مشہور نقطۂ نظر ہے جس کی وجہ سے حنفی فقہ کی عام کتابوں میں

لَا رِبٰوا بَیْنَ الْحَرْبِیِّ وَالْمُسْلِمِ { اَلْحَرْبِیُّ (غیر اسلامی حکومت کا باشندہ) اور اَلْمُسْلِم (یعنی اسلامی حکومت کا باشندہ) میں رِبٰوا (سود) نہیں ہے }

کا ذکر پایا جاتا ہے۔ گویا یہ بین الاقوامی قانون کی ایک دفعہ ہے۔ عوام چونکہ اس کے اصل منشا سے واقف نہیں ہیں اس لئے اُن کو حیرت ہوتی ہے کہ رِبٰوا (سود) جب اسلام میں حرام ہے تو ہر جگہ ہر شخص سے لینا حرام ہونا چاہیئے۔ حربی یعنے غیر اسلامی حکومت کے غیر مسلم باشندوں کے ساتھ اس کے جائز ہونے کے کیا معنے لیکن سچی بات یہ ہے کہ حربی کے ساتھ یہ معاملہ رِبٰوا کا معاملہ ہی نہیں ہے۔

**(ب) ہندوستان میں مسئلہ رِبٰوا کا حکم** | اور یہی وجہ ہے کہ ہندوستان جہاں اس وقت اسلامی حکومت قائم نہیں ہے۔ یہاں کے غیر مسلم باشندوں سے بعض حنفی علماء سودی کاروبار کے جواز کا فتویٰ دیتے ہیں جس میں سب سے نمایاں شخصیت حضرت شاہ عبدالعزیز محدّث دہلویؒ کی ہے۔ شاہ صاحب کے فتاویٰ عزیزیہ میں یہ فتویٰ ایک سے زیادہ مقام میں موجود ہے۔ یہاں یہ بھی غور کرنے کا مقام ہے کہ شاہ صاحب نے یہ فتوے اس وقت صادر کئے تھے۔ جب لال قلعہ میں تیموری (مغل) سلاطین نام نہاد

حالت اختیاری ہے اور قرض لینا حالت مجبوری تو اوّل تو سب قرض بحالت مجبوری نہیں لئے جاتے بلکہ اکثر بغرض منفعت لئے جاتے ہیں۔ دوم شرع شریف کی تعمیل مقصود ہو تو قرض حسنہ کا اہتمام بھی ممکن ہے اور اگر پہلے سے سود کی شرط نہ لگائی جائے تو قرض گیر قرض حسنہ کی صورت میں بطور شکر گزاری اپنی خوشی سے بقدر مناسب زائد رقم ادا کر سکتا ہے[1] اور اس طرح قرض لین دین کی آسان صورت نکل سکتی ہے۔ بہرحال سود کا مسئلہ جلد علماء دین حل کریں[2] تو مناسب ہے کہ آیا بنک کے کاروباری سود پر ربوٰا کا اطلاق ہوتا ہے یا نہیں۔ ربوٰا اسلام میں صریحاً حرام ہے۔

---

[1] طبقات ابن سعد میں ہے حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے ایک شخص سے دو ہزار درہم قرض حسنہ لئے۔ واپسی کے وقت دو سو درہم زیادہ دیئے۔ قرض دہندہ نے پس و پیش کیا تو فرمایا۔ یہ تمہارے لئے ہیں۔ (اسوۂ صحابہ حصہ اوّل ص ۲۷۲ مرتبہ عبدالسلام ندوی صاحب)

[2] اس مسئلہ میں مولانا سید مناظر احسن گیلانی سابق صدر شعبۂ دینیات عثمانیہ یونیورسٹی نے امام اعظم حضرت ابو حنیفہؒ کے مسلک و اجتہاد کی روشنی میں حسب ذیل حل پیش فرمایا ہے۔ (للمؤلف حلیم) ملاحظہ ہو اسلامی معاشیات از مولانا مناظر احسنؒ طبع اوّل ص ۳۲۲، تا ۳۲۶

## "غیر اسلامی حکومتوں کی رعایا کے ساتھ مسلمانوں کے معاشی تعلقات"

**(۱) غیر اسلامی ممالک میں سود، قمار وغیرہ کا حکم** | غیر اسلامی حکومت کے کسی غیر مسلم باشندے کا روپیہ کسی ایسے ذریعہ سے جو اسلامی قانون کی رو سے لین دین کا قانونی اور شرعی ذریعہ نہیں ہے۔ مثلاً ربوٰا (سود) یا قمار (جوا) یا ازیں قبیل کسی غیر شرعی ذریعہ سے کسی مسلمان کے قبضہ میں آجائے تو کیا قانوناً یہ مسلمان اس کا مالک ہو سکتا ہے یا نہیں۔

چونکہ یہ ایک جائز اور مباح مال پر قبضہ ہے۔ اور مباح اور جائز مال کے مملوک ہونے کے لئے صرف قبضہ کافی ہے...... اسی لئے امام ابو حنیفہؒ کی رائے

## ۱۲۔ معیارِ زندگی اور تین گروہ

کسی فرد یا خاندان یا قوم کو جو ضروریات لاحق ہوتی ہیں وہ مجموعی طور پر معیارِ زندگی کہلاتی ہیں اگر ضروریات قلیل اور ادنیٰ ہیں تو گویا معیارِ زندگی پست ہے اور اگر ضروریات کثیر اور اعلیٰ ہیں تو گویا معیارِ زندگی بلند ہے۔ اور معاشی ترقی اسی کا نام ہے۔ معیارِ زندگی کے صحیح اصول کے متعلق دو گروہ افراط و تفریط میں مبتلا ہو گئے۔ ایک گروہ نے دنیا ہی کو سب کچھ سمجھا اور اسی میں غرق ہو گیا حتیٰ کہ ایمان و اخلاق کو فراموش کر دیا۔ دوسرے گروہ نے جوگ و رہبانیت کو اختیار کیا۔ اور دین و عقبیٰ کی خاطر ترکِ دنیا کو لازم قرار دیا۔ گویا دنیا سے کنارہ کش ہو گیا تیسرے گروہ نے معیارِ زندگی کے متعلق ایک اصولی مسلک پیش کیا۔ اس نے علمِ صحیح اور عملِ صالح پر زور دیا۔ اور حصولِ دنیا کی کمی بیشی کو لوگوں کے حوصلے پر چھوڑ دیا۔ گویا خوبی خرابی کا معیار علم و عمل قرار پایا۔ دنیا کی قلت و کثرت سے اس کا کوئی تعلق نہ رہا۔

چیست دنیا از خدا غافل بُدن
نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

---

(بسلسلہ صفحہ ۳۲۴) مع قبضہ کے ساتھ ہی وہ اس کا مالک ہو جاتا ہے۔

امام ابو حنیفہؒ کا یہ اتنا مستحکم قانونی نظریہ ہے کہ اس قسم کے اموال کی حرمت کی کوئی دلیل شرعی پیش کرنا مشکل ہے اسی لئے ان لوگوں سے جو اس مسئلہ میں امام ابو حنیفہؒ کے مسلک کا انکار کرنا چاہتے ہیں میرا مطالبہ ہے کہ قرآن و حدیث و اجماع و قیاس الغرض کسی شرعی دلیل سے الحربی کے اموال کے عدم اباحت کا ثبوت پیش کر سکتے ہوں تو کریں دوسری اصل چیز قرآن میں لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ (پ ۳) (یعنے نہ تم کسی پر ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے) کے دو مختصر لفظوں میں مذکور ہے۔"

"موجودہ کاروباری شکلیں قدیم زمانہ میں نامعلوم تھیں۔ اس لئے بعض لوگ قومی
ہمدردی کے خیال سے کوشاں ہیں کہ مروجہ سود کے جواز کی کوئی شرعی شکل نکل آئے
ورنہ مسلمان لین دین اور بینکوں سے الگ رہیں تو برا ہے۔ اور اگر عمداً خلاف شریعت
سود خواری کریں تو بھی برا۔ اور فی الحال جو سود دے کر تباہ ہو رہے ہیں وہ سب سے برا"
صراط الحمید جلد دوم للبرنی صفحہ ۱۷۷

---

شاہ ہند کے نام سے موجود تھے لیکن عملاً چونکہ ان کی حکومت ختم ہو چکی تھی اس لئے شاہ صاحب
نے حنفی فقہ کے اس معاشی مسئلہ کا عام اعلان سرزمین ہند میں کر دیا تھا۔

بعض غیر قانونی دماغوں کو یہ شبہ ہوتا ہے کہ اگر اس جواز کی بنا اس پر ہے کہ
غیر اسلامی حکومت کی غیر مسلم رعایا کا مال مسلمانوں کے لئے مباح ہے۔ تو پھر اس ملک
میں فریب، چوری، ڈاکہ وغیرہ جو شرعاً لین دین کے ناجائز ذرائع ہیں، کیا ان ذرائع سے
بھی مسلمانوں کو غیر مسلموں کا مال لینا جائز ہوگا۔ جہاں یہ مسئلہ فقہ حنفی میں لکھا گیا ہے
وہیں دوسرا فقرہ "مِنْ غَیْرِ غَدَرٍ" (یعنے خلافِ معاہدہ لین دین نہ ہو) کی قید
بھی بڑھی ہوئی ہے۔ اس وقت ہندوستان میں جو حکومت قائم ہے اس کے قانون
میں فریب، چوری، ڈاکہ وغیرہ کے ذریعہ سے لین دین کو ناجائز ٹھیرایا گیا ہے۔ اور اس
ملک میں جو مسلمان آباد ہیں وہ اس معاہدہ کے ساتھ ہی آباد ہیں کہ حکومت وقت
کے قانون کی خلاف ورزی نہ کریں گے۔ اب اگر چوری، ڈاکہ یا فریب وغیرہ ذرائع
سے ملک کے کسی باشندہ کا روپیہ کوئی لے گا تو وہ غدر (عہد شکنی) کے اسلامی جرم
مرتکب ہوگا۔ برخلاف ربوا (سود) کے کہ موجودہ حکومت نے اس ذریعہ سے لین دین
کو ناجائز نہیں قرار دیا ہے۔ پس یہ حکومتِ وقت کے ساتھ غدر (عہد شکنی) نہیں ہے۔
اور بغیر کسی عہد شکنی کے مسلمان کے قبضہ میں جب اس ملک کے غیر مسلم باشندے کا روپیہ آئے تو (سلسلہ نمبر صفحہ ۳۲۵)

کب اور کہاں کشتی جواب دیدے۔ اسباب سے کام ضرور لینا چاہیئے لیکن مسبّب سے ربط معلوم کر لینا مقدّم ہے کہ بہرصورت اس کی ضرورت ہے۔

مختصر یہ کہ خود معیارِ زندگی کی پستی اور بلندی میں کوئی خوبی یا خرابی نہیں ہے۔ بلکہ خوبی یا خرابی اس علم و عمل میں مضمر ہے جس کے تحت دنیا بسر کی جاتی ہے۔ اگر علم و عمل درست ہو تو بادشاہ، وزیر، افسر سب کچھ بنیئے۔ اگر علم و عمل درست نہیں تو پھر جوگی، راہب، فقیر بننے سے بھی کچھ فایدہ نہیں بلکہ الٹا نقصان ہے۔

خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَة ( )

## ۱۴۔ مجذوب۔ سالک

بعض مشہور بزرگانِ دین نے ایسی زندگی بسر کی کہ گویا دنیا سے الگ رہے۔ اس معاملہ میں چند امور وضاحت طلب ہیں۔ انسانیت کا سب سے بڑا کمال نبوت و رسالت ہے۔ نبی اور رسول بقدرِ امکان خالق اور مخلوق دونوں کی طرف متوجہ رہ سکتے ہیں اور رہتے ہیں۔ نبوت و رسالت کے بعد ولایت ہے۔ اس درجہ میں توجہ نسبتاً خالق کی طرف زیادہ رہتی ہے اور مخلوق کی طرف کم اور بہت کم۔ اگر توجہ مخلوق کی طرف سے بالکل ہٹ جائے تو وہ گویا عقبیٰ یا توحید کا جذب ہے۔ غفلت کی حالت ولایت کے برعکس ہے۔ اسمیں توجہ نسبتاً مخلوق کی طرف زیادہ رہتی ہے اور خالق کی طرف کم اور بہت کم۔ اگر توجہ خالق کی طرف سے بالکل ہٹ جائے تو وہ گویا دنیا کا جذب ہے۔ چنانچہ عقبیٰ یا توحید کے مجذوب تو شاذ نظر آتے ہیں لیکن دنیا کے مجذوبوں کی کمی نہیں۔ تہذیبِ جدید کے معیار میں یہی جذب بڑا کمال مانا جاتا ہے۔

غرض کہ جو بزرگانِ دین نبوت و رسالت کے مقابل، ولایت سے قوی نسبت رکھتے تھے وہ دنیا کی طرف کم ملتفت نظر آتے تھے۔ دوسرے یہ کہ گو اپنی باطنی نسبت کے تحت اپنی ذات کی حد تک وہ دنیا سے کم تعلق رکھتے تھے لیکن تمام عمر

## ۱۳- عبدیت یعنی صحیح توازن

چونکہ علم وعمل کا ظہور دنیوی تعلقات میں زیادہ ہوتا ہے اس لئے اس نے تحصیل دنیا کو ترکِ دنیا پر ترجیح دی کہ علم وعمل کا کمال ظاہر ہو۔ چنانچہ انسانیت کے بہترین نمونے انبیاء اور رسول مانے جاتے ہیں۔ ان میں بادشاہ بھی ہوئے۔ وزیر بھی ہوئے۔ سپہ سالار بھی ہوئے۔ دنیادار بھی ہوئے۔ یعنے ان کے بیوی بچے تھے۔ گھر بار تھے۔ کاروبار تھے اگر دنیا کو ایک دریا مانا جائے تو ان تینوں گروہ کی ایسی مثال ہے کہ ایک دریا میں کودا، مگر تیراک نہ تھا۔ ہاتھ پیر مار کر ڈوب گیا۔ دوسرا ڈوبنے کے خوف سے دریا کے کنارے بیٹھا رہا۔ تیسرے نے پیراکی کا فن سیکھا اور دریا میں اتر کر خوب کمال دکھایا فی الحقیقت انسان عدم توازن سے ڈوبتا ہے۔ خود پانی میں ایک سنبھالنے والی قوت پوشیدہ ہے۔ توازنِ صحیح کے ساتھ جب اس سنبھال کا ربط قایم ہوجاتا ہے تو پھر ڈوبنا اتنا ہی دشوار ہوجاتا ہے جتنا کہ تیرنا دشوار معلوم ہوتا ہے۔ اسلام کی تعلیم یہی ربط سکھاتی ہے الوہیت ورسالت جن کا خلاصہ کلمۂ توحید ہے جب علم وعمل میں ان کا توازن قائم ہوجائے تو اس حالت کو عبدیت کہتے ہیں۔ گویا عبد دنیا کا تیراک ہے۔ اور تیرتے وقت اس کو جو دنیا میں باطنی سنبھال محسوس اور منکشف ہوتی ہے وہ اصطلاحاً ربوبیت کہلاتی ہے، جو رب کی طرف سے آتی ہے۔

اسلام کی تعلیم کا منشا یہی ہے کہ عبدِ مومن کے علم وعمل میں اُلوہیت ورسالت کا صحیح توازن پیدا کرے۔ رب کی رُبوبیّت سے اس کا ربط منکشف کردے کہ پھر وہ بے تکلف دنیا میں تیرے، غوطے لگائے اور صحیح سالم ساحلِ مراد تک پہنچ جائے چنانچہ قرآنی دعا دنیا وآخرت کی بھلائی کے لئے ہے۔ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً (۲/۹) تیراکی سیکھنے کے بعد اگر کوئی کشتی میں بیٹھ کر سفر کرے تو مضائقہ نہیں بلکہ مفید ہے لیکن تیراکی سیکھے بغیر کشتی میں سفر کرنا خالی از خطر نہیں۔ نہ معلوم

ممالک میں جسمانی و دماغی تکان دُور کرنے کے لئے سینما کھیل دیکھنا ضروریاتِ راحت بلکہ ضروریاتِ کارکردگی میں شامل ہو جاتے ہیں لیکن یہاں بیکاروں کے لئے یہی چیز کھلی عیش پرستی ہے۔ موٹر ہی کو لیجئے۔ ترقی یافتہ ممالک میں زندگی کی جو مصروفیت ہے اور تموّل کی جو نوبت ہے، اُس کے مدنظر ضروریاتِ حیات ہیں تو بلا تکلف ضروریاتِ کارکردگی میں داخل ہے۔ راحت تک بھی کم نوبت آتی ہے تو عیش کا کیا ذکر ہے۔ اس کے برعکس ہندوستان میں موٹر عیش یا کم از کم راحت میں داخل ہے۔ موٹر نشینی کی اکثر صورت یہ ہے کہ جسم موٹر پر سوار، اور موٹر دل و دماغ پر سوار، عجب لطف ہے عجب بے لطفی ہے۔ یہاں تفریحات کا شعبہ عیش کی دعوتِ عام ہے۔ سینما سے مغربی ممالک بڑے بڑے کام لیتے ہیں لیکن ہندوستان میں کیا کیا نقصان ہو رہا ہے۔ مختصر یہ کہ ہر ملک و قوم کی ضروریات اضافی ہیں یکساں آثار مطلوب ہوں تو یکساں حالات پیدا کرنا لازم ہے

**۱۶۔ اصلاحِ رسوم** شادی غمی وغیرہ کے تباہ کن مصارف۔ رسم و رواج قابلِ ترمیم و تخفیف ہیں۔ قدیم کی طرح جدید طبقوں میں بھی تقریبات کا اسراف بڑھ رہا ہے۔ صرف شکل و نحل کا فرق ہے۔ جدید ترین مہذب تقریب کونسل و اسمبلی وغیرہ کے انتخابات ہیں۔ جن میں خلافِ قاعدہ اور خلافِ دیانت زرباری کی حد تک زرپاشی کی جاتی ہے اور ضمیر فروشی کی جاتی ہے۔ اخلاقی تخریب قابلِ توجہ ہے جسم کی اصلاح و ترقی کے لئے اچھی خوراک، اچھی ورزش۔ دماغ کے لئے اچھی تعلیم۔ اور دل کے لئے اچھی تربیت اور ان سب کی ترقیوں کے لئے اچھا ماحول، اچھی صحبت ہو۔ اس میں قانونی جبر کا موقع نہیں۔ البتہ عملی مثالوں کے ذریعہ تحریر، تقریر کے ذریعہ اصلاح کی تائید میں رائے عامہ پیدا کی جائے۔ اتفاق ہی بڑی قوت ہے۔ (خطبہ ختم ہوا)

**(۲) رہبانیت** اسلام نے حقوق العباد کو مقدم قرار دیا۔ رہبانیت کو غیر ضروری بلکہ مضر بتایا۔ دنیا کو دین بنانا سکھایا۔ اور خود انبیاء و اولیاء نے

دنیاداروں کی اصلاح و فلاح میں بسر کرتے تھے۔ گویا بالواسطہ دنیا میں مشغول تھے تعجب یہ کہ ترکِ دنیا کو اصلی مقصد سمجھ کر بعد کے معتقدین نے ان بزرگوں کے حالات و معاملات کو رہبانیت کے رنگ میں پیش کرنا مفید مطلب سمجھا۔ ورنہ واقعہ یہ ہے کہ اسلامی تعلیم کی رو سے دین و دنیا میں قوی ربط و اتحاد ہے۔ ایک دوسرے کا ممد و معاون ہے۔ جو کچھ خوبی اور خرابی کی تفریق پیدا ہوتی ہے وہ علم و عمل میں مضمر ہے۔ اصلاحِ معاشرت کی بحث کے سلسلہ میں، زندگی کے نصب العین میں دینیات کو بڑا دخل ہے۔

## ۱۵۔ ضروریات کے چار درجے

بہر حال معیارِ زندگی جیسا کچھ ہو، انسان کی ضروریات چار درجوں میں تقسیم کی جاتی ہیں۔ اوّل ضروریاتِ حیات۔ دوم ضروریاتِ کارکردگی۔ سوم ضروریاتِ راحت۔ چہارم ضروریاتِ عیش۔ ضروریاتِ حیات وہ ہیں جن کے بغیر زندگی دشوار ہے۔ مثلاً ہوا۔ روشنی۔ پانی۔ کھانا۔ ضروریاتِ کارکردگی وہ ہیں جن کے بغیر خوبی سے کام انجام دینا دشوار ہے۔ مثلاً صحت۔ قوت۔ تعلیم۔ تربیت۔ ضروریاتِ راحت وہ ہیں جو محنت کے بعد آرام پہنچائیں اور صحت و طبیعت کو درست رکھیں۔ مثلاً سیر تفریح۔ ضروریاتِ عیش وہ ہیں جن میں لذتِ نفس کی خاطر دولت اور وقت کو بے دریغ صرف کیا جائے۔ جیسا کہ کوتاہ اندیش امیروں کا حال ہے کہ اوّل دن عید اور رات شبِ برات ہے۔ پھر ہیہات ہے، ہیہات ہے۔

ہر ملک کے قدرتی حالات مثلاً موسم کی نرمی سختی۔ اور ہر قوم کے تمدنی حالات مثلاً امن بدامنی۔ کام کی کثرت و قلت۔ ان خصوصیات ہی پر ضروریات کی تقسیم کا مدار ہوتا ہے۔ مثلاً سرد ممالک میں لباس ضروریاتِ حیات میں داخل ہے۔ گرم ممالک میں یہ اہمیت نہیں۔ جنگی ممالک میں ہتھیار ضروریاتِ حیات میں شمار ہونا چاہئے اور پُر امن ممالک میں سیر و شکار کے لئے ضروریاتِ راحت میں داخل ہے۔ بڑے کاروباری

تصوّریت اور حقیقت پسندی کا ایسا خوش گوار امتزاج ہے کہ ہر طبقۂ خیال کے انسان کو اپیل کرتا ہے۔ اس میں ہر ایک کے اقتضا کے اظہار و تسکین کا سامان موجود ہے۔ یہ انسانی فطرت کی کمزوریوں کا لحاظ رکھتے ہوئے ابدی ترقیوں کا راستہ بتاتا ہے۔ جو علم سے عمل تک اور عمل سے سکون و اطمینان تک پہنچاتا ہے جس طرح لوگ دنیوی معاملات میں چاق اور عقلمند بننا چاہتے ہیں۔ اسلام چاہتا ہے کہ اسی طرح وہ دینوی معاملات میں دیندار بھی بن جائیں۔

حقوق اللہ (نماز وغیرہ) مختصر ہیں چند منٹ سے زیادہ نہیں باقی وقت حقوق العباد میں صرف کرنا مقصود ہے جو کثیر ہیں عبادتِ الٰہی کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ حقوق العباد کا ولولہ دل میں پیدا ہوتا ہے اور اُن کی ادائی سے رضائے الٰہی حاصل ہوتی ہے۔ اس لئے حضرت صدیق رض اور حضرت عمر رض فرض نمازوں کے بعد حقوق العباد میں مشغول رہتے تھے جن صحابہ کے بال بچے نہ تھے مثلاً اصحابِ صُفّہ۔ وہ علمی و تبلیغی کاموں میں مصروف رہتے تھے۔ اس طرح حقوق العباد کا دوسرا رُخ ادا کرتے تھے اسلام نے ماں کی خدمت پر اتنا زور دیا کہ حضورؐ نے حضرت اُویس قرنی جیسے عاشقِ رسولؐ کو اپنی ملاقات سے روک دیا۔ اور اس خدمتِ مادری کا صلہ یہ عنایت فرمایا کہ اپنا جُبّہ مبارک حضرت اُویس کے لئے عطا فرمایا۔

اصل میں حقوق العباد ہی انسان کا امتیازی مقام ہے۔ اسی میں عبدیت کی رفعت ہے۔ ورنہ ملائکہ ہر وقت هُوَ الْبَاطِنُ میں لگے ہیں۔ انسان کو هُوَ الظَّاهِرُ کے حقوق ادا کرنے کے لئے بھیجا گیا ہے۔ قرآن سے یہ منشا معلوم ہوتا ہے اور رسول اللہ ؐ کی سیرت گواہ ہے کہ اللہ نے انسان کو برائے نام عبادات کی طرف لگایا ہے۔ انسان عبادات میں ملائکہ کا کیا مقابلہ کرے گا جو رات دن سُبُّوحٌ قُدُّوسٌ کر رہے ہیں۔ اِسے حوائجِ ضروری سے فرصت ہی کتنی ملتی ہے۔ دو چار دفعہ اللہ اللہ کیا تو کیا کمال کیا

نمونہ بنکر دکھایا۔ البتہ اگر قدرۃً کسی طبیعت میں تفرید و تجرید یا زہد غالب ہو تو وہ خاص بات ہے اس کا خاص مقام ہے انبیاء میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا یہی رنگ تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے رنگ سے کس قدر مختلف معلوم ہوتا ہے۔ حالانکہ مرتبۂ نبوت میں سب یک رنگ واحد ہیں اور ان رنگوں کی وحدت حضرت خاتم النبیین صلعم میں ظاہر ہے۔ اولیاء اللہ میں بھی یہی کیفیت رہتی ہے۔ حضرت مخدوم علی احمد صابر کلیری رحؒ کی وہ شان کہ پرندہ پرندہ مارے کہ بستی کی بستی کا سلام ہو جائے تو بڑی بات ہو اور حضرت نظام الدین محبوب الٰہیؒ کے دربار میں وہ ہجوم و دولت و جاہ کہ بادشاہِ وقت کو رشک ہو۔ اور دونوں اپنے اپنے رنگ میں کامل۔ غرضیکہ قدرتی رنگ کے احکام جدا ہیں مگر تفرید و تجرید میں قدرتی رنگ نادر ہوتا ہے بیشتر یہ رجحان ماحول سے نمودار ہو کر غالب ہونا چاہتا ہے۔ بطریق تربیت عارضی غلبہ میں بھی مضائقہ نہیں لیکن جب اس کو مسلک بنا کر عادت ڈالی جائے تو یہ رجحان نہایت خطرناک ہے خود افراد کے واسطے اور بالآخر قوم کے واسطے۔ دینداری کے پردہ میں جو یہ رجحان پھیلتا ہے تو بالعموم کاہلی اور تن آسانی کا کرشمہ ہوتا ہے۔ اس رجحان کو روکنے اور دبانے کی ضرورت ہے حضرت شاہ ولی اللہ رحؒ نے اس پر کہیں تنبیہ لکھی ہے۔

(اقتباس صراط الحمید جلد اوّل البیرنی ص ۳۴۱)

**۳۔ حقوق العباد** | اسلام کا خاص زور حقوق العباد پر ہے۔ اسلام انسان کو گوناگوں تعلقات کے لئے تیار کرتا ہے۔ یہ رہبانیت و گوشہ نشینی کا مخالف ہے اس کی تعلیم یہ ہے کہ نہ صرف خلوت میں بلکہ جلوت میں بھی توجہ الی الحق رہے۔ اسی لئے نمازِ باجماعت کا اجر تنہا نماز سے بدرجہا زیادہ ہے حج و زکوٰۃ اور دیگر ارکان سے بھی یہی امر واضح ہے اسلام چاہتا ہے کہ انسان نہ صرف اپنے فرائض ادا کرے بلکہ اپنے حقوق سے بھی لطف اندوز ہو۔ اور معاشرتی زندگی ایسی بسر کرے، جو ذمہ دارانہ اور پُر لطف ہو۔ ساری اسلامی تعلیمات عملیت کی روح سے پُر ہیں۔ اسلام میں

مبنی نہ ہو۔ بلکہ اُسے اعلیٰ علم و کلچر اور عمدہ صحت و قوت کا مالک ہونا چاہیئے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔ اَنّٰى يَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا ...... وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِى الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ (۲/۲۴۷) ترجمہ: اللہ نے طالوت کو بادشاہ بنایا تو بنی اسرائیل نے کہا اس کو حکمرانی کا حق کیسے مل سکتا ہے۔ حالانکہ ہم اس سے زیادہ مستحق ہیں۔ اس کو تو مالی وسعت بھی نہیں۔ جواب دیا۔ اللہ نے اس کو تمہارے مقابل میں منتخب کیا ہے۔ اور علم و (عقل) جسامت میں زیادتی عطا کی ہے۔

اسلام میں بادشاہت اور ولایت میں تضاد نہیں۔ دینی آسمانی بادشاہت کے حصول کی خاطر دنیوی بادشاہت وحکومت سے دست بردار ہونا ضروری نہیں اسی طرح اس کے برعکس عمل نہ ہو۔ یعنے دنیوی جاہ وحشمت وحکومت کیلئے دین سے کنارہ کشی ضروری نہیں۔ جو شخص بنی نوع انسان کی جس قدر زیادہ خدمت کرتا ہے۔ اتنا ہی وہ روحانی و دینی اعتبار میں ترقیاں حاصل کرتا ہے۔ لہٰذا حکومت و بادشاہت سے بڑھ کر خدمات کے مواقع کہاں نصیب ہو سکتے ہیں۔ البتہ صرف ایک نکتہ ملحوظ رہے کہ ہمیں اللہ تعالیٰ کے پاس اپنے اعمال کا جواب دینا ہے حکومتوں کے عروج و زوال کا سلسلہ عالم میں جاری ہے لیکن حقیقت اپنے مقام پر قائم ہے کہ قرآن فرماتا ہے۔ قُلِ اللّٰهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ ... قَدِيْرٌ (۳/۲۶) ترجمہ: کہہ اے اللہ تو ملک کا مالک ہے۔ جسے چاہتا ہے تو ملک وحکومت عطا کرتا ہے۔ جس سے چاہتا ہے تو ملک چھین لیتا ہے۔ جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے جسے چاہتا ہے تو ذلیل کرتا ہے۔ تیرے ہاتھ خیر ہے اور تو ہر چیز پر قادر ہے

## ۵۔ امن و نظم

حقیقی امن و نظم اُس صیانت و حفاظت و سلامتی کے احساس پر موقوف ہوتا ہے جو بہترین انصاف کے ذریعہ قائم ہو اور ترقی کرے اور وہ انصاف سچی شہادت کی رہنمائی میں عمل میں آئے لیکن افسوس ہے کہ

البتہ انسان اخلاص وایمان کے تحت سعی کسب بال بچوں، غریبوں، یتیموں کی خدمت اور جہاد پر مکلف ہے۔ اور یہی اس کا وہ امتیاز وکرامت ہے جو ملائکہ کو حاصل نہیں اسی میں مومن کی بزرگی ہے لیکن لوگ اس کو بزرگی کی علامت نہیں سمجھتے۔ ظلم کرتے جاتے ہیں اور عبادتیں کرتے جاتے ہیں حالانکہ ظلم وحق تلفی کے بعد سارے اعمال تلف ہو جاتے ہیں۔ اللہ نے ھوالباطن کی طرف کم رجوع کیا ہے اور ھوالظاہر کے احکام زیادہ دیئے ہیں۔ سورۂ مزمل میں اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيلًا... وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا ملاحظہ ہو یعنے اے نبیؐ تم کو دن میں بہت کام (حقوق العباد) ادا کرنے ہیں۔ کم جاگو سو بھی جاؤ۔ جب ھوالظاہر سے فارغ ہو جاؤ تو ھوالباطن کی طرف رجوع کرو۔ فَإِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ الخ ($\frac{۳۰}{۱۹}$) لیکن اس تعلیم کے برخلاف دین کو بہانہ بنا کر تساہل وتغافل سے محض اپنے آرام کی خاطر بعض لوگ کسب حلال وخدمت اہل وعیال چھوڑ کر ھوالباطن کی طرف توجہ کرتے ہیں۔

## ۴۔ حکمران اور حکومت

قرآن، قائد حاکم اور حکومتی جماعت میں وہ خصوصیات دیکھنا چاہتا ہے جو بنی نوع انسان کی خوش حالی اور رفارغ البالی کے ضامن ہوں۔ حکمران میں کچھ ہلکا وقار وشان اور مقناطیسی شخصیت ضروری ہیں۔ اس کو مشورت کے ذریعہ عوام کا کامل اعتماد حاصل ہونا چاہئیے۔ اور اپنے فیصلوں اور روداددوں کی عمل آوری کے لئے پختہ مستحکم عزم ضروری ہے۔ اسی طرح حکمران جماعت میں اعلیٰ اخلاق اور اچھے ذاتی خصوصیات ہونے چاہئیں اور خداترسی اور روحانی کلچر ضروری ہیں۔ ان کی حکومت باہمی مشورہ کے ذریعہ ہو اور فیاضی اور رعایا پروری ان کا شعار ہو۔ حکم ہے شَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ($\frac{۴}{۸}$) أَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ ($\frac{۲۵}{۵}$)۔

رہا صدر حکومت کا سوال۔ وہ توارث یا امارت ودولت کی زیادتی پر

واشاعتِ اسلام کریں، دشمنوں کے حملہ یا ظلم کی شکل میں سپاہیوں کی طرح مردانہ وار اپنی مدافعت کریں۔ اگر ممکن ہو تو جس حد تک لازمی اور ضروری ہو، موثر اقدام بھی کریں لیکن کبھی حد سے تجاوز نہ کریں۔ ارشاد ہے۔ وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ۔ وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ لِلَّهِ (۲/۸) ترجمہ: فتنہ (کسی قسم کے نسلی، وطنی، لسانی، مذہبی اختلاف کی بناء پر ستانا) قتل سے زیادہ تکلیف دہ ہے۔ اُن سے اس حد تک لڑو کہ فتنہ (فسادِ عقیدہ) ختم ہو جائے اور دین خالص اللہ کے لئے ہو جائے۔

معاشرتی تعلقات میں اسلام ہمیشہ دوستی، خیر خیرات، عفو و کرم پر زور دیتا ہے اور ساتھ ہی انسانی فطرت کے تنوّع کو ملحوظ رکھتا ہے اور انفرادی طبائع کا ضروری پاس لحاظ رکھتا ہے۔ اسلام اعتدال کا قائل ہے۔ وہ فطری جذبات کو فنا کرنے کی اجازت نہیں دیتا یا جذبات کو دبانے کی ہمت افزائی نہیں کرتا۔ اس کی تعلیم یہ ہے کہ حقیقت پسندی کی روشنی میں تصوّریت قائم ہو۔ اور ہم محض خیالی دنیا میں نہ رہیں مطلب یہ کہ زندگی کی مشکلات کو تسلیم کرتے ہوئے اس کو آسان بنایا جائے۔ ارشاد ہے:۔ بُرائی کا بدلہ بھلائی سے اور تو دشمن دلی دوست بن جائے گا (۲۴/۱۹) وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ الخ (۴/۵) یعنی جو اپنے غصہ پر قابو رکھتے ہیں اور لوگوں کو معاف کرتے ہیں ایسے محسنین سے اللہ محبت رکھتا ہے۔ وَجَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِثْلُهَا... عَزْمِ الْأُمُورِ (۲۵/۵) ترجمہ: برائی کا بدلہ اس جیسی برائی (سزا) ہے پس جو معاف کرے اور صلح کرے تو اللہ کے پاس اس کا اجر ہے مظلوم ہونے کے بعد جو اپنی مدافعت کرتا ہے اس پر کوئی الزام نہیں۔ پھر ارشاد ہے:۔ جو صبر کرے اور معاف کرے یہ ہمت و عزیمت کے کاموں سے ہے۔ (۲۵/۵)

آج کل کی معاشرتی بے چینیاں اور پریشانیاں بالواسطہ یا بلاواسطہ ناکافی، نااہل انصاف کی وجہ سے پیدا ہیں جس کی گرفت گوناگوں ملحوظات کی وجہ سے ڈھیلی پڑتی جارہی ہے۔ اسلام کے احکام اس بارے میں بہت سخت اور قطعی ہیں۔ قرآن کے لحاظ سے انصاف کے معاملہ میں کسی محبت، ہمدردی، خوف، تائید، رحم و کرم کے عمل دخل کی اجازت نہیں چاہے فریق متعلق کا کتنا ہی نقصان کیوں نہ ہو جائے۔ پھر حکم ہے کہ گواہ کو سچی شہادت دینے میں پس و پیش نہ کرنا چاہیئے۔ وَلَا تَکْتُمُوا الشَّهَادَةَ الخ (۲/۳) وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ..... هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی (۶/۹)

ترجمہ: کسی قوم کی دشمنی یا نفرت اس کا باعث نہ بنے کہ تم ان کے ساتھ عدل و انصاف نہ کرو۔ عدل کرو کہ وہ تقویٰ سے زیادہ قریب ہے۔ پھر ارشاد ہے۔:

اے ایمان والو۔ انصاف کے قائم رکھنے والے اور اللہ کے لئے سچی گواہی دینے والے ہو۔ چاہے یہ شہادت تمہارے ہی خلاف پڑے یا تمہارے والدین کے یا اقرباء کے۔ چاہے فریق امیر ہو یا غریب (۴/۲۰)۔

لیکن پرہیز علاج سے بہتر ہوتا ہے۔ فساد کا منبع تو بددیانتی اور شر و شرارت ہے۔ یہ دونوں مومن پر حرام ہیں۔ ہمارے خوف و امید کا مرجع ذاتِ باری ہو تاکہ ہم اس دنیا کی ترغیبات و تحریصات میں مستقل متوازن رہیں۔ اور ہماری خیر خواہی اور نیک اندیشی کی ہمت افزائی ہو۔ حکم ہے۔ وَلَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا (۸/۱۸) اَحْسِنُوْا الخ (۲/۲) یعنے اصلاح کے بعد فساد نہ کرو۔ احسان کرو۔

## ۶۔ جنگ و جہاد

امن کے ساتھ ساتھ ہمیشہ جنگ کا امکان لگا رہتا ہے۔ چونکہ اسلام لازمی طور پر حقیقی عملی اور اثباتی مذہب ہے وہ ناگہانی واقعات کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ اس لئے اس نے مسلمانوں کے لئے ذی ضبط کے قوانین و قواعد مرتب کئے ہیں۔ قرآن کا حکم ہے کہ مسلمان تبلیغ

نفرت وکراہت لازم ہے تاکہ ایمان محفوظ رہے۔ ارشاد ہے: مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ وَلٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ (۱۴/۱۹) یعنے ایمان پر قائم رہ کر کراہتِ قلبی کے ساتھ مجبوراً عمل کرنا پڑے تو مضائقہ نہیں لیکن اگر اس کا سینہ کفر کے لئے کھل جائے اور اس میں مسرت حاصل کرے تو غضبِ الٰہی کا موجب ہوگا۔ اور اگر کافروں سے دوستی کرکے اُن سے محبتِ قلبی دکھائے اور دین وایمان میں قلب کو متاثر کرلے تو قرآن نے کہہ دیا۔ تم ان کافروں میں شمار ہو جاؤ گے۔ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ (۵/۵۱)

عجب معاملہ ہے کہ آج کل اکثر عوام تو قدرتِ الٰہی اور مُسَبِّب سے معاملہ کررہے ہیں لیکن بعض علماء اسباب میں گھر کر مایوس ہیں کہ اب سر رکھ دینے کے سوا چارہ نہیں۔ اصولاً خواص میں عزیمت ہونی چاہیئے۔ اور عوام میں رخصت کہ وہ مشکلات برداشت نہیں کرسکتے۔ لہٰذا دل سے بدعملی اور ظلم سے نفرت وکراہت لازمی ہے۔ یہ لوگ تمتّع، ترفّع کے لئے مداہنت فی الدّین پر اتر آئے ہیں جو ناپسندیدہ ہے۔ کسی صورت میں کوئی کام دین وایمان کے خلاف نہ ہو۔ اگر دین پر زد پڑے یا ترکِ دین کی فرمائش کی جائے تو مومنین آمادہ نہیں ہوسکتے۔ چاہے جان ہی جائے۔ اہلِ عزیمت ائمہ نے اسلامی سلاطین تک کی ملازمت قبول کرنے سے انکار کیا۔ اور جیلیں بھگتیں یہ اپنا اپنا حوصلہ ہے۔ عوام کو عزیمت پر مجبور کرنا مناسب نہیں۔ وہ رخصت کے تحت عمل کرسکتے ہیں۔

### ۸۔ نوکروں سے سلوک

اسلام نے نوکروں کے ساتھ انصاف کا حکم دیا ہے ان کے معاملہ میں تحکمانہ انداز مناسب نہیں۔ نوکر سے بقدرِ مناسب کام لیں فضل جانیں کہ ہمیں مالک بنایا ہے۔ اللہ تعالیٰ ایک منٹ میں خادم کو مخدوم بنا سکتا ہے۔ حضرت عمرؓ فلسطین کے سفر میں کچھ دور اپنے غلام

محولہ بالا آیات سے ظاہر ہوتا ہے کہ کتنی نرمی سے اور پھر قوت و اثر سے اسلام انسان کو وسیع القلبی، عفو و کرم کا شوق دلاتا ہے۔ اگر اس سے ان صفات کا اظہار ممکن نہ ہو تو بھی انتقام کو مناسب حدود میں رکھتے ہوئے پورے کنٹرول کی کوشش جاری رکھنا اسے لازم ہے جو غصہ میں کوئی معمولی بات نہیں۔ اس قسم کے فوری انصاف و سلوک کی قدر صرف کھلاڑی بہادر لوگ ہی کر سکتے ہیں۔

مزید ارشاد ہے: وَاِنْ عَاقَبْتُمْ..... لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصَّابِرِيْنَ (۲۲/۱۶)۔

ترجمہ۔ اگر تم بدلہ لو تو اتنا ہی لو جتنا نقصان تم کو پہنچایا گیا لیکن اگر صبر کرو تو صابرین کے لئے یہ بہت بہتر ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ صبر کا مقام، انتقام کی قوت اور محل کی مناسبت سے حاصل ہوتا ہے۔ اس کو بزدلی یا بے بسی سے ہتھیار ڈالنے کے ساتھ خلط ملط نہ کرنا چاہیئے۔ صرف وہی لوگ صبر و عفو کی نیکی کا دعویٰ کر سکتے ہیں جنھیں پورے انتقام کی قدرت اور مواقع حاصل ہوں۔ بہر حال ہر شخص کو اپنی مدافعت کے لئے تیار ہونا چاہیئے۔ پھر بھی انسان کو چاہیئے کہ وہ کتنا ہی قوی طاقتور ہو، شر و فساد اور ظلم و زیادتی سے بچے۔

## ۷۔ عزیمت و رخصت

قرآن میں عزیمت و رخصت دونوں کی تعلیم ہے عزیمت والے کم ہوتے ہیں جو بنائے نہیں بنتے۔ بلکہ اُن کا مضبوط، مستحکم، غیر متزلزل ارادہ اللہ کے فضل کا نتیجہ ہوا کرتا ہے۔ اس کی مکمل جھلک، اولوالعزم رُسل، انبیاء، اولیا میں بدرجۂ اتم نظر آتی ہے محض کسی فارم کی خانہ پُری سے ایسی جماعت بن نہیں سکتی۔ اسلام ایک فطری عملی مذہب ہے۔ ایمان ہی ایسی سپر ہے جو ہر نازک محل پر، ہر وار سے محفوظ رکھتی ہے چنانچہ رخصت و اجازت میں اتنی بڑی گنجائش ہے کہ اگر کسی مسلمان پر احکام اسلامی کے خلاف عمل کرنے کے لئے جبر کیا جائے تو معذوری ہے۔ لیکن کم از کم دل سے اس علم و عمل سے

موافقین بن گئے۔ اور ہم نوے فی صد ووٹ سے کامیاب ہوئے۔ غیرت کے ساتھ اگر اللہ کے تفویض کر دیں تو اس کے آثار پیدا ہوتے ہیں۔ دعوت وغیرہ سے رام کرنا نیچے کے علم والوں کا کام ہے۔ ہر محل کی گفتگو علحدہ ہے۔ مشہور قول ہے کہ ابرار کی نیکیاں مقربین کی برائیاں ہوتی ہیں۔

**۱۰۔ رائے کا اصول** کسی کے متعلق رائے قایم کرنے کا اصول یہ ہے کہ اپنی حد تک نیک نیت رہیں بغض و عناد سے بچیں۔

واقعات کی روشنی میں حسنِ ظن کے ساتھ رائے قایم کریں۔ اس کے باوجود اصرار نہ ہو کہ ہماری رائے صحیح ہے۔ اجتہادی غلطی ممکن ہے۔ جب کبھی مشورہ دیں تو للّٰہیت کے تحت دیں۔ اس میں اپنی غرض شامل نہ ہو۔ اچھی رائے قائم کرنے میں حرج نہیں لیکن خراب رائے قایم کرنے میں احتیاط لازم ہے۔

اپنی رائے یا ارادہ کو کسی پر عائد کرنا مناسب نہیں البتہ اشارہ کر سکتے ہیں۔ اگر کوئی اپنے اقتضاء کے تحت ہماری رائے کے خلاف بھی کریں تو حفاظتِ الٰہی حاصل ہو کر خیر ہوتا ہے۔ اچھا نتیجہ دیکھ کر سب کو حیرت ہوتی ہے۔ کیا معلوم کہ ہم جسے علانیہ اچھی رائے سمجھ رہے ہیں ع سِرّاً (پوشیدہ طور پر) اس میں کیا پردے پڑے ہیں جس کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں ماموریت کے سوا اصرار مناسب نہیں۔

کسی کی نیت کے علم کا دعویٰ کرنا مناسب نہیں۔ اکابر کے کسی عمل پر ان کو برا نہیں کہہ سکتے۔ البتہ جب تحقیق ہو تو خطا یا غلط کہہ سکتے ہیں۔

**۱۱۔ سلام کا اصول** آج کل اکثر عہدہ دار سلام کے انتظار کے مرض میں مبتلا ہیں۔ سلام کے متوقع رہتے ہیں۔ سلام کا ایک اصول ہے۔ آنے والے کا فرض ہے کہ وہ سلام کرے چاہے وہ افسرِ بالا ہی کیوں نہ ہو۔ اس عام نیازمندی کو تو چھوڑیے ہی دو کہ لوگ اسلام تو کیا، جوتے کی پالش تک کر دیتے ہیں۔

کو اونٹ پر بٹھاتے تو کچھ دور خود بیٹھتے۔ یہ تکلف نہ تھا۔ بلکہ واقعہ کا اظہار تھا اور شکر و خشیت کا مقام تھا۔ اِس لئے مساوات برتتے تھے۔

## ۹۔ مقبولیت اور ووٹ

فرمایا، مقبولیت اور ہردل عزیزی بہت بڑی ابتلا ہیں۔ یہ کسی کے اچھے علم و عمل کی دلیل نہیں۔ نیّت مقدّم ہے۔ نیک نیّت اور بدنیّت دونوں ہردل عزیز ہو سکتے ہیں۔ بلکہ نیک نیّت بعض وقت زیادہ ہردل عزیز نہیں ہوتا۔ فراستِ مومن کے معنے یہ ہیں کہ ابتدائی آثار ہی سے اندازہ کر کے محتاط ہو جائے۔ ورنہ نتائج ظاہر ہونے کے بعد احتیاط کا سوال کہاں۔ ہردل عزیزی کی کوشش نیچے مرتبے والوں کے لئے مناسب ہے۔ بڑے مرتبے والوں کے لئے مناسب نہیں۔ اس میں تعینات کی طرف توجہ ہو کر خوش خلقیاں دکھانی پڑتی ہیں۔ وہ خلق ہی کیا جو غرض پر مبنی ہو۔ اس میں ذمہ داری اپنے پر رہتی ہے۔ رضائے حق پر نظر رکھ کر مقبولیت سے بے نیاز رہیں۔ اس کے باوجود جو ہردل عزیزی حاصل ہوگی اس میں حفاظتِ الٰہی ہوگی۔ اس علم کے بعد بڑے بڑے موقعوں پر منشائے حق کے تحت میں نے بے رخی برتی۔ اللہ نے کامیابی، ہردل عزیزی عطا فرمائی۔

علی گڑھ یونین کی صدارت بڑا اعزاز تھا۔ میرا نام بھی تجویز ہوا۔ میں خاموش تماشائی تھا۔ دوسری طرف سے خوب دھوم دھام کی کوششیں تھیں۔ مجھے مغرور سمجھا جانے لگا۔ دو روز قبل بعض نے پوچھا، آپ انتخاب کے لئے کوئی کوشش نہیں کرتے۔ بے تعلقی برتتے ہیں۔ میں نے کہا، سچ ہے۔ میں نے ایک ہفتہ سے اس لئے ملنا چھوڑ دیا ہے کہ کسی کی رائے کو متاثر نہ کروں۔ اسلامی آداب کے لحاظ سے آزادانہ دیانتدارانہ، ووٹ (رائے) سے صدر بننا چاہیئے۔ غرض کی خاطر اخلاق دکھانا معیوب ہے۔ سبحان اللہ کی شان ہے! اس کا ایسا ردِّ عمل ہوا کہ سارے مخالفین،

لیکن جذباتی میں سوچ کی ضرورت نہیں کیونکہ جذبہ کا تعلق قلب سے ہے۔

حضرت خواجہ نقشبندؒ فرماتے ہیں۔ انسان جذبہ کے ذریعہ ایک سکنڈ میں کہیں سے کہیں ترقی کر جاتا ہے لیکن محض جذبہ سے کام نہیں چلتا علم اور جذبہ لازم و ملزوم ہیں۔ جذبہ کا مرتبہ علم کے بعد ہے۔ جذبہ کی مثال انجن کی سی ہے۔ انجن کو اسٹارٹ کر کے چھوڑ دیں تو کھیل گر کر یا ٹکرا کر تباہ ہو جائے گا۔ راستہ کا علم ہو اور راستہ پر چلا کر کام لیتے رہیں تو کام نکلے گا مقصود پورا ہو گا۔

نفسیات کا مسئلہ ہے کہ صرف موقع پر جذبہ کا استعمال ہو۔ جذبات کو نہ روکیں ورنہ دل و دماغ اور اعصاب پر برا بار پڑتا ہے۔ انبیاء کی تعلیم کی خصوصیت یہ رہتی ہے کہ علم اور جذبہ دونوں سے کام لیتے ہیں یعنے دماغ اور قلب سے۔ عمدہ زوردار تیز موٹر اچھے شوفر کے قابو میں رہتی ہے۔ وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ (غصہ کو ضبط کرنے والے اور لوگوں کو معاف کرنے والے) کے تحت انبیا ایسے انسان تیار کرتے ہیں جو جذبات پر اچھا قابو رکھتے ہیں۔ لطیف اور اعلیٰ جذبات اگر بیکار رہیں تو نقصان ہوتا ہے۔ اس لئے موٹر کی بیاٹری کو روز چارج کرتے رہیں تاکہ خراب نہ ہو۔ تکبیر، نعت، درود شریف وغیرہ جذبات کی چیزیں ہیں۔ ان کے ذریعہ قلوب کو گرماتے رہیں۔ علمِ صحیح سے جذبات کو چلا دے کر ان سے کام لیں۔

## ۱۳۔ بچوں کی تربیت

چھوٹے طالب علموں کی ایک پارٹی آئی۔ فرمایا: ہم کو اللہ نے تین چیزیں عطا فرمائی ہیں۔ جسم، دماغ، دل۔ قدرت کا منشا یہ ہے کہ ہم ان تینوں کو ورزش دے کر قوی کریں۔ جسم کی ورزش ایسی ہو کہ تمام اعضا سڈول قوی ہو جائیں۔ نہ یہ کہ ہاتھ مضبوط لیکن ٹانگیں کمزور۔ ہم بچپن میں ورزش کرتے۔ ہاکی، فٹ بال، کرکٹ کھیلتے تھے۔ علی گڑھ کے جاڑوں میں علی الصباح کورے مٹکوں کا سرد پانی نہانے کے مقابلے کرتے کہ چھینک بھی نہ آئے۔

وائسرائے لارڈ ویول عثمانیہ یونیورسٹی دیکھنے کے لئے آئے میں جس مقام پر کھڑا تھا وہ اُن کے راستہ سے علیٰحدہ اور دور تھا۔ مجھ پر نظر پڑی تو میری طرف آئے اور خود سلام کیا اور گفتگو کی۔ اگر کوئی افسر ہم سے گھر پر ملنے کے لئے آئے تو اُس کا فرض ہے کہ خود سلام کرے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر افسر و ماتحت کی مڈبھیڑ ہو جائے یا اچانک ملیں تو ماتحت سلام کرے گا۔ ماتحت اگر افسر سے ملنے جائے اور وہ ڈیوٹی پر ہو تو ماتحت کا فرض ہے کہ سلام کرے۔ نہ یہ کہ وہ کہیں بھی بیٹھا ہو تو اس کے پیچھے سلام کو جائے۔ اگر کسی میں غرور ہو اور وہ سلام کا منتظر ہو تو ایسے کو سلام کرنا گویا اس کے نفس کو غذا دینا ہے۔ ایسے کو سلام مناسب نہیں۔ اگر مساوات، بے تکلفی ہو تو کسی کی طرف سے بھی سلام کے اقدام میں کوئی مضائقہ نہیں لیکن اگر بڑی اور خصوصاً جماعتی برتری کا معاملہ آپڑے تو غیرت کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی حفاظت کی خاطر سلام میں تقدیم نہ کرے۔

## ۱۴۔ جذبہ کی تربیت

عام جلسوں میں جہاں ذہنیت کے مدارج مختلف ہوں، تقریر کرنے میں دقت رہتی ہے۔ عام لوگوں کی ذہنیت کا لحاظ کر کے تقریر کریں تو کہتے ہیں بچوں کی سی باتیں کر رہے ہیں۔ اعلیٰ ذہنیت کے مطابق کریں تو کہتے ہیں۔ بہت اعلیٰ باتیں کر رہے ہیں جو ہمارے کام کی نہیں۔ اللہ کا فضل ہو تو مضمون ایسا آتا ہے کہ سب سمجھتے ہیں اور سب کو فائدہ پہنچتا ہے۔ دوسرا سوال یہ پیش آتا ہے کہ مضمون علمی ہو یا جذباتی۔ اگر مضمون علمی ہو، جذباتی نہ ہو تو بھی مناسب نہیں۔ مثلاً علم کے دائرہ میں کسی نے فنی لحاظ سے اعلیٰ درجہ کی موٹر کی اسکیم بنادی لیکن لوگ سڑک پر چلتی دوڑتی موٹر دیکھنا چاہتے ہیں محض علم کافی نہیں۔ قرآن میں آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ کے کلمات کثرت سے آئے ہیں۔ یعنے علم کے ساتھ عمل پر زور دیا جاتا ہے علمی مضمون میں سوچنے کی ضرورت پڑتی ہو

استاد کی انفرادی توجہ ممکن نہیں۔ بڑی شخصیتیں اسکول کے باہر کی مصروفیات میں بنی ہیں۔

استاد میں محبت اور بے تکلفی ضروری ہیں لیکن اس کی ناراضی سے سب ڈرتے رہیں تاکہ نظم و ضبط برقرار رہے حضور کی محفل میں ہر شخص اتنا بے تکلف ہوتا کہ اپنے راز بیان کر دیتا لیکن ساتھ ہی ادب و رعب کا یہ عالم کہ گویا اہلِ مجلس کے سر پر پرندے بیٹھے ہیں۔ اسی لئے دین کا اصول ہے۔ اَلْاِیْمَانُ بَیْنَ الْخَوْفِ وَالرَّجَاءِ۔ (ایمان، خوف و رجا کے درمیان ہوتا ہے) اولیاء اللہ کی کامیابی کا بھی یہی راز ہے بچہ کو آزادی اور ذمہ داری ملنی چاہیئے۔ آزادی نہ ہو تو روح مُردہ ہو جائے گی۔ اور ذمہ داری نہ ہو تو ضبط غائب۔ استاد میں حکمت و فراست ہو تو آگ، زہر اور شر سے بھی خیر کا کام لیا جا سکتا ہے۔ اللہ نے کوئی صفت کوئی چیز بے کار نہیں پیدا کی۔ البتہ اس کے جا بے جا استعمال سے خیر و شر پیدا ہوتے ہیں۔

**۵۔ صحبت کی اہمیت** کم عمر اور جوان لڑکے لڑکیوں کو بزرگوں کی صحبت میں بیٹھنے کا عادی بنائیں۔ بزرگوں کو بھی اس بات کا خیال رکھنا چاہیئے کہ بچے ان کی صحبتوں سے مانوس ہوں متوحش نہ ہوں۔ جوان لڑکی کا جوان لڑکی کے ساتھ تنہائی میں مل کر بیٹھنا بھی مناسب نہیں صحبت کی بڑی اہمیت ہے۔ بُری صحبت زہر ہے۔ یہ خیال غلط ہے کہ ہم سمجھ دار ہیں بُرائی سے متاثر نہ ہوں گے۔ قرآن میں ہے۔ صادق بندوں کی صحبت میں رہو اور جاہلوں سے پرہیز کرو۔ بُری صحبت میں عقل نہیں چل سکتی عقل قلب کے تابع ہے اور قلب کا ایک منٹ بھروسہ نہیں۔ اسی لئے رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا کہنا پڑتا ہے۔

صحبت میں اپنا ارادہ، عقل، علم، کام نہیں کر سکتے۔ اگر ڈاکٹر متعدی امراض والوں کی صحبت اختیار کریں تو ان کا علم و فضل و عقل کام نہیں آتے مبتلا ہو جاتے

اسی طرح دماغی صحت وصلاحیت کے لئے مفید علمی وفنی کتابوں کا پڑھنا لکھنا ضروری
مثلاً ڈاکٹری، انجینری، معاشیات، اسی طرح قلبی صحت وقوت کے لئے اللہ رسولؐ کی
محبت، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ ضروری ہیں۔ اللہ کی ناپسندیدہ چیزوں کو چھوڑنا چاہیئے
اور پسندیدہ چیزوں کو اختیار کرنا چاہیئے۔ بعض وقت سزا نہیں ملتی، ملتوی رہتی ہے۔
تعلیم کے دوران میں طلبہ کو دو چیزوں سے کام لینا پڑتا ہے۔ ایک حافظہ۔ دوسرے
غور وفکر۔ تعلیم کا اصل مقصد غور وفکر کی قوت کو ترقی دینا ہے۔ تاکہ زندگی میں ہر محل پر اس
سے کام لیا جاسکے۔ ورنہ محض حافظہ میں سینکڑوں چیزیں بھرنے اور رٹنے سے
انسان محافظِ دفتر تو بن سکتا ہے، لیکن اچھا جج یا انتظامی عہدہ دار نہیں بن سکتا۔
حافظہ بھی اچھی چیز ہے لیکن اس سے کام لینے کا ڈھنگ ہونا چاہیئے۔ نقالی کے
مقابلہ میں اپچ اعلیٰ اور اہم ہے۔ علی گڑھ میں انگریزی مضمون نویسی کا مقابلہ تھا۔ ہم نے
اپنی سیدھی سادھی انگریزی لکھی تو انعام اول ملا۔ اسی طرح تاریخی مضمون نگاری
کے مقابلہ میں سب نے سوسو صفحے ٹائپ کے پیش کئے۔ میں نے اپنی قلمی موٹی تحریر
کے صرف تیس صفحے دیئے۔ ہمیں تین سو روپے کی کتب انعام میں ملیں۔ ممتحنین نے
رائے لکھی۔ گو یہ مضمون بہت مختصر ہے لیکن اس میں اپچ ہے۔ غور وفکر ہے۔ لکھنے
کا طریق خاص ہے۔ اور اپنا ذاتی ہے۔ اس میں نقالی اور رٹو پن نہیں ہے۔ بعض وقت
بعض ممتحن صحیح ذوق نہیں رکھتے۔ غور وفکر کی قدر نہیں کرتے۔

## ۱۴۔ ذاتی اقتضاءات اور تربیت

فرمایا۔ راست نصیحت میرے اصول کے خلاف ہے۔ صرف یارانہ گفتگو
رہتی ہے۔ اسی میں کسی کو فائدہ پہنچے تو پہنچے۔ ملاقات میں طبعی رجحان، اقتضا اور اختلاف
ذوق کا لحاظ ضروری ہے۔ محبت کا عنصر غالب ہونا چاہیئے۔ جس سے انسان یا حیوان
مانوس بلکہ لٹو ہو جاتا ہے۔ شخصیت اسکول ہو نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ ہر ایک کے ساتھ

کے ساتھ رجوع الی الخلق رہے اور حقوق اللہ کے، حقوق العباد کی ادائی میں مشغول رہے۔
عورتوں میں حضرت مریمؑ بھی بڑے مرتبے والی تھیں لیکن ان میں ولایت کی شان تھی۔
وہ کمرہ میں بیٹھی اللہ اللہ کرتیں وہیں غیب سے کھانا آجاتا۔ بڑے کشف و کرامات تھے
احوال تھے لیکن حضرت فاطمہؓ کی ذاتِ مبارک میں نسبتِ رسالتؐ کی جامعیت تھی کہ
جذب و صحو ساتھ ساتھ تھے مطلب یہ کہ عبادات کے ساتھ ساتھ صبح سے شام تک
میاں کے حقوق، بال بچوں کی خدمت میں لگی رہتیں حتیٰ کہ حضرت علیؓ کے فرمانے پر حضورؐ
سے ایک خادمہ مانگی تو وہ بھی دینا مناسب نہیں سمجھا گیا۔ چونکہ نشا فیت الی الخلق اور
حقوق العباد کو پورا کرنا تھا۔ اسی جامعیت کی وجہ سے آپ کا مرتبہ بلند ہے۔
لوگوں کو نہیں معلوم کہ حقوق العباد کی ادائی کتنی بڑی نعمت ہے نسبتِ رسالت کے
تحت اگر بیبیاں گھر کے کام کاج میاں کی خدمت اور بچوں کی پرورش کریں تو اسی میں ولایت
غوثیت، قطبیت سب مل سکتی ہے۔ یہ درجات زیادہ عبادات (نماز، روزوں)
سے نہیں ملتے، اگرچہ عبادات بھی اپنی جگہ مرتبہ رکھتی ہیں لیکن حقوق العباد کے ساتھ
تھوڑی عبادت بھی کی جائے تو بہت بڑا مرتبہ حاصل ہوتا ہے اسی لئے سورۂ مزمل میں
حقوق العباد پر بہت زور دیا گیا ہے رسول اللہؐ کی زندگی کیا تھی۔ اللہ کے حکم و علم کے تحت
مخلوق کے حقوق ادا کرنا۔

بی بی! دیکھو دین دنیا، دن رات دو دو چیزیں ہیں۔ ربنا آتنا کی دعا میں دین
دنیا کی بھلائی کی دعا مانگی جاتی ہے۔ ترازو کے دونوں پلڑے برابر رہنا کمال ہے ورنہ
ضعف ہوتا ہے۔ اللہ نے انسان کو دو آنکھ، دو ہاتھ، دو پیر دیئے ہیں۔ اگر صرف
ایک ہاتھ، ایک پیر رہے تو کمال نہیں، نقص ہے اسی طرح حقوق اللہ اور حقوق العباد،
دین اور دنیا کو ساتھ ساتھ چلانا چاہئے۔ دن کو دین سمجھو تو رات کو دنیا۔ یا جیسا بھی۔
بہرحال دونوں بھی اپنی جگہ ضروری ہیں۔ ان کا توازن بڑی چیز ہے۔ اللہ نصیب کرے۔

ہیں۔ اِسی طرح بُری صحبت میں لاعلمی میں روحانی، قلبی اور مادی جراثیم داخل ہو جاتے ہیں جو نکالے نہیں نکلتے۔ اور صحبتِ بد کا اثر صورت، صحت، دولت اور قلب پر پڑ جاتا ہے۔ یا تو اپنی نیک فطرت اور استقامت پر اتنا اطمینان ہو کہ بُری صحبت سے خود متاثر نہ ہوں۔ خواہ ہم دوسروں کو متاثر کریں یا نہ کریں۔ اگر ہم دوسروں کو متاثر کر سکیں تو نورٌ علیٰ نور۔ ورنہ صحبت بے فائدہ ہے۔ البتہ جب کبھی واقعی ضرورت پیش آئے تو اچھوں بُروں سبھی سے مل سکتے ہیں جس طرح ڈاکٹر مریضوں کے علاج کے لئے ان کے پاس آتے جاتے ہیں۔

مشہور مقولہ ہے۔ دولت گئی تو کچھ نہیں گیا۔ صحت گئی تو کچھ گیا لیکن اخلاق (ایمان) گیا تو سب کچھ گیا۔ زندگی کا اعلیٰ مقصود ایمان ہے جس میں حقیقی عزت ہے صحت و دولت کا مقصود بھی مومن کے لئے ایمان ہی ہے۔ لہٰذا عزت طلبی مومن کی حق کے تحت اور دنیا دار کی نفس کے تحت ہوتی ہے۔

## ۱۴۔ حضرت خاتونِ جنت رضؓ کا نمونہ

ایک دن میری بچیوں فردوس انیس سے حضرت نے فرمایا۔ ہمارے لئے رسول اللہ صلعم اور ان کی اولاد نمونہ ہیں۔ تمام اولیاء کا متفقہ مقولہ ہے کہ جو دقتیں کسی دربار میں دور نہ ہوں، وہ صرف حضرت خاتونِ جنت رضؓ کے در پر حل ہو جاتی ہیں کیونکہ یہاں نسبتوں کا ہجوم ہے۔ حضرت خاتونِ جنت رضؓ عورتوں کی سردار اور اُن کے لئے بہترین نمونہ عمل بنیں۔ حتیٰ کہ حضورؐ نے فرمایا۔ فاطمہ میرے جگر کا ٹکڑا ہے گویا آپؓ نے حضورؐ کی ساری تعلیم کو جذب کیا اور نمونہ بنیں۔

اللہ کے خاص بندے دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک تحتِ ولایت۔ ایک تحتِ رسالت۔ تحتِ ولایت کی شان یہ کہ جذب ہو کر بندہ صرف اللہ کے ساتھ مشغول رہے جس میں کشف و کرامات کا خوب ظہور ہوتا ہے۔ تحتِ رسالت کی شان یہ کہ نسبتِ حق

جماعتِ کنیزانِ فاطمہ رض" کا قیام عمل میں آیا۔ اور اس کا افتتاح حضرت کی اہلیہ محترمہ کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ اس کی معتمد فردوس فاطمہ اور نائب معتمد انیس فاطمہ تھیں۔ اس تحریک کا مقصد اللہ، رسول اللہ، اولیاء اللہ کی محبت اور بالخصوص بیبیوں میں حضرت خاتونِ جنّت رض کی محبت اور آپ کی سیرت کی پیروی کرنے کا شوق پیدا کرنا ہے کہ عورتوں کے لئے انتہائی سعادت یہی ہے کہ حضرت خاتونِ جنّت رض کی باندیوں میں ان کا شمار ہو جائے۔

مزرعِ تسلیم را حاصل بتول رض　　　مادراں را اسوۂ کامل بتول رض

اللہ کے فضل سے اس کے جلسے جاری ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس تحریک کو قیامت تک قائم و دائم رکھے۔ نیز عالمِ اسلام کے ہر ہر شہر ہر ہر قریہ میں اس کی شاخیں قائم ہوں۔ اور نعت و منقبت اور سیرتِ فاطمہ رض کے ذریعہ بیبیاں اپنا ایمان تازہ اور قوی کریں۔ (آمین)

## (۱۸) لڑکی کی نسل

حضرت کی کوئی اولادِ نرینہ زندہ نہیں رہی۔ صرف تین صاحبزادیاں ہیں۔ اقبال فاطمہ صاحبہ، کنیز فاطمہ صاحبہ اور رشید فاطمہ صاحبہ۔ ماشاء اللہ تینوں صاحبِ اولاد، خوش حال ہیں۔ ایک روز فرمایا۔ مجھے اپنی لڑکیاں اتنی عزیز ہیں کہ ایک سکنڈ کے لئے اولادِ نرینہ کی حسرت دل میں نہیں آئی۔ بلکہ ہمیشہ شکر کیا کہ مجھے حضورِ انور ؐ کی طرح صرف لڑکیاں ہیں۔ اتباعِ نبوی ؐ کا یہ فیض مجھے قدرۃً عطا ہوا جس طرح حضور ؐ کا فیض عالم میں صرف لڑکی سے پھیلا۔ اور حضور ؐ نے نواسوں کو اپنی اولاد فرمایا اور سمجھا، اسی طرح فیضانِ محمدی ؐ کے طفیل میں توقع ہے کہ میری اولاد لڑکیوں کے ذریعہ پھیلے گی۔ یہ ایک جاہلانہ خیال ہے کہ لڑکے کی نسل اپنی سمجھی جاتی ہے۔ اور لڑکی کی نسل اپنی نہیں سمجھتے۔ عوام کا تو کیا ذکر، بعض خواص اب بھی ایامِ جاہلیت کی طرح لڑکیوں کی ولادت پر رنج و افسوس کرتے ہیں۔

یاد رکھو۔ صبح سے شام تک کہیں بھی رہو، لیکن اپنا بسیرا اور مقام حضرت خاتونِ جنّت رضؓ کے قدم پر رہنا چاہیئے۔ یعنی اُن کی دھن بندگی رہے۔ حضورِ انورؐ آپ کیلئے تحریماً اٹھتے تھے جس سے آپ کا مرتبہ و مقام سمجھ میں آتا ہے۔ تم روزانہ جب بھی چاہیے سورۂ فاتحہ، سورۂ اخلاص و کوثر اور درود پڑھ کر کبھی حضرت خاتونِ جنت رضؓ، کبھی پنجتن پاکؑ، کبھی حضرت غوث اعظمؓ کو، یا جس سے بھی اپنا ربط ہو، ایصالِ ثواب کیا کرو۔ کتنا ہی بہتر کھاؤ پیو، پہنو، اوڑھو، لیکن حضرت سیّدہؓ کی محبت میں ان کے فقر و فاقہ کا ذوق ضروری ہے۔ اُن کے خیال سے دل میں تڑپ ہونی چاہیئے۔ او پیوند کے کپڑوں سے محبت چاہیئے اس کو کبھی بُرا نہ دیکھیں۔ آج کل لڑکیوں کا کیا حال ہے، سیاڑی پاؤڈر، لپ اسٹک میں تباہ ہیں۔ بناؤ سنگھار کے ذریعہ عظمت حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ اصل میں غنا ضروری ہے حضرت سیّدہؓ کی باندیاں بنو۔ تو شیرنی بن جاؤگی شیرنی بننے کے بعد، بہت لباس ہوں یا کم، دل تو شیر (غنی) رہے گا۔

بعض لوگ طبعاً، ولایت کی طرف زیادہ مائل رہتے ہیں۔ ان کا مقام الگ ہے چنانچہ بعض بزرگوں نے عمر بھر شادی نہیں کی عبادات میں غرق رہے لیکن محض نماز روزہ کی عبادتوں میں لگے رہنا ایک پلڑے سے غافل رہنا ہے۔ جو نقص ہے اور منشائے الٰہی کے خلاف ہے۔ لہٰذا ہمارے لئے بنیاد نسبتِ رسالتؐ میں ہے جس کی اتباع کا بہترین نمونہ حضرت خاتونِ جنّت رضؓ، حضرت خدیجہؓ، اور حضرت عائشہؓ ہیں۔ دوسرے بھی ہمارے سر آنکھوں پر ہیں۔ واجب التعظیم ہیں لیکن حضرت خاتونِ جنّت رضؓ کا اُسوۂ حسنہ، عورتوں کے لئے واجب التعمیل ہے۔

## (۱۷) جماعتِ کنیزانِ فاطمہؓ

۱۳۷۲ ھ میں بتاریخ ۳ رمضان المبارک جو حضرت سیدہ خاتون جنّت رضؓ کے وصال کی تاریخ ہے، حضرت کی تحریک پر اس ناچیز کے غریب خانہ، واقع دبیر پورہ حیدرآباد پر

## (۲۰) شادی

فرمایا۔ شادی کے معاملے میں صحت واخلاق (دین) دو چیزیں دیکھنی چاہئیں، نہ کہ دولت وجہیز۔ حضورؐ کا علم وعمل حضرت خاتونِ جنّت رضؓ کی شادی میں کیا تھا۔ بڑے بڑے سرداروں کے پیام تھے لیکن حضرت علیؓ کے پاس نقر وفاقہ تھا۔ حضرت نے فرمایا۔ اگرچہ امیر پیام دے رہے ہیں لیکن علیؓ بہتر انسان ہے۔ آج کل لوگ دولہا دلہن کو اُن کے اوصافِ ذاتی اور اقدارِ انسانی کے لحاظ سے نہیں چاہتے۔ حالانکہ اگر انسانی نقطۂ نظر والا لڑکا لڑکی ملیں تو معاشرتی گھریلو زندگی جنت بن جاتی ہے۔ ہاں اگر انسانیت کے ساتھ عہدہ، دولت بھی ہو تو، سونے پر سہاگہ ہے۔ ورنہ انسانیت اور دین واخلاق رکھنے والا غریب، امیر سے بہتر ہے۔

## (۳۱) تعدّدِ ازدواج

ایک صاحب نے کہا۔ قرآن میں تعدّدِ ازدواج کی اجازت ہے۔ فرمایا۔ اصول یاد رکھو۔ اسلام تقویٰ کا مذہب ہے نفسانیت وعیّاشی کا نہیں۔ اس میں شک نہیں، اسلام نے عدل کی خاص شرائط کے ساتھ چار شادیوں تک کی اجازت دی ہے لیکن حکم نہیں کیا ہے۔ اجازت اور حکم میں بہت فرق ہے۔ اسلام دنیا کے سب انسانوں کے لئے بشیر ونذیر ہے۔ اس لئے ہر ملک کے حالات کا لحاظ ضروری تھا۔ مثلاً عرب، عراق، شام وغیرہ میں خالص کھجور کھانے سے بہت خون بنتا ہے اور جنسی تقاضے بہت قوی ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود وہاں بھی لوگ عموماً ایک شادی سے زیادہ نہیں کرتے۔ شاذونادر ہی زیادہ کرتے ہیں۔ ہندوستان میں تو خون نہیں، کمزوری بلا کی۔ ایک عورت کے حقوق ادا کرنا مشکل۔ اس کے باوجود محض عیّاشی کی خاطر، دو دو، چار چار بیویاں لوگ کرنا چاہتے ہیں اور قرآن سے جواز نکالنا چاہتے ہیں۔ اپنی نفسانیت کے تحت قرآن سے سند لینے کی بے جا کوشش بڑا گناہ ہے۔ گویا مسجد میں بیٹھ کر شراب

بلکہ شرمندگی محسوس کرتے ہیں۔ لڑکیاں بھی غلط خیالی سے ایسا احساس رکھتی ہیں اور دیگر اجنبیت برتتی ہیں۔ حالانکہ لڑکیوں کا حقہ میراث میں رکھا ہے۔ حدیث شریف ہے: جس کی تین لڑکیاں ہوں اور ان کو محبت سے پالے اس کے لئے جنت واجب ہے۔

## (۱۹) لڑکیوں کی تعلیم

تعلیم نسواں کے متعلق فرمایا۔ لڑکیوں کو اور بالخصوص مذہبی اچھے رجحانات رکھنے والی لڑکیوں کو آج کل کی فضا میں اسکول بھیجنا قطعاً نامناسب ہے۔ اسکولوں کی فضا بہت مسموم ہے۔ سب بھیجنے والے دھوکے میں مبتلا ہیں۔ دیدہ و دانستہ سب برائیوں کو گوارا کر رہے ہیں۔ اسکولوں میں انسانیت و اخلاق کی تعلیم نہیں ملتی۔ نہ پردہ ہے نہ شرم و حیا ہے نہ اسلامی پردہ پوشی ہے بس نمود و نمائش ہے۔ دور زینت و لباس کا مظاہرہ۔ غازہ، پوڈر، لپ اسٹک، ناخن رنگنا، فلمی گانے گانا اور فلم اسٹار کا ڈریس۔ بڑا گھمنڈ یہ کہ پڑھ لیا۔ اور پڑھنے کی حقیقت معلوم کہ انسانیت و اخلاق ندارد۔ اکثر اس خیال سے پڑھاتے ہیں کہ بی۔اے ہو جائیں تو لڑکیوں کو اچھے رشتے ملیں گے۔ یا وہ خود بسری کے لئے خود مکتفی ہوں گی لیکن غیرت مند لڑکے ازدواجی زندگی کے لئے اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکیوں سے نسبت میں تامل کرتے ہیں۔ ملازمت کے سلسلہ میں دفتروں میں اخلاق کی جو گت بن رہی ہے ناقابلِ بیان ہے۔ عیاں راچہ بیاں۔ لہٰذا گھر پر بقدرِ ضرورت انگریزی، اردو، حساب اور مذہبی لٹریچر پڑھانا، امورِ خانہ داری، پکوان، سیون وغیرہ سکھانا زیادہ مناسب ہے۔ گھر کی اسلامی تربیت کی حفاظت ضروری ہے کہ حکم ہے:

وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ (۲۲/۱) یعنی گھروں پر وقار سے رہو۔ موجودہ زمانہ میں گھریلو زندگی کا امن و سکون تباہ ہو گیا ہے۔ میں نے اپنی بچیوں کو اسکول نہیں بھیجا لیکن کئی یوروپین لیڈیز نے حیرت سے کہا۔ یہ لڑکیاں، امورِ کن، یوروپین پکوان اور سینے پرونے، اسپورٹس میں اسکول کی لڑکیوں سے بہتر ہیں۔

ایسا ہی نازک اور خطرناک دور آگیا ہے۔ جیسا اسلام سے پہلے ایامِ جاہلیت میں آیا تھا۔ یہ شرع کو بہانہ بنا کر عورت کو تختۂ مشق بناتے ہیں جس کا نتیجہ ہندوستان میں عورتوں کا ارتداد ہو رہا ہے۔ وہ آریہ اور عیسائی بن رہی ہیں۔ میرے کہنے پر علامہ عبدالقدیر صاحب بیرسٹر نے بے حد مطالعہ و تحقیق کے بعد اس نازک مسئلہ خلع پر ایسا اچھا نوٹ لکھا کہ عورتوں کے حق میں رحمت ہے جسے اُس زمانہ کی بھوپال گورنمنٹ نے بھی لیا تھا۔ یعنی حضرت مالکؒ کے فیصلہ کے لحاظ سے عورت کو بھی حق حاصل ہے کہ انتہائی مظالم کے موقع پر خلع لے اور حکومت کا قانون تفریق کرا دے۔

## (۲) نسوانی جذبات کا لحاظ

اسلام اور دینداری کے معنی انسانیت (کلچر) کے ہیں۔ قرآن انسانیت سکھاتا ہے۔ اگر اسلام اختیار کرنے کے بعد انسانیت کا ادراک یا احساس تیز نہ ہو تو لاکھ وظیفے پڑھو قرآن سے کوئی تعلق و فیض نہیں ملا۔ اس کا امتحان معاملات اور حقوق العباد کی ادائی میں ہے۔ اسلام نے فرائض پر زور دیا ہے۔ دو فرض کے برابر دو ہزار سنت و نفل نہیں ہو سکتے۔ اسلام کا زیادہ زور حقوق العباد پر ہے نہ کہ نماز روزہ وظیفوں کی کثرت پر۔ جو اسوۂ حسنہؐ اور اسوۂ صحابہؓ سے ثابت ہے۔ حضرت نبی کریم ﷺ اور حضرات صحابہؓ فرض نمازوں کے بعد رات دن زیادہ تر حقوق العباد، جہاد، تیمارداری، سماجی خدمت میں لگے رہتے تھے، نہ کہ وظیفوں میں۔ اگر نماز کے بعد کوئی شخص دیر تک وظیفے پڑھنا چاہتا تو حضرت عمرؓ مسجد سے اٹھا دیتے تھے۔ یہ بصیرتِ فاروقی جانتی تھی کہ آئندہ چل کر ایسے وظیفے پڑھنے والوں سے بڑے فتنے پیدا ہوں گے اور وہ اوراد و نوافل کو بہانہ بنا کر حقوق العباد اور کسبِ حلال کے فرائض سے غافل ہو جائیں گے۔ حضرت عمرؓ راتوں میں بھی خدمتِ خلق کیلئے پھرا کرتے تھے۔ ایک رات ایک عورت کو جس کا شوہر باہر جہاد پر گیا ہوا تھا ایک دردناک فراقیہ شعر پڑھتے سنا۔ تڑپ اٹھے۔ فوراً حضرت حفصہؓ اور اپنی بی بی سے مشورہ فرمایا کہ ایک عورت شوہر کے بغیر کتنے عرصہ تک صبر کر سکتی ہے۔ دوسرے دن کمانڈروں کے نام فوری احکام جاری فرمائے کہ جہاد جیسے فرض سے بھی ہر چھٹے مہینہ مجاہدین کو رخصت دیکر وطن واپس

پیتا ہے۔ ایسوں کو قرآن سے ہدایت نہیں ہوتی۔ قرآن سے صحیح فیض و انکشاف کثرتِ معلومات پر موقوف نہیں بلکہ حضور انور کی محبت اور جوتیوں کا صدقہ ہوتا ہے ورنہ ... سر پٹک لو تو ایک بات نہیں کھلتی۔ اصل میں ہر عمل کا ایک اقتضا ہوتا ہے۔ وہ محل تو پیدا نہیں ہوا اور نفسانیت کو مقصود بنا کر قرآن سے سند لینے چلے۔ ایسے لوگوں پر لعنت آئی ہے۔

مختصر یہ کہ اسلام تعددِ ازدواج کی ہمت افزائی نہیں کرتا۔ حیدرآباد کے مسلمان امرا کثرتِ ازدواج کی بنا پر تباہ و برباد ہوئے۔ دین تباہ ہوئی، آئین تباہ ہوا۔ ہر جگہ ہی ناگفتہ بہ حالات تھے۔ بادشاہ، امرا، عورتوں میں لگ گئے تھے۔ جسم و دماغ تباہ ہو گئے تھے۔ اخلاق برباد ہو گئے تھے۔ نتیجہ یہ کہ ملک گئے۔ غیرت گئی۔ اسلام نے غیر معمولی قوتِ مردمی اور جنسی تقاضوں کی شدت، بیوی کی صحت کی خرابی، اولاد کا نہ ہونا اور دیگر خاص مصالح کی صورتوں میں عدل کی لازمی شرط کے ساتھ، تعددِ ازدواج کی اجازت دی۔ ایسی صورتوں کے بغیر محض لہو و ہوس کی خاطر کئی کئی شادیاں کرنا اور قرآنی اجازت کو سند میں پیش کرنا سخت ناپسندیدگی کی بات ہے۔ کام کریں شیطانی اور سند لیں رحمانی۔ کیسے ممکن ہے۔

## (۳۳) عورت کا مرتبہ اسلام میں

### (۱) مردوں کا ظلم اور مالکی فیصلہ

شرعاً، قانوناً، عرفاً، اخلاقاً، گھر کے جملہ امور کی ذمہ داری شوہر پر ہے۔ آج کل دینداری کا ادعا کرنے والوں کے بڑے طبقہ کا سلوک عورتوں کے ساتھ بدترین، ظالمانہ اور بہیمانہ ہے۔ عورت کو حیوان کی طرح سمجھا اور برتا جا رہا ہے۔ اس کی صحت، عافیت کی مطلق پرواہ نہیں۔ ایک عام بے حسی و شقاوت طاری ہے۔ اپنے فرائض سے کوتاہی ہے اور عورت کے فرائض کا مطالبہ ہے۔ ایسے حیوانی عمل کی وجہ سے مسلمان عورتوں پر

بچوں کی تعلیم، دوا درمن، حفظانِ صحت اور خدمتِ خلق وغیرہ تو در اصل مسلمانوں کی قرآنی تعلیمات ہیں لیکن ہم نے ایسی غفلت برتی کہ گویا یہ ہماری چیز نہیں بلکہ ہمارا کام صرف نماز، روزہ وظیفہ ہی ہے لہٰذا اب ہمیں اپنے صحیح مسلک حقوق العباد کی طرف آنا لازمی ہے جس میں دین ایمان کا اصلی امتحان ہے کیونکہ حضور انور ؐ کے فرمان کے لحاظ سے ایک ایک معاملہ کا اجر ہزاروں برس کی عبادتوں سے بڑھ کر ہے۔

**(۵) حضورؐ کا عورتوں کے حقوق پر زور** حضورِ انورؐ نے حجۃ الوداع میں عورتوں اور غلاموں کے حقوق پر بہت زور دیا اور اُن سے عمدہ سلوک کا حکم فرمایا۔ رسول اللہؐ پر سب سے پہلے ایمان لانے والی سب سے پہلے سب سے زیادہ اسلام پر جان، مال سے فدا ہونے والی حضرت خدیجہؓ عورت تھیں حضورؐ نے جان بھی دی تو حضرت عائشہ رضؓ کے زانو پر جن کے علم سے نصف دین محفوظ ہوا۔ اس طرح عورت کا اسلام پر عظیم الشان احسان ہے۔ حضرت عمرؓ اتنے شدید تھے لیکن آپ کی بی بی خفا ہوتیں تو مسکرا دیتے اور فرماتے۔ آخر یہ کمزور عورتیں ہیں لیکن بڑے بڑے صحابہ بلکہ سلاطین کو ٹھیک کر دیتے تھے۔ حضورؐ بیمار یہودی بچے کی عیادت کو کئی بار تشریف لیجاتے لیکن یہاں گھروں میں بیوی بچے بیمار تڑپتے رہتے ہیں تو بعض مولوی مشائخ کو حس نہیں۔ اور قوالی کر کے وجد حال کرتے ہیں افسوس ہے۔

**(۲۳) شیعہ سُنّی کا تصفیہ** فرمایا شیعوں کے مقررین اپنے لئے خاص خاص مسائل میں تحقیق کر کے ذہانت سے بات میں بات نکالتے ہیں اور اکابری اور اشاروں کی مثال بھر مشق کر کے بہتر سے بہتر شکل میں محرم میں اپنی تقریروں کو پیش کرتے ہیں، کمال دکھاتے ہیں لیکن ہمارے سُنّی مولوی صاحبان اعلیٰ سے اعلیٰ مسائل رکھتے ہوئے اکثر بلا تیاری تقریر کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں شیعہ حضرات کا دعویٰ ہے کہ ان کے مذہب کی خصوصیت حُبِّ اہلِ بیت ہے لیکن اُن کے نزدیک حُبِّ اہلِ بیت بغیر بُغضِ صحابہ

بھیج دیا جائے حقوق العباد کا کتنا پاس تھا۔ انسانی جذبات کا کیا لحاظ تھا۔ دراصل انسانیت اسی کا نام ہے۔

**(۳) امنِ عالم اور تو صدیقی** آج وقت سارے عالم کی کانفرنسیں اور بد امنیاں ختم ہو جائیں اگر حضرت صدیقِ اکبرؓ کا یہ خطبۂ خلافت کانفرنس میں بیان کیا جائے اور اس پر دنیا عامل ہو جائے۔

"صدق امانت ہے اور کذب خیانت۔ جو تم میں کمزور ہے وہ میرے لئے قوی ہے انشاء اللہ اس کا حق دلوا کر رہونگا اور تم میں جو قوی ہے وہ میری نظر میں کمزور ہے۔ اس سے انشاء اللہ حق لے کر چھوڑوں گا۔" (سیرۃ الصدیق ص۴۹، صدیار جنگ شروانی صاحب)۔

آج عمل افراد، طبقوں، قوموں اور حکومتوں کا عمل اس کے خلاف ہے جس کی وجہ سے مصیبتیں طاری ہیں دنیا میں ہر شخص کمزور کے مقابل اپنی قوت اور زور کا اظہار کر رہا ہے اور زور آوروں سے دبتا ہے حالانکہ مرد ہے تو زور آوروں سے لڑے اور ان کے حق کے لئے بڑوں سے لڑ لے۔ اگر نامرد ہے تو کمزوروں سے لڑیگا شیر چوہوں پر ہاتھ نہیں ڈالا کرتا۔ اسلام کا حکم ہے جہاد میں عورتوں، بچوں، بوڑھوں کو ہاتھ نہ لگائیں بلکہ کھیت تک نہ کاٹیں۔

**(۴) عورتوں کی مرتبت** حج کے موقع پر ایک بزرگ نے مجھ سے فرمایا دیگر قومیں ہماری نمازوں روزوں سے متاثر نہیں ہوتیں جب تک انھیں اس بات کا اطمینان نہ ہو کہ مسلمان ان سے معاملات اور انسانی خدمات میں افضل ہیں۔ فرنگی اقوام کے پاس انسانی خدمات اور عورتوں کی اعلیٰ مرتبت کے تخیلات تک نہ تھے انھوں نے مسلمانانِ اسپین میں عورتوں کی عزت و تکریم دیکھ کر اور سیکھ کر یورپ میں شوولری (عورتوں کی تکریم کمزوروں کی مدد) کا تخیل پیش کیا اور اس پر عمل کر کے عورت کو کہاں تک بلند کیا۔ اور طبی خدمات کے ذریعہ اپنا پیام عیسائیت پہنچا کر انسانی خدمات کی اہمیت و عظمت قائم کر دی عورتوں کی عزت اُنکی میراث

خرابی کا نتیجہ ہیں۔ ایک بڑے ماہر نفسیات کی رائے ہے، اعصاب کی خرابی کے نتیجے میں موجودہ تہذیب وتمدن کا جنازہ نکل جائے گا۔

آج کل دنیا کے طاقتی بلاک باہمی بے اعتمادی اور غصہ کی وجہ سے ہائیڈروجن بم جیسے خطرناک اسلحہ کی تیاری کی مجنونانہ مسابقت میں مبتلا ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسانیت خودکشی پر تلی ہوئی ہے نہ معلوم کس گھڑی کیا ہو جائے۔ اعصاب کی خرابی کی پہچان یہ ہے کہ وہ اچھے تعمیری رخ پر کام نہیں کرتے بلکہ انسان تخریبی اعمال پر اتر آتا ہے حتیٰ کہ خودکشی کر لیتا ہے فرد ہو یا خاندان، قوم ہو یا ملت۔ ایک ممالک سب کا یہی حشر ہوگا اب پہلے کی سی اچھی اعصابی حالت واپس لانے کے لئے ایک سے زیادہ نسل درکار ہے اعصابی خرابی کی وجہ سے نوبت یہ ہے کہ دنیا کے ارباب حکومت اور عہدہ داروں میں اصابت رائے اور عزم صمیم کا فقدان ہوتا جا رہا ہے آئے دن اپنے فیصلے بدلتے رہتے ہیں نتیجہ یہ کہ ذہنی انتشار بڑھ رہا ہے۔ حیرانی بڑھ رہی ہے کارکردگی متاثر ہو رہی ہے اگر ان کو اپنے اعصاب کی خرابی کا علم ہو جائے تو ان کے فیصلے ٹھیک ہوں گے خود اعتمادی توازن کا نام ہے اسی لئے اسلام میں غصہ یا رنج کی حالت میں فیصلہ کرنے سے منع کیا گیا ہے۔

## (۲۵) امراض کی اصل اور علاج

بیماریوں میں دل بڑا کام کرتا ہے۔ بیماری اور پریشانی اول دل کو متاثر کرتی ہے اور اس کا ردعمل تمام اعصاب و عضلات پر ہوتا ہے لیکن موجودہ ڈاکٹر صرف عوارض و علامات پر نظر رکھ کر علاج کرتے ہیں اور قلب، دماغ، اعصاب کے ردعمل کو بیماری سے جو تعلق ہے اس کا تدارک نہیں کرتے چنانچہ ماہرین نفسیات و اعصاب کی جدید تحقیق یہ ہے کہ موجودہ ڈاکٹر جلد ہی بیکار ہو جائیں گے آج کل اس علم کی طرف زیادہ توجہ کی جا رہی ہے اور بڑے بڑے لاعلاج مریضوں کا نفسیاتی طریق پر علاج کیا جا رہا ہے۔

قلب کا اثر اعصاب پر اور اعصاب کا اثر جسم پر ہوتا ہے۔ عمدہ سے عمدہ غذا کھائیے اگر دل پریشان ہو تو فائدہ نہیں ہو سکتا بلکہ زہر ثابت ہوتی ہے۔ غصہ اور پریشانی میں سارا خون بھی زہر بن جاتا ہے۔ ایک دن کی پریشانی ایک سال کا بیمار بنا دیتی ہے اور ایک روز کی حقیقی مسرت عرصہ کی صحت

متحقق نہیں۔ یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ اِن کی خاص خصوصیات تبرّیٰ، تقیہ، متعہ اور عیدِ غدیر ہیں۔

ایک بہت بڑے سنّی عالم جن کی بیش قیمت کتابیں مسوّدات کی شکل میں موجود ہیں شیعہ سنّی مسئلہ پر ان کی صرف ایک جلد چھپی ہے۔ اُن سے ایک دفعہ سالا جنگ اوّل نے کہا: مولانا! آپ سنّی شیعہ مسئلے کے متعلق کوئی ایسی بات بتلایئے کہ آسانی سے تصفیہ ہو جائے۔ فرمایا: بہت آسان ہے بشرطیکہ ایک بات تسلیم ہو جائے۔ وہ یہ کہ حضرت علیؓ صادق القول اور صادق العمل تھے تو سنّیوں کا مسلک صحیح ہے۔ اور اگر حضرت علیؓ صادق القول و صادق العمل نہیں تھے بلکہ تقیہ کرتے تھے تو شیعوں کا مسلک صحیح ہے۔

عجب بات ہے کہ شیعہ صاحبان حضرت علیؓ کی رفعتِ شان کو خطرہ میں ڈال دیتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ آپ نے حضرت صدیقؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے ساتھ تقیہ کیا اور مجبوراً ان کا ساتھ دیا کرتے تھے۔ حالانکہ سنّی کہتے ہیں جو امرِ واقعہ بھی ہے کہ حضرت علیؓ شجیع اور اسد اللہ الغالب تھے۔ آپ نے خلفاء راشدین کو حق پہچان کر اُن کا ساتھ دیا اور تعاونِ عمل فرمایا۔ البتہ جس مسئلہ میں اختلافِ رائے ہوتا، آپ بلا تامل قوت و جرأت سے صاف صاف ظاہر فرما دیتے تھے لیکن مخاصمت و مخالفت ہرگز نہ تھی۔

## (۲۴) اعصاب کی خرابی کا نتیجہ

فرمایا۔ اِس زمانہ میں صحت کی خرابی کا ایک خاص سبب اعصاب کی خرابی ہے۔ اعصاب کس طرح اچھے رہیں گے جب اچھا کھانا، خالص دودھ، مسکہ نہیں ملتا۔ گرم جنگ اور سرد جنگ کی وجہ سے ذہنی پریشانیاں الگ ہیں۔ معاشی مشکلات اور گرانی مزید بر آں ہیں۔ اور اخلاقی خرابیاں اس پر مستزاد ہیں۔ اعصاب کی صحت و درستی کے لئے روحانی اقدار، صبر، تسلیم، رضا کا عمل ضروری ہے جس کی طرف آج کل توجہ نہیں دی جا سکتی ہے۔ اور روحانی قوت ہی اعصابی امراض کو اچھا کر سکتی ہے۔ اس وقت دنیا کی مملکتوں کے باہمی مناقشے، جنگیں، ہر قسم کی اعصابی بیماریوں کی

ہے۔ ایسے کھانوں کے ناموافق آثار دیکھتے ہیں تو کھانے سے احتراز کرتے ہیں۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ کے ایک صاحبزادے بچپن سے مجذوب تھے سال یں بعض دفعہ جذب کا ایسا غلبہ ہوتا کہ برداشت نہ کرسکتے۔ ایسے موقعوں پر حضرت کسی غیر مسلم کی دوکان سے مٹھائی منگواکر چکھا دیتے تو کیفیت کم ہوجاتی تھی۔

## (۲۷) موت ۔ بیماری

ایک بہت بڑے ڈاکٹر نے ساری عمر کے تجربوں کا خلاصہ یوں بیان کیا کہ کوئی شخص مرض سے مرتا نہیں اور دوا سے اچھا ہوتا نہیں۔ موت آتی ہے تو مرتا ہے۔ البتہ دوا وغیرہ کرنا چاہیئے، اس کا انکار نہیں۔ اور یہ بھی ضروری نہیں کہ دوا سے اچھا ہو جائے۔ علاوہ ازیں اس ڈاکٹر نے اپنی اس بصیرت کا بھی اعلان کیا کہ موت کا مرض سے برائے نام بھی تعلق نہیں ـــ ڈاکٹروں کا تجربہ ہے اور اعتراف ہے کہ اللہ تعالیٰ بے اسبابی اور مایوسی میں کام بناتا ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب کوئی ظاہری امید نہ ہو اور نہ دوا ہو تو مریض کو مایوس کن منزل میں اللہ صحت وحیات بخشتا ہے، عدم سے وجود میں لاتا ہے۔ اس کے علاوہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب حیات کے سب سامان ہوں، اچھا خاصا ہو، عمدہ دوائیں، ماہر ڈاکٹر موجود ہوں اور یہ خیال ہو کہ وجود سے تو وجود کا فیضان آنا چاہیئے۔ ان کو کالعدم کر دیتا ہے اور موت آجاتی ہے۔ تُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَیِّتَ مِنَ الْحَیِّ۔ (۳/۱۱)

## (۲۸) مسلمانوں کی بدگوئی کا مرض

فرمایا۔ آج کل مقررین کا ایک طبقہ نکلا ہے۔ جو تقریروں میں ہمیشہ مسلمانوں کی برائیاں گنتا رہتا ہے۔ انھیں مسلمانوں کی خوبیاں نظر نہیں آتیں۔ ہر وقت برائیوں کا واویلا ہے کہ تم برے، تم ذلیل، تم خراب ـــ یہ لوگ قابلِ بازپرس ہیں۔ جہالت کی وجہ سے وہ نہیں جانتے کہ عوام پر اس کا کتنا برا نفسیاتی اثر

کو واپس لاتی ہے۔ دل و دماغ کے سکون کے لئے یورپ والے شراب پی کر سو جاتے ہیں اور دماغ کو آرام دیتے ہیں۔ یا حیوانی افعال ناچ گانے کے ذریعہ سکون حاصل کرتے ہیں لیکن اسی اطمینانِ قلب کو مسلمان اعلیٰ مرتبہ میں ذکرُ اللہ کے ذریعہ حاصل کرتے ہیں۔ اور بیروزگاری کی پریشانی میں رزاقیت کا علم اور بیماریوں میں شافی، کافی کے اسماء سے سکون و اطمینان حاصل ہوتا ہے۔

قلب کا اثر جسم پر کتنا پڑتا ہے اس کی وضاحت میں ایک کتاب میں یورپ کا ایک مشہور مستند واقعہ درج ہے۔ ایک نوجوان سترہ سالہ لڑکی بداخلاقی کے جرم میں گرفتار ہوئی۔ پولس نے اُسے رات حراست میں رکھا معلوم ہوتا ہے وہ اچھے اخلاق کی شریف لڑکی تھی اور غیر معمولی حساس تھی۔ اس کے قلب پر اس کا ایسا اثر پڑا کہ وہ صبح تک سَتّر سال کی بڑھی معلوم ہونے لگی۔ چہرہ پر جھریاں پڑ گئیں اور بال سپید ہو گئے۔ صبح کوئی نہیں پہچان سکتا تھا کہ آیا یہ وہی لڑکی ہے۔ بعد کو طبی رائے لی گئی کہ کیا اس طرح کوئی بارہ گھنٹے میں پچاس سال کی عمر طے کر سکتا ہے تو ماہرینِ طب نے فیصلہ دیا کہ یہ بات غیر معمولی قلبی تکلیف میں ممکن ہے۔

یہ دراصل ہمارے قرآنی دعویٰ کی ایک تصدیق ہے۔ فَكَيْفَ تَتَّقُونَ إِنْ كَفَرْتُمْ يَوْمًا يَجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيبًا (۲۹/۱۷) ترجمہ: سو اگر تم کفر کرو گے تو اس روز (قیامت) سے کیسے بچو گے جو بچوں کو بوڑھا کر دے گا۔ اعصابی صدمہ سے بعض لوگ منٹوں میں لنگڑے، کوبڑے ہو جاتے ہیں۔

**(۲۶) کھانے کے اثرات** قرآن میں اہلِ کتاب کے پاس کا کھانا جائز ہے مشرکین کے پاس کا کھانا کھانے کی بھی دین میں اجازت ہے۔ اس رخصت و اجازت سے استفادہ بھی کیا جاتا ہے لیکن رخصت اور ہے عزیمت اور ہے اس لئے بعض اہلِ دل جن کی نظر باطن پر ہوتی

میں امیرِ لشکر نے شراب نوشی کے الزام میں قید کر دیا تھا۔ جب جنگ کا معرکہ شروع ہوا تو اُس نے بے چین ہو کر نگران سے اجازت لے کر جہاد میں غیر معمولی کارنامے انجام دیے۔ اور پھر قید خانہ میں آکر بیڑیاں پہن کر بیٹھ گیا۔ اِس سے متاثر ہو کر امیرِ لشکر نے رہا کر دیا۔ تو اُس نے از خود شراب سے توبہ کی۔

افسوس ہے کہ آج کل مسلمانوں میں احساسِ کمتری پیدا کیا جا رہا ہے اگرچہ خرابیاں ایک حد تک صحیح ہیں لیکن طریقِ علاج غلط ہے جس سے مرض گھٹنے کے بجائے بڑھ رہا ہے۔ ان کو قرآن سے بتایا جائے کہ اسلام امید کا مذہب ہے۔ ناامیدی کفر ہے۔ اللہ شافی، کافی، قدیر ہے تو مریض کے دل کو ڈھارس بندھے گی۔ توبہ سے مرہم پٹی ہو۔ درود سے سکون ہو۔ توبہ میں حُب کی تجلی ہے۔ دنیا میں مرض کی دھوم نہ ہو۔ صرف چند مخلص، ہمدرد کارکن مطلع ہیں۔

مومن کا پوزیشن بہت اعلیٰ ہے۔ ارشاد ہے۔ وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (۳/۳) یہاں مجرد ایمان کی نسبت سے مومن کی رفعت بتائی گئی ہے۔ دوسری جگہ غیر مومنین کے متعلق ارشاد ہے۔ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ (۹/۱۲) یہاں مجرد کفر کی بنا پر انتہائی پستی کا بیان ہے۔ قرونِ اولیٰ کے مسلمان انسانوں سے معاملہ کرنے میں ایمان کی عظمت اور کفر کی پستی کی نسبتوں کو پیشِ نظر رکھتے تھے۔ اور دنیوی وسائل و اسباب کی کمی زیادتی سے انسانی قدر و قیمت کا تعین نہیں کرتے تھے۔ غریب عرب، قیصر و کسریٰ کے درباروں کی شان و شکوہ سے ذرّہ برابر مرعوب نہ ہوتے۔ بلکہ دربار کے قالینوں پر گھوڑوں کو لیجاتے۔ یہ سب اللہ کی ربوبیت پر ایمان و توکل اور حضور صلعم کی محبت کا اثر تھا۔ لیکن آج مسلمان امریکہ و روس سے مرعوب ہو رہے ہیں۔ جاننا چاہیئے کہ اگر ان کے پاس دماغی علوم ہیں تو ہمارے پاس

پڑتا ہے۔ قدیم اطبّاء مریض کے سامنے کبھی مرض کا ذکر نہیں کرتے تھے۔ البتہ علاج کرتے تھے لیکن جدید ڈاکٹر مریض کے سامنے ہی کہتے ہیں۔ چوبیس گھنٹے مریض خطرہ میں ہے۔ مریض کہتا ہے جب ہم خراب ہیں، مایوس العلاج ہیں تو دوا، پرہیز کی کیا ضرورت ہے۔ مایوس ہو کر لاپرواہ ہو جاتا ہے۔ اصلاح کے بجائے فساد بڑھتا جاتا ہے۔ اگر بیماری سخت نہ بھی ہو تو مریض کی نفسیات اور اعصاب پر اس کا بہت بُرا ردِّعمل ہوتا ہے۔ اور وہ وہمی ہو کر واقعی سخت بیمار کی ذہنیت پیدا کر لیتا ہے۔

اِن مقرّرین کو کافر، عاصی اور صالح کا فرق معلوم نہیں۔ قرآن نے کافر کو مُردہ کہا اور عاصی کو بیمار، اور صالح کو صحت مند۔ بے شمار مسلمان بیمار ہیں لیکن بیمار مُردوں کے مقابل ہزار درجہ بہتر ہیں۔ مُردے کو دفن کرتے ہیں، بیمار سے آس بندھی رہتی ہے۔ البتہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ بیمار صحت مندوں سے خراب ہے، نہ کہ مُردوں سے۔ چاہے وہ کتنے ہی قیمتی ریشمی کفن میں ملبوس ہوں۔ مُردہ مُردہ ہے۔ اور بیمار زندہ ہے۔ مسلمانوں کو کبھی اس طرح ذلیل، حقیر، پست ہمت نہ کریں۔ البتہ تندرست بننے کی ہدایت کریں۔ حضرت شاہ عبدالحق محدّث دہلوی رحمۃ نے فرمایا۔ اگر رائی برابر ایمان والے کا اجر اس عالم میں کھل جائے تو زمین آسمان اس نور کی تاب نہ لاسکیں۔ حضورِ انور صلعم سے ادنیٰ نسبتِ غلامی رکھنے والا، دوسری قوموں کے لاکھ اچھوں سے بہتر ہے اور اخلاقی برائیوں کے اعداد و شمار کے لحاظ سے آج بھی مسلمان، دیگر اقوام سے ہر طرح کم ہیں۔

اسلام کا مستقبل بہت امید افزا ہے۔ نوجوانوں کی غلطیوں سے مایوس نہ ہوں۔ انھیں میں اللہ رسول کے فدائی موجود ہیں۔ میں بعض ایسی لڑکیوں، لڑکوں کو جانتا ہوں۔ جو رات دن چھپا چھپا کر تحفۂ محمدی کی نعتیں پڑھتے رہتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ کا واقعہ ہے کہ ایک نوجوان کو جنگ کی چھاؤنی

# فصل نہم
## حضرت کے تعلقات

**(۱) بے ہمہ۔ با ہمہ** فرمایا۔ ہماری زندگی بے ہمہ اور باہمہ کا عجیب نمونہ رہی ہے اس زندگی میں امن وعافیت بہت ہے۔ ہر طبقہ سے گہرے تعلقات، اور پھر کوئی تعلق نہیں۔ اپنے علم و عمل میں مکمل آزادی، جو چاہیں سو کریں، کوئی پابندیاں نہیں۔ تعلقات کی کثرت کے باوجود بے تعلقی۔ حیرت ناک۔ سب میں شامل، سب سے الگ۔ کسی سے ملنا نہ جلنا۔ رائی برابر قلب پر گرانی نہیں۔ ذمہ داری کی فکر نہیں۔ اللہ کے بھروسے اس قسم کی زندگی اختیار کی ہے۔ اس کی حفاظت پر بھروسہ ہے۔ انشاء اللہ۔

**(۲) معاشرتی تعلقات** بڑے تعلقات میں تین باتیں قابل لحاظ ہوتی ہیں (۱) بڑے بزرگ ہوں تو نیاز مندی کے تعلقات ہوتے ہیں، جو مناسب ہیں۔ بشرطیکہ وہ مستحق ہوں۔ ورنہ نری نیاز مندی تکلیف دہ ہو جاتی ہے۔

(۲) اگر وہ مالی اعتبار سے بلند ہوں تو اپنی مختصر آمدنی میں اُن کا ساتھ دینا اور تعلقات نباہنا مشکل ہو جاتا ہے۔ مساوات کی اساس پر اُن سے ملنا مناسب ہے ورنہ تعلقات کا لطف نہیں۔

(۳) قرآن میں اقرباء کے ساتھ سلوک پر زور ہے۔ لیکن احسان نہ جتائیں۔ اخلاقی فرض سمجھ کر خدمت کریں۔ خوشامد، لجاجت مطلوب نہ ہو محبت وربط

اعلیٰ روحانی علوم ہیں۔ جو ان سے بدرجہا بہتر ہیں۔ پھر کمتری کیوں محسوس ہو۔ اگر ایک شخص پھٹے کپڑوں میں جھونپڑے میں رہتا ہو لیکن بنک میں اس کا کروڑ روپیہ ہو تو اس کا دل مطمئن رہتا ہے۔ وہ بڑی کوٹھی والوں سے متاثر نہیں ہوتا۔ تو پھر مومن محبتِ اللہ اور محبتِ رسول کے بعد جنتِ نعیم کے وعدوں پر کیوں مطمئن نہ ہو۔ حکم ہے لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ (الحجر ۱۵/۸۸) یعنی کافروں کی نعمتوں پر نظر نہ کرو۔ مومن کافروں تک کیلئے رحمت ہے۔ اس کی وجہ سے دنیا میں عذاب نہیں آتا۔ جب تک دنیا میں استغفار کرنے والا ایک مومن بھی موجود ہے، قیامت قائم نہ ہو گی۔
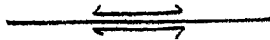
زندگی میں توازن تھا۔ اکثر مرشدین کے علم و عمل میں کوئی اصول دیکھنے میں نہیں آتا
اللہ کا شکر ہے کہ پیدا ہوتے ہی اللہ کے پیاروں میں آنکھیں کھولیں۔ میرے بچپن
میں قصبۂ خورجہ میں حکیم سید زین العابدین نامی ایک بزرگ رہتے تھے۔ سید صحیح النسب
سادات سے تھے کسی پر اس کا اظہار پسند نہ فرماتے۔ حکیم صاحب بہادر شاہ ظفر کے ساتھ
لال قلعہ میں رہتے تھے۔ غدر میں انگریزوں نے ان کے تمام افراد خاندان کو شہید کر دیا۔
صرف حکیم صاحب بچ گئے۔

حکیم صاحب کے ساتھ بیوی اور تین بیٹیاں خورجہ میں رہتی تھیں حسن میں
منتخب، نفاست و صفائی کا اہتمام لیکن ہمیشہ فقر و فاقہ رہتا۔ میں نے صبر، تسلیم،
رضا کے اعلیٰ مقام کا کوئی بندہ ان سے بہتر نہیں دیکھا۔ میرا چشم دید واقعہ ہے کہ حکیم
صاحب اور ان کا خاندان تین تین دن تک صرف نمک کی کنکریوں اور پانی پر بسر کر کے
روزے رکھا کرتے تھے۔ لطف یہ کہ کبھی زبان پر حرفِ شکایت نہیں، بلکہ الحمد للہ
رہتا۔ پھر صحت لاجواب تھی۔ اکثر ایک جوڑا کپڑا ہوتا۔ کرتہ پہن کر پاجامہ دھو لیتے اور
پاجامہ پہن کر کرتہ دھو لیتے۔ پھر صاف ستھرا لباس پہن کر باہر نکلتے۔ لوگوں کو ان کی
اس حالت کا گمان بھی نہ گزر سکتا تھا۔

حکیم صاحب مغرب کے فوراً بعد ہمارے گھر تشریف لاتے اور بارہ ایک بجے واپس
تشریف لے جاتے۔ اکثر قلعہ معلیٰ اور غدر کے چشم دید واقعات بیان فرماتے۔ حضرت
بختیار کاکیؒ، حضرت نظام الدین محبوب الٰہیؒ، اور حضرت چراغ دہلیؒ کے عرسوں اور
قوالیوں کے احوال بیان فرماتے۔ اور بیان کے وقت وجد و حال کی کیفیت
طاری ہو جاتی۔ پنجتن پاک کے ذکر سے بے تاب ہو جاتے۔ تھر تھرانے لگتے۔ رقت
کا یہ زور کہ جھڑی لگ جاتی۔

حضرت کے مقام کا اندازہ اس واقعہ سے ہوگا جو سر افسر الملک بہادر نے

ملتا بھی ہے۔

جماعتی سیاسیات بُری بلا ہے۔ اس میں ضمیر کو دبا کر رکھنا پڑتا ہے۔ ضمیر فروشی نی پڑتی ہے۔

**۴) تعلقات اور اخلاص** تعلقات کا معاملہ بہت نازک ہے۔ جمع تفریق کے بعد میزان، باقی پر عمل لگتا ہے۔ اسی میں ناق، اخلاص، رانگے سونے، کچے پکے کی پہچان ہوتی ہے۔ انجنوں میں فولاد چھوٹی سوئی یا پتیاں ہوتی ہیں جن پر خوب جھکے پڑتے ہیں۔ اگر وہ فولاد ہے جھوک کھا کر اور جھک کر پھر اپنی اصلی حالت پر آجائے گی۔ اور کچا لوہا ہے تو ٹ جائے گی۔ تعلقات میں سمندر کی اوپری عارضی طوفانی لوٹوں سے ناطہ رائے نہیں قائم کرنا چاہیے۔ بلکہ سمندر کی تھاہ میں سکون ہو اور موتی ہوں تو ظاہری لوٹوں کی وجہ سے سمندر سے تعلق نہ توڑنا چاہیے۔ اخلاص اور فہم صحیح نہ ہو تو توازن بگڑ جاتا ہے۔

ہماری دوستی، دشمنی کا معیار عام لوگوں سے جدا ہے۔ دوسروں کی سمجھ میں نہیں آسکتا۔ ہمارے ہم سایہ جی۔ ایم خاں صاحب انجینئر سے چھت کے معاملے میں ہماری خوب نزاع عدالت میں چل رہی تھی۔ اسی دوران میں ایک دن میں نے اُن سے کہا۔ چھت کی لڑائی کا ہمارے صحن سے تعلق نہ ہونا چاہیے۔ آپ فنی لحاظ سے ہمارے صحن کے ستونوں کے متعلق مشورہ دیں۔ چنانچہ انھوں نے نہایت اچھا مشورہ دیا۔ جنھوں نے دیکھا انگشت بہ دندان ہم دونوں کے اس عمل پر دنگ ہو گئے۔

**(۱۴) حکیم سید زین العابدین** میں نے اپنی زندگی میں بہت تھوڑے آدمی ایسے دیکھے جن کی زندگی اُصولی تھی۔ اور

اچھا عبور تھا ان کے بیان میں تکرار نہیں دیکھی گئی۔ کسی مسئلہ کو ہر مرتبہ نئے انداز میں پیش فرماتے۔ بڑے بڑے انگریزوں، جرمنوں سے اپنی قابلیت کا لوہا منوایا۔ سب اُن کے سامنے اپنے کو جاہل محسوس کرتے تھے۔ ایک بڑے یوروپین پروفیسر نے کہا اتنا ترس اور اعلیٰ معیار اور دماغ کا انسان میں نے یورپ میں بھی نہیں دیکھا۔ ایک مشہور انگریز لیڈی نے اسلام کی مخالفت میں ایک کتاب لکھی اور مولوی صاحب سے بحث کی۔ بڑی ناگن تھی۔ بچ بچ کر نکل جاتی۔ حضرت نے ایک مہینہ میں اس کی زہر کی پوٹلی نکال دی جس کے بعد اس نے اس کتاب کی طباعت کا خیال ترک کر دیا۔ مولوی عزیز مرزا صاحب کہتے تھے۔ میں مولانا شبلیؒ کے مقابلے میں سمجھتا ہوں کہ دس بیس فی صدی میں بھی لکھ بول سکتا ہوں لیکن خلیل احمد صاحب کے سامنے اپنے کو صفر محسوس کرتا ہوں۔

نواب سالار جنگ وزیر اعظم ریاست حیدرآباد دوران درس میں اُن کی کلاس میں پہنچے۔ ان کا درس سن کر ایسے متاثر ہوئے کہ اُن کی کرسی کے پایہ کے پاس ادب سے نیچے بیٹھ گئے۔ یہ عظمت تھی تقریرانِ اسلام کی۔ شاہزادہ آفتاب احمد صاحب علی گڑھ آئے تو دینیات میں طلبہ کا امتحان لینا چاہا۔ سب پریشان ہو گئے۔ حضرت نے فرمایا آنے دو۔ چنانچہ جب وہ آئے تو حضرت کی جماعت میں داخل ہوئے اور ایک طالب علم سے کہا ختم قرآن سناؤ۔ اتفاق سے وہ بہترین قاری تھا۔ اس نے اس خوبی سے پڑھا کہ امیر صاحب پر رقت طاری ہو گئی۔ آنسو نکل پڑے کہ رومال تر ہو گئے۔ اور کالج کے متعلق اچھی رائے قائم کی۔

ایک مرتبہ حضرت (برنی صاحب) نے مولانا سے عرض کیا حضرت آپ اعلیٰ دینی اعتبارات بیان فرماتے ہیں۔ مناسب ہوگا اگر مفادِ ملت کے لیے ان حقائق کو قلمبند فرمائیں۔ ایک دن فرمایا تمہارے کہنے پر میں لکھنے بیٹھا لیکن سیاہی خشک ہو گئی نک اور اعلیٰ اعتبارات آتے ہیں۔ اس لیے لکھ نہیں سکتا۔ کوئی چاہیے تو سن کر

تذکرہ سے بیان کیا جب مرحوم اعلیٰ حضرت میر محبوب علی خاں دلّی دربار گئے تو دلّی میں حضرت شاہ ابوالخیر گنج نشین سے ملنا
چاہا۔ حضرت نے انکار فرمایا۔ اس کے باوجود اعلیٰ حضرت آستانہ پر پہنچے۔ تو بھی انکار فرمایا۔ پوزیشن
نازک ہو گیا۔ بالآخر بمشکل اندر آنے دیا۔ اعلیٰحضرت نے دور کھڑے ہو کر سلام کیا اور
اشرفیوں کی کشتیاں نذر پیش کیں۔ حضرت نے فرمایا۔ ان کی مجھے ضرورت نہیں۔
غریبوں یتیموں میں تقسیم کر دو۔ اس کے بعد نصیحت کے لیے عرض کیا تو فرمایا تم کو رعایا کی فلاح
و بہبود پر توجہ کرنی چاہیے۔ لیکن تم ہمیشہ وظیفے پڑھنا چاہتے ہو۔ اگر اللہ کو وظیفے پڑھوانا
ہوتا تو تم کو بادشاہ کیوں بناتا۔ فقیر کے بجائے نہیں اور پیدا کرتا۔ اس نسبت کے شاہ ابوالخیر
کے پاس جب حکیم زین العابدین صاحب تشریف لے جاتے تو وہ ادب سے اٹھ کر کھڑے
ہو جاتے۔ اور کھڑے ہو کر اپنے ہاتھ سے وضو کراتے۔ اور اپنا بستر ان کے آرام کے
لیے دیتے۔ اور خود نیچے سو جاتے۔

جب حکیم صاحب کا انتقال ہونے لگا تو میں علی گڑھ میں ایف۔ اے سال دوم
میں پڑھتا تھا۔ فرمایا۔ میں دنیا سے مطمئن جا رہا ہوں۔ البتہ الیاس برنی صاحب کا
مجھ سے دوری کو محسوس کرتا ہوں۔ ان کو میرا سلام کہو۔ اور کہنا کہ مجھے دعاؤں میں یاد
رکھیں۔ اور ان کو بتا دینا۔ اپنی دعاؤں میں یاد رکھوں گا۔ چنانچہ میں [illegible]
دونوں کی ملاقات عالم بالا میں ہو چکی ہے۔

## (۵) مولانا خلیل احمد پروفیسر علی گڑھ

اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہمیں ہمیشہ بڑے بڑے اولیاء اللہ کی رفاقت نصیب رہی

علی گڑھ میں مولانا خلیل احمد اور حضرت عبداللہ شاہ کی خاص عنایتیں تھیں۔ ہفتہ
میں کم از کم دو تین ملاقاتیں لازم تھیں۔ مولانا خلیل احمد علم و عرفان میں اپنا جواب نہیں
رکھتے تھے۔ سادگی کے ساتھ رعب تھا۔ بڑے فلسفی، قیافہ شناس، نفسیات داں،
امراض ظاہر و باطن کے ماہر تھے۔ عربی، فارسی، اردو میں تبحر حاصل تھا۔ انگریزی پر

تیرا باپ دھوبی ہے۔ تو قسمت سے کلکٹر بن گیا تو دماغ خراب ہو گیا۔ ہم برٹش گورنمنٹ کی تباہی چاہیں گے تو کیا وہ ٹھہر سکتی ہے۔ وہ کانپ گیا اور معافی کے لیے حاضر ہونا چاہا۔ لیکن آپ نے آنے کی اجازت نہیں دی۔

جنات سے قوی رابطہ تھا۔ جنات تو گویا آپ کے گھر کی بلیاں تھے جب کہو بلا دیتے۔ جن، بھوت، جادو کے مایوس العلاج مریض بفضلہٖ حضرت کے حکم یا تعویذ سے فوراً صحت یاب ہوتے میں نے دیکھے۔ حضرت ہم پر بے انتہا مہربان تھے۔ ایک شب قدر میں فرمایا۔ میں تم کو اسم اعظم اور کن دینا چاہتا ہوں کہ جبرئیل، میکائیل، اسرافیل اور عزرائیل، تمہارے موکل بن جائیں گے ہر حکم کی تعمیل کریں گے۔ تمہیں ملائکہ اور جنات کی تسخیر حاصل ہوگی۔ تمہاری پیشانی میں غیر معمولی نور ہے۔ میں تمہیں کشف کونی دینا چاہتا ہوں کہ سارا عالم کھل جائے گا۔ کمالات حاصل ہوں گے۔ یہ صفت تم میں مضمر ہے۔ خاص خاص شغل مقیدہ بہ سہولت طے کرانا چاہتا ہوں۔ میں نے عرض کیا۔ آپ ان کمالات کو حکم کے تحت دینا چاہتے ہیں یا اجازت کے تحت۔ فرمایا۔ اجازت کے تحت۔ میں نے کہا۔ قادری تعلیم کی رو سے حکم کے بغیر میں لینا نہیں چاہتا۔ بے کمالی تحقیق ہو جائے تو انسان کا سب سے بڑا کمال ہے۔ اس پر گلے لگا لیا اور فرمایا۔ تمہاری استعداد و طلب بہت بلند ہے، البتہ میں نے محبت کا حق ادا کرنا چاہا تھا۔

ہزار کمالات ہوں، عبدیت ہی اصلی اور انتہائی مقام ہے، علیٰ قدر مراتب اور سیر جو کچھ عطا ہوتا ہے اس میں نقصان کا خوف نہیں۔ حفاظت یقینی ہے۔ کسب کئے ہوئے کمالات میں وہ بات کہاں۔ کرامت اور تصرف میں یہی فرق ہے لیکن بعض بزرگ کسب کمال کے راستے سے بھی عبدیت تک پہنچتے ہیں۔ ایسا ایسا

نوٹ کر لے۔ سورۂ فاتحہ کی تفسیر بیرسٹر آفتاب احمد خان کو چھ ماہ پڑھائی اور تلمیذ کرائی اور فرمایا۔ تمھاری موٹی قانونی عقل کے لیے اتنا کافی ہے۔ ورنہ اس کے حقائق کی حد نہیں قادری تعلیم میں زندگی امر کے تحت رہتی ہے۔

(۶) حضرت عبداللہ شاہ - علی گڑھ لیے ارادتی کے مقام پر رہنے کی وجہ سے

من اللہ انتظامات ہوا کرتے ہیں۔ اپنی ارادت سے یا اجازت سے جو کام ہو اس کی ذمہ داری ہم پر رہتی ہے۔

علی گڑھ میں حضرت عبداللہ شاہ صاحب بڑے پایہ کے بزرگ تھے۔ حضرت اسکاٹ لینڈ کے ایک بڑے خاندان کے فرد تھے۔ لارڈ ہیگ پہلی جنگ عظیم کا کمانڈر حضرت کا عزیز تھا۔ ان کے والد ۱۸۶۵ء میں ہندوستان کے پوسٹ ماسٹر جنرل تھے۔ جرمنی سے آپ نے طب کی ڈگری لی۔ اچانک دل میں کیا آئی کہ بغداد شریف حاضر ہوئے اور اسلام قبول فرمایا۔ اس کے بعد ہندوستان آئے۔ گلاب سا چہرہ چوڑا چکلا سینہ۔ مردانہ حسن کا بہترین نمونہ تھے۔ مزاج میں بے حد نفاست تھی کمرہ میں ہر وقت عطر، گلاب، پھول مہکتے تھے۔ خوش مزاج تھے۔ بچے بہت مانوس تھے۔ عمر بھر تجرید میں بسر کی۔ تکلف، تمتع، ترفع، شہرت طلبی، جاہ طلبی نام کو نہ تھی۔ نسبت غوثیہ کے فرد تھے۔ توجہ زبردست تھی۔ سلوک سے فراغت ہو چکی تھی۔ صاحب خدمت تھے۔ باطنی حکومت کا مظہر تھے۔ آپ کا کشف کونی نہایت صاف اور قوی تھا۔ آن کے آن میں بتا دیتے کہ عالم میں کیا ہو رہا ہے۔ ریڈیو سینما کا سا تماشا معلوم ہوتا تھا۔ پہلی جنگ عظیم کے زمانے میں بہت دنوں بعد ہونے والے واقعات پہلے ہی بیان فرمایا کرتے تھے۔ ایک دن کلکٹر ضلع نے کہلایا۔ آپ سیاسی معاملات میں دخل نہ دیں ورنہ اچھا نہ ہوگا۔ جلال میں آ گئے اور جواب میں کہلایا۔ تیری ماں اس وقت لندن کی فلاں گلی میں ترکاری بیچ رہی ہے۔ اور

## (۸۶) نواب عماد الملک مرحوم

حضور کے ایک دوسرے ذی اثر استاذ نواب عماد الملک معتمد تھے۔ ان سے بھی بے حد محبت اور ربط ضبط رہا۔

اعلیٰ سطح کی اہم مراسلت میں نواب صاحب میری رائے اور ڈرافٹ کے بغیر کوئی کام نہ کرتے جس پر بڑے بڑوں کو رشک تھا۔ میں عبدالمجید صاحب مددگار ہوم سکریٹری کے مکان پر ان کی خواہش و اصرار پر رہتا تھا۔ حیدری صاحب (جو بعد کو سر اکبر حیدر نواز جنگ وزیر اعظم بنے) نے نواب مسعود جنگ کے ذریعے مجھے کہلایا کہ میں ان کے مکان پر نہ رہوں۔ اور نواب عماد الملک اور گلانسی وزیر فینانس سے نہ ملا کروں۔ وہ میرے معاملات خود طے کر دیں گے میں نے پروا نہ کی تو میری برطرفی کا نوٹ لکھا۔ اس پر نواب محمد لوحنگ نے عماد الملک سے کہا۔ آپ کی محبت کی وجہ سے حیدری صاحب برقی صاحب پر ستم ڈھا رہے ہیں۔ نواب صاحب نے مجھ سے فرمایا۔ اب تک آپ نے مجھ سے اس کا ذکر کیوں نہیں کیا۔ میری محبت کی قدر نہ کی۔ میں نے کہا۔ مجھے آپ کی محبت کی قدر ہے اور اسی محبت نے مجھے کہنے سے روکا۔ جس دن میں سمجھوں حیدری صاحب قوی ہیں یا اُس وقت کہوں گا۔ اس کے بعد میں نے کہا کیا دوستی محبت کا یہی ایک مقصد رہ گیا ہے کہ میں آپ سے اپنے مسائل حل کرنے کے لیے ملتا ہوں۔ کیا شرافت اور وضع داری دنیا سے غائب ہو گئی۔ اگر ایسا ہے تو میں آئندہ سے نہیں ملوں گا۔ اس پر شرمندہ ہوئے اور فرمایا۔ اب میں مطمئن ہو گیا لیکن عمر بھر میں اس قسم کی یہ پہلی مثال ہے۔

نواب صاحب میں بلا کا استغنا تھا۔ استقرار تھا۔ امیری کے ساتھ فقیری تھی۔ تو آپ میں ولایت کر گئے۔ ان کی انگریز لیڈی حضرت غوث اعظمؓ کی مرید تھی۔ اخیر زمانے میں نواب صاحب پر کشف و احوال بہت غالب تھے۔

سلوک ہے۔

(۷) فضیلت جنگ حضرت انوار اللہ شاہ صاحب: اللہ شکر خورے کو شکر کھلاتا ہے۔ جو رمیہ اور علی گڑھ کے اولیاء اللہ کی صحبتوں سے نکلے تو یہاں حیدر آباد میں حضرت کمال اللہ شاہ، حضرت مولانا محمد حسین، مولانا عبد القدیر حسرت، مولوی صفی الدین صاحب مدراسی، ناظم دار الترجمہ اور فضیلت جنگ انوار اللہ شاہ صدر المہام امور مذہبی سے خوب ملاقاتیں رہیں۔ مولوی صفی الدین صاحب کہتے۔ میں نے حرمین شریفین کے اسرار آپ کے سوائے کسی پر ظاہر نہیں کئے۔ حتیٰ کہ میری اولاد بھی اس میں شریک نہیں۔

مولانا انوار اللہ شاہ صاحب اعلیٰحضرت حضور نظام نواب میر عثمان علی خان کے اُستادِ خاص تھے۔ بڑے ذی اثر، بارعب اور حکومت میں بے حد دخیل۔ عجب شخصیت کہ اس کے رسوخ سے حکومت کا پلڑا جھک جائے، اکابر ملت کی شان نظر آئے۔ تبحّر علمی کا یہ عالم کہ تقریباً سو تصانیف چھوڑیں۔ میں نے ایک جرمن عالم کو ان کی چند کتابیں بھیجیں تو اس نے تین یونیورسٹیوں کو دیں۔ اور مجھے لکھا کہ ہندوستان میں صحیح معنی میں مجھے یہی عالم معلوم ہوتے ہیں۔ میں ان سے ملنے حیدر آباد آنا چاہتا ہوں۔ لیکن وہ جنگِ عظیم میں گرفتار ہو گیا۔ حضرت ہم پر بہت مہربان تھے۔ کبھی کبھی ہمارے ساتھ ایسی خصوصیت ظہور میں آتی کہ حضرت کے اچھے اچھے مقربین حیران رہ جاتے۔ میرے حیدر آباد آنے کے بعد حضرت کا بہت جلد وصال ہو گیا۔ ورنہ وہ جامعہ نظامیہ اور محکمۂ امور مذہبی کے امور مجھے سپرد کرنے کے لیے فرمان حاصل کرنا چاہتے تھے۔ گلانسی وزیر فینانس حضرت کے اثر کو بہت مانتا تھا۔ اور نازک مشکل موقعوں پر مجھے حضرت کو سمجھانے کے لیے بھیجا تھا۔

کام بنانے کی حکمتیں اور تدبیر بازیاں بُری چیزیں ہیں۔ شروع میں کام چلتا ہے۔ بعد کو
بے وقعتی اور ذلت ہوتی ہے۔ خود غرضی ظاہر ہوتی ہے جو وضعداری کے خلاف
ہے۔ ایسے مطالبوں پر اُنھیں کراہت ہوتی ہے۔ اور کراہت میں خیر و برکت نہیں۔
اس لیے غیروں سے معاملہ کرنا دوستوں سے معاملہ کرنے سے بہتر ہوتا ہے۔ بعض
وقت دوست مدد کرنا چاہیے بھی تو اُسے روکنا پڑتا ہے تاکہ دوستی کا مقصد
اپنی ذاتی اغراض کی تکمیل نہ سمجھا جائے۔ چنانچہ یہی صورت نواب عماد الملک
اور نواب مہدی یار جنگ وزیر تعلیمات سے تعلقات دوستی میں مجھے پیش آئی
میں نے صاف طور پر اُنھیں کہہ رکھا تھا کہ حق ہو یا ناحق۔ میری ترقی وغیرہ
کے معاملے میں آپ ایک حرف نہ کہیں۔ لوگ حق ناحق تو دیکھتے نہیں۔ اُن کی
نظر صرف نتیجہ پر رہتی ہے۔ انھوں نے اس کا لحاظ رکھا۔ لیکن احباب ہم سے
کہتے رہے۔ آپ سے ذاتی تعلقات میں یہ ظاہرداری برتتے ہیں۔

**(۱۰) اعلیٰحضرت حضور نظام** | دُنیا کی بڑی بڑی مملکتوں کے صدور، وارباب حکومت اور مشاہیرِ عالم سے حضرت کا ربط بذریعہ
مراسلت رہا لیکن شروع سے آخر تک حضرت کا ربط اعلیٰحضرت حضور نظام نواب
میر عثمان علی خان آصف سابع کے ساتھ بہت خاص رہا۔ بہت محبت رکھتے
اور بہت دُعائیں دیتے۔ اعلیٰ سطح پر باہمی مراسلت قابلِ دید ہے۔ خاص کر
خاص موقعوں پر مخلصانہ مشوروں سے دریغ نہ فرماتے۔ اور قرآنی آیات کے
ذریعے رہنمائی و تسکین کے اسباب مہیا فرماتے۔ انقلاب حیدرآباد کے بعد
حضور نظام کے اچھے اچھے رفقا نے ملنا چھوڑ دیا تھا۔ لیکن حضرت نے اخیر
وقت تک اپنے مراسم اخلاص اور ربط کو جاری رکھا اور وضع داری برقرار
رکھی۔ حضور نظام کے برادر نواب بسالت جاہ بہادر بھی حضرت کا بہت احترام فرماتے۔

حضورِ انور صلعم اور حضرت علیؓ سے اس عالمِ شہادت میں شرفِ ملاقات حاصل ہوا جسم بعض وقت نور میں تبدیل ہوجاتا تو حیرت کرتے۔ مجھ سے ذکر کرتے تھے میں نے حضرت غوث اعظمؓ اور حضرت مجددؒ کے مقالات پڑھ کر ان کے کشفی واقعات کی تصدیق کی تو تعجب کیا اور فرمایا۔ ہم تو جاہل دُنیا دار ہیں لیکن یہ سرفرازی ہے۔

نواب صاحب پکے سُنّی تھے۔ خلفائے راشدین کی خلافت کے قائل تھے۔ حضرت فاروقِ اعظمؓ سے بے حد عشق تھا۔ ایک دن فرمایا۔ ہمارے شجرۂ نسب میں عمر نام کے بزرگ موجود ہیں۔ اُمّ المومنین حضرت عائشہؓ سے خاص عقیدت تھی۔ یہ شیعوں کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے تھے۔ پروفیسر حسین علی خان صاحب کی شادی معصومہ بیگم صاحبہ (سابق وزیرِ آندھرا) سے ہوئی۔ مجتہد صاحب نے نکاح پڑھایا۔ ختم پر میں نے مبارکباد دی۔ فرمایا۔ ذرا ٹھیریئے۔ ابھی نکاح ہُوا کہاں۔ ابھی تو مجتہد صاحب نے صیغہ پڑھا ہے۔ اب قاضی صاحب نکاح پڑھائیں گے۔ چنانچہ سُنّی قاضی صاحب نے نکاح پڑھایا۔ اس کے بعد قاضی صاحب کی دعا میں جب "کَمَا اَلَّفتَ بَینَ حضرت محمد مصطفےٰ صلعم و حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا" آیا تو زور سے 'آمین' فرمایا۔

ایک دفعہ انھوں نے خواب میں حضورِ انور صلعم کو نماز پڑھتے دیکھا۔ حضورؐ نے ختمِ نماز پر سب صحابہؓ سے فرمایا۔ یہ میرا بچہ ہے۔ اس کے بعد سے نواب صاحب اپنے نام کے ساتھ سید لکھنے لگے تھا۔ اگرچہ پہلے بھی شجرہ محفوظ تھا۔ اسی طرح ہمارے والد صاحب بھی شجرہ محفوظ ہونے کے باوجود اپنے نام کے ساتھ فاروقی نہ لکھتے تھے۔ ایک دفعہ حضرت فاروقِ اعظمؓ کو خواب میں دیکھا کہ آپ نے ہمارے فاروقی ہونے کی توثیق فرمائی۔ اس کے بعد فاروقی لکھنے لگے۔

**(۹) دوستی کے لوازم** دوستی، محبت میں کسی کے پیچھے پڑنا اور اپنے

تعطیلات میں نواب مکرم جاہ بہادر حیدرآباد واپس تشریف لائے تو ایک سعادت مند شاگرد کی طرح ملاقات کے لیے اُستادِ محترم کی خدمت میں بیت السلام حاضر ہوئے اور فرمایا۔ ہم ہر سال تعطیلات میں حیدرآباد آیا کریں گے۔ اس زمانے میں ہماری تعلیم و تربیت کے لیے آپ براہِ کرم ہلاوسٹہ تشریف لایا کریں۔ یا ہمیں اجازت دیں کہ آپ پاس روزانہ حاضر ہوا کریں۔ حضرت نے شہزادے کی فرمایش قبول فرمائی۔ اور روزانہ ایک گھنٹہ کے لیے ہلاوسٹہ جانا طے فرمایا یہ سلسلۂ تربیت اخیر تک جاری رہا۔

(۱۲) مسٹر غلام محمد گورنر جنرل پاکستان | مسٹر غلام محمد مرحوم حضرت کے شاگرد تھے جب بحیثیت وزیر فینانس حیدرآباد آئے تو گھر پر حاضری دی صنعتی نمایش حیدرآباد کا ایک پلیٹ جلسہ حضرت کے زیر صدارت منعقد ہوا جس میں تقریر کرتے ہوئے مسٹر غلام محمد نے ایک شاگرد رشید کی طرح خراجِ عقیدت پیش کیا اور فرمایا۔ میں نے جو کچھ علم معاشیات حاصل کیا ہے ان ہی قدموں پر حاصل کیا ہے۔

(۱۳) مہاراجہ سرکشن پرشاد وزیر اعظم | فرمایا۔ ایک دن مہاراجہ سرکشن پرشاد وزیر اعظم کے پاس شادی کی تقریب میں جانا ہوا۔ میں نواب مہدی یار جنگ کے ساتھ گیا اور اُن سے گیٹ پر ہی کہہ دیا کہ میں اپنے درجہ کے عہدہ داروں میں بیٹھوں گا۔ چنانچہ میں چھوٹے عہدہ داروں میں بیٹھ گیا۔ مہاراجہ نے ایک نواب صاحب کو مجھے بلانے کے لیے بھیجا۔ میں نے انکار کیا اور کہلایا کہ یہی میرا مقام ہے۔ لیکن اصرار ہوا تو میں گیا۔ مہاراجہ نے ہٹ کر دولہا کے پاس مجھے مسند پر بٹھایا اور فرمایا۔ ایسے موقع پر آپ کے مبارک قدم کا مقام یہ ہے۔ مہدی یار جنگ بہادر نے کہا۔

ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ عید کی نذر پیش کرنے کے لیے حضرت کنگ کوٹھی تشریف لے گئے۔ حضور نے حسبِ معمول فوراً بلوایا۔ اُس وقت مشہور شاعر عبد اللہ خان صاحب کامل سے حضور ہم کلام تھے۔ حضرت نے نذر پیش کی اور اجازت لے کر فوراً واپس ہوئے۔ اس کے دو گھنٹے بعد کامل صاحب سیدھے حضرت کے دولت خانہ آئے۔ اور رُوداد سُنائی کہ ہم حضور کی قصیدہ خوانی کر رہے تھے لیکن آپ کے جاتے ہی تقریباً دو گھنٹے تک حضور آپ کی قصیدہ خوانی کرتے رہے۔ آپ کے متعلق حضور بہت اعلیٰ خیالات رکھتے ہیں۔ آپ کی ملاقات کو بہت غنیمت سمجھتے ہیں۔

(۱۱) پرنس مکرم جاہ بہادر کی اتالیقی | جب حضور نظام کے ولی عہد پرنس آف برار کے صاحبزادگان پرنس مکرم جاہ بہادر اور پرنس مفخم جاہ بہادر کی مذہبی اور اخلاقی تعلیم و تربیت کا سوال پیدا ہوا تو حضور نظام اور ولی عہد بہادر اور شہزادی دُرِ شہوار کی نظرِ انتخاب نے حضرت ہی کو منتخب فرمایا۔ اور حضرت نے ملت کی امانت جان کر شہزادوں کی اتالیقی کی خدمت قبول فرمائی۔ چنانچہ ۱۳۶۵ھ میں شہزادوں کا اتالیق مقرر کیا گیا۔ پرنس آف برار بہت احترام فرماتے، اور فرمایا کرتے کہ مجھے امید ہے آپ کی تربیت سے یہ بچے علوم ظاہری و باطنی سے آراستہ ہو جائیں گے۔

حضرت کو بچوں کی تعلیمی نفسیات کا خاص ذوق تھا۔ نفسیاتِ اطفال پر بہت باریک نظر تھی۔ بڑے بڑے ماہرینِ تعلیم آپ کے تعلیمی خیالات و نظریات میں اُپج اور ندرت دیکھ کر متاثر ہوتے حیرت کرتے۔ شہزادوں کی اتالیقی کے سلسلے میں اس ذوق کے اظہار کا بہت اچھا موقع ملا۔ کچھ عرصہ بعد علیا حضرت شہزادی دُرِ شہوار شہزادوں کو اعلیٰ تعلیم و تربیت کے لیے انگلستان لے گئیں۔

ربط ہو تو کیا ہوگا۔ لیکن اس کے باوجود تم لوگ اولیاء اللہ کی نسبتوں کا انکار کرتے ہو۔

**(۱۴) نواب سر افسر الملک** نواب سر افسر الملک کو حضرت سے غیر معمولی محبت بلکہ عقیدت تھی۔ حضرت کبھی تشریف لے جاتے اور کارڈ بھیجتے، تو وہ زنانے میں بھی ہوتے تو کارڈ ہاتھ میں لیے ہوئے باہر آتے اور ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر اندر لے جاتے، اور ایسی خاطر مدارات کرتے کہ سب کو تعجب ہوتا۔ ایک دفعہ حضرت اُن کے پاس تشریف رکھتے تھے کہ سر ٹرینچ وزیر مال ملنے کے لیے آئے۔ حضرت کی وجہ سے عذر کہلا دیا اور فرمانے لگے۔ آپ کی ملاقات میں میری خود غرضی مُضمر ہے۔ سب آتے ہیں تو قصّے کہانیاں لاتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں مصیبت آگئی۔ لیکن آپ آتے ہیں تو میرے دل کو تسکین حاصل ہوتی ہے اور مجھے فائدہ پہنچتا ہے۔

**(۱۵) مسٹر میکنزی** ۱۹۳۵ء میں ایک ذی اثر انگریز مسٹر میکنزی عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد کے پرو وائس چانسلر ہو کر آئے۔ وائسرائے ہند سے اِن کے شخصی تعلقات تھے۔ ان کی آمد کی خبر گرم ہوئی تو یونیورسٹی کے بہت سے پروفیسروں نے جو شیروانیاں پہنتے تھے، پُرتکلف سُوٹ سلوائے۔ بعض نے حضرت سے بھی سوٹ سلوانے کو کہا۔ حضرت نے فرمایا۔ کیا وہ لباس بدلوانے، انگریز بنانے کے لیے آرہا ہے۔ ہم کو اپنے طرز پر رہنا چاہیئے۔ شکست خوردہ ذہنیت مناسب نہیں۔ مسٹر میکنزی کی آمد کے بعد ایک موقع پر سر اکبر حیدری وزیر فینانس (جو بعد کو وزیر اعظم بنے) نے ان کے اعزاز میں ڈنر دیا۔ حضرت بھی مدعو تھے۔ سفید شیروانی میں تشریف لے گئے اور سر اکبر سے دُور بیٹھے۔ سر اکبر نے پاس بیٹھنے کے لیے بلوایا۔ لیکن حضرت نے انکار فرما دیا کہ میں یہیں ٹھیک ہوں۔

اگر میرے ساتھ رہتے تو وزیروں میں بیٹھتے۔ لیکن صدر کی جگہ دولھا کے پاس کہاں ملتی۔ اور بھری مجلس میں ایسا اعزاز کہاں پاتا۔ میں نے کہا۔ عزت طلبی مناسب نہیں۔ اللہ اپنے فضل سے جو عزت دے بہت ہے۔
ایک دن مہاراجہ کے پاس ایک بڑا ایٹ ہوم تھا۔ مہاراجہ خاص تمکنت سے بیٹھے تھے۔ سر ترنج وزیر مال اور سر نظامت جنگ وزیر سیاسیات نے بھی آکر سلام کیا تو اشارہ سے اس کا جواب دیا۔ میں صدر شعبۂ دینیات حضرت مولوی عبدالقدیر صاحب حسرت اور پروفیسر مناظر احسن صاحب گیلانی کے ساتھ پہنچا۔ اور ان سے کہہ دیا۔ آپ لوگ جہاں چاہیں بیٹھیں۔ مجھ دیوانے کے ساتھ شاید نقصان رہے۔ لیکن دونوں نے میرے ساتھ رہنا گوارا کیا۔ مہاراجہ کا غیر معمولی انداز تمکنت دیکھ کر دل میں خطرہ آیا کہ مہاراجہ کے پاس ہی جو خالی جگہ ہے، وہاں کرسیاں لے جا کر بیٹھ جاؤ۔ چنانچہ نشستوں کے انتظام کے خلاف خود کرسیاں اٹھا کر لائے اور بیٹھ گئے۔ پھر لطف یہ کہ مہاراجہ کو دعا نہ سلام تھوڑی دیر بعد مہاراجہ اٹھ کر اپنی کرسی ہاتھ میں لیے ہوئے میرے پاس آکر بیٹھ گئے اور فرمایا۔ یوں بھی آپ ملتے نہیں۔ آتے بھی ہیں تو بغیر ملے جاتے ہیں۔ پھر دعا نہ سلام۔ میں نے کہا۔ مل تو رہے ہیں جیسا ملنا چاہیئے۔ اس کے بعد خوب باتیں چلیں۔ خوب کھانے آئے۔ اس دوران میں مہاراجہ کے معتمد نے دو دفعہ آکر کہا۔ سر سالار جنگ اور سر ترنج وغیرہ مل کر جانا چاہتے ہیں۔ پھر بھی ٹھیرے رہے اور انھیں ٹھیرائے رکھا۔ میرے کہنے پر رخصت ہوئے۔ بہتوں کی نظریں ہماری طرف اٹھیں۔ بعضوں نے مکان کا پتہ پوچھنا شروع کیا۔ میں نے کہا۔ اس باطل اور مجازی ربوبیت کا اثر یہ ہے کہ مہاراجہ کی توجہ پا کر سب ہم کو معظم سمجھنے لگے۔ اگر رب حقیقی سے

اور کالج سے محبت پیدا ہوتی ہے۔ اور وہ اُن پر فخر کرتے ہیں اور اُن کے مشوروں کو اہمیت دیتے ہیں۔

طلبہ اور عوام کے بارے میں دُنیا کی تمام مہذب حکومتوں نے فرق کیا ہے۔ خاص لحاظ کیا ہے۔ کوئی ماں اپنے بچے کو دوسرے سے پٹنے کی اجازت نہیں دے سکتی۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے طلبہ کی ہڑتال کے موقع پر مسٹر میکنزی پرو وائس چانسلر نے میرے خیالات معلوم کئے تو اپنی رائے بدل دی اور طلبہ کا ساتھ دیا اور مجھ سے کہا۔ آپ کا نقطۂ نظر اور خیالات ایٹن کالج والوں کے سے ہیں۔

---

اس کے بعد سر اکبر نے اُٹھ کر مسٹر میکنزی سے حضرت کا یوں تعارف کرایا۔ یہ حیدر آباد کی بہت بڑی شخصیت ہیں۔ ان کا عوام و خواص پر بہت اثر ہے۔ حضور نظام بھی ان کو بہت قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

ایک دفعہ جب مسٹر میکنزی رخصت سے انگلستان سے واپس ہوئے تو بہت سے عہدہ دار اسٹیشن پر استقبال کے لیے آئے۔ اس موقع پر مسٹر میکنزی نے حضرت کے متعلق مسٹر ہالنس ڈائرکٹر جنرل پولیس سے پوچھا آپ انھیں جانتے ہیں۔ مسٹر ہالنس نے کہا۔ ہاں میں جانتا ہوں۔ یہ مسٹر برنی ہیں۔ مسٹر میکنزی نے کہا۔ تو آپ انھیں نہیں جانتے۔ یہ تو عثمانیہ یونیورسٹی کا وہ ستون ہیں جس پر میں سہارا لیتا ہوں۔ بعد میں حضرت نے مسٹر میکنزی سے فرمایا کہ دوسرے عہدہ داروں سے میرا ایسے الفاظ میں تعارف مناسب نہیں۔ مسٹر میکنزی نے جواب دیا۔ میں اپنے جذبۂ محبت کو روک نہیں سکتا۔ میں اپنے آپ کو آپ کے ہاتھ میں ایسا محسوس کرتا ہوں جیسے دایہ کے ہاتھ میں بچہ۔

**(۱۶) طلبہ اور پولیس** فرمایا۔ طلبہ کو کبھی پولیس کے سپرد نہیں کرنا چاہیے۔ یہ علی گڑھ کا کلچر ہے اس نکتہ کو وہی سمجھ سکتا ہے جس نے عمدہ کلچر حاصل کیا ہو اور اچھا طالب علم رہا ہو۔ ایک دفعہ علی گڑھ کے کچھ طلبہ بلا ٹکٹ فرسٹ کلاس، سکنڈ کلاس میں بیٹھ گئے۔ علی گڑھ کا ایک انگریز پروفیسر بھی اسی ٹرین سے سفر کر رہا تھا۔ ریلوے گارڈ نے طلبہ کو اتارنا چاہا تو پروفیسر نے کہا۔ یہ علی گڑھ کے طلبا ہیں۔ تم نہیں اتار سکتے تم کرایہ کے لیے کالج کو لکھو۔ بچوں سے تم باز پرس نہیں کرسکتے۔ ہم جو باز پرس مناسب سمجھیں گے کریں گے۔ پرنسپل اور پروفیسروں کو طلبہ کے وقار کی حفاظت کا پاس ہو تو طلبہ کے دلوں میں بھی پرنسپل اور پروفیسروں

ہاتھی اپنے شر کی وسعت و اہمیت کا نام ہے۔ شر کا ظہور ہر آن ممکن۔ نہ معلوم ایک لمحہ میں کیا ہو جائے۔ لیکن بچے دعا گو کے با وجود اللہ حفاظت فرماتا ہے۔

(۲) دیدارِ الٰہی | میرے ایک دوست سے فرمایا۔ میں نے اللہ تعالیٰ کو خواب میں دیکھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ تم میں کیا کمال ہے۔ میں نے عرض کیا۔ مفت کا کھاتا ہوں۔ نکما رہتا ہوں۔ فرمایا۔ یہی تو کمال ہے۔ (مطلب یہ کہ فضل پر زندگی ہے۔ عمل کا دعویٰ نہیں)

(۳) نبی کریم صلعم کی مزاج پرسی | فرمایا۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کسی کو شہادت میں نظر آتے ہیں۔ کسی کو خوابِ مثال میں نظر آتے ہیں۔ کسی کو نظر ہی نہیں آتے، لیکن خود حضورؐ کی ان پر نظر رہتی ہے۔

مدینۂ طیبہ سے آج ۹ محرم ۱۳۸۷ھ ہمارے دوست سید محمد بادشاہ حسینی صاحب واعظ مکہ مسجد کا خط وصول ہوا۔ لکھا ہے۔ عالمِ شہادت میں، مواجہ شریف میں حضورِ انورؐ کا دیدار مجھے نصیب ہوا۔ حضورؐ نے دریافت فرمایا۔ کَیْفَ حَالُ الْبَرفِی (برفی کا کیا حال ہے) جواب میں عرض کیا۔ بِالْخَیْرِ وَالْعَافِیَۃِ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ (خیر و عافیت سے ہیں یا رسول اللہؐ) انھوں نے لکھا ہے۔ یہ سرفرازی آپ کے طفیل میں نصیب ہوئی۔ الحمد للہ۔ اس سے بادشامیاں کے ہمارے ساتھ ربط و نسبت کی توثیق ہوئی۔ اُن کو ہم سے محبت ہے۔ حاضر تو حاضر ہی ہے۔ لیکن غائب کو یاد کرنا بڑی نعمت ہے۔ بڑی سرفرازی ہے کہ حضورؐ نے اپنے غلام کو یاد فرمایا۔ حضورؐ تو بہر حال ہمارے حال سے واقف ہیں۔ لیکن یہاں مقصود غلام نوازی کا اظہار ہے۔

(حضرت بادشاہ حسینی صاحب نے اس سرفرازی کا اظہار اس ناچیز سے بھی فرمایا۔ للمؤلف حلیم)

# فصلِ دہم

# حضرت کی خصوصیات

**(۱) حضرت کے احوال**

حضرت کی طبیعت میں بہت استتار تھا۔ ذاتی احوال بہت کم بیان میں آتے تھے، اِلّا یہ کہ تعلیم مقصود ہو۔ عام طور پر اشارے کنایہ سے بڑھ کر حتی الامکان احوال کو زیادہ کھول کر نہیں بیان فرماتے تھے تاہم کبھی کبھی جو احوال بیان میں آئے اس سے اندازہ ہوا کہ حضرت کے ظاہری، باطنی خاص احوال بعض اکابر سے ملتے معلوم ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود حضرت کا حال یہ کہ الحمد للہ کہہ کر گزر جاتے۔ معلوم ہوتا کہ محض بے نفسی اور مقامِ اخلاص میں حضرت کا قیام ہے۔ عقل، تدبیر، تفاخر کے شائبہ کا اظہار نہ ہوتا۔

ایک دفعہ فرمایا۔ مجھے اپنی زندگی میں ایسے کئی واقعات پیش آئے ہیں کہ گویا اونٹ کو سوئی کے ناکہ سے گزرتے دیکھا ہے۔ اور ہاتھیوں کو کچے دھاگے میں بندھے تڑپتے دیکھا ہے۔ مجھے بجلیوں پر چلنا پڑا ہے۔ اور کسی کو کانوں کان خبر نہیں۔ دریافت فرمایا۔ کیا تم آٹھ روز سے مجھ میں کوئی فرق محسوس کر رہے ہو۔ میں نے عرض کیا۔ نہیں۔ فرمایا۔ آٹھ روز سے میرے سر پر ایک پہاڑ (مصیبت کا تمثّل) لٹک رہا تھا۔ سر سے چھو رہا تھا۔ ہر وقت ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ مجھے اب دبا دے گا۔ الحمد للہ ٹل مصیبت ٹل گئی اور پہاڑ ہٹا لیا گیا۔ لیکن کسی کو پتہ نہیں کیونکہ حسبِ معمول کام کر رہا تھا، ہنس بول رہا تھا۔

کچا دھاگا اپنا اعتبارِ عبدیت ہے جس میں کوئی قوت و اہتمام نہیں۔ اور

**(۴) بارگاہِ نبوی میں واسطہ** مغرب کے مشہور عالم و مشائخ حضرت عبدالحی کتانی نے مدینۂ منورہ میں خصوصیت سے فرمایا ہم جب کبھی کسی معاملے میں حضور انور صلعم کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ ہی اس وقت رسول اللہ کے دربار میں سب کے لیے واسطہ ہیں۔ حیدرآباد کے اور باہر کے بعض اولیاء اللہ نے بھی یہی بیان کیا۔ حضرت بڑے سجادہ صاحب گلبرگہ شریف نے اپنی ایک خاص مشکل میں حضرت خواجہ بندہ نوازؒ کی طرف رجوع کیا تو ارشاد ہوا۔ مدنی صاحب سے رجوع کرو۔ اسی طرح حضرت سجادہ صاحب درگاہ یوسفینؒ کو ایک خاص معاملہ میں حضرت یوسف صاحبؒ شریف صاحبؒ سے اسی قسم کی ہدایت ہوئی۔ علاوہ ازیں حضرت عبداللہ بغدادی صاحب کو ان کی ایک عزیزہ کی مایوس کن علالت کے سلسلے میں ان کے بزرگانِ سلسلہ سے اسی قسم کا ایما ہوا۔ اور بفضلہ تینوں معاملات میں کاربراری ہوئی۔

**(۵) حضرت غوث اعظمؒ کی خصوصی عنایت** بغداد شریف میں حضرت نقیب الاشراف پیر حسام الدین قادری نے حضرت سے ایک روز فرمایا۔ ہم کو ارشاد ہوا ہے کہ آپ کی مقبولیت بارگاہِ غوثِ اعظمؒ میں سب سے بڑھ کر ہے۔ اس لیے ہم دعا کے لیے آپ کی طرف رجوع ہوں۔ آپ ہمارے لیے فلاں دعا فرمائیے۔ اس پر جواب دیا۔ تعمیلِ حکم میں دعا کرتا ہوں۔ ورنہ میں کیا اور میری حقیقت کیا۔ حضرت پیر شرف الدین قبلہ کلید بردار بغداد شریف نے ایک روز آپ سے فرمایا۔ حضرت غوثِ اعظمؒ آپ کے متعلق فرماتے ہیں تم ہماری اولاد میں مثل اولاد شمار ہوتے ہو۔ حضرت نے اپنی خاص چیز قصیدۂ غوثیہ آپ کو عطا کی ہے۔ اس پر میرے رفیق سفر مولوی عبدالقدیر صاحب حسرت نے مبارکباد دی کہ حضرت نے اپنی خاص چیز آپ کو عطا فرمائی جبکہ دیگر رفقا کو اور چیزیں عنایت ہوئیں

**(۱۰) مشکوٰۃ الصلوات کا اعجاز**

فرمایا حضرت عبدالحی کتانی مراکش (صحرا) کے مشہور عالم بزرگ اور عالم تھے ان کے متعلق ڈاکٹر حمید اللہ پروفیسر پیرس یونیورسٹی نے بیان کیا کہ ان کا کتب خانہ عالم اسلام کے وسیع ترین کتب خانوں میں سے ہے۔ حضرت عبدالحی کتانی نے میری مؤلفہ درود شریف کی کتاب "مشکوٰۃ الصلوات" کو حرمین شریفین میں پڑھ کر فرمایا۔ آپ رسول اللہ کا زندہ معجزہ ہیں کہ عربی نہ جاننے کے باوجود ایسی کتاب لکھی ہے جو ادبیت، معنویت، قرآنیت، اور عظمت نبوی کی وضاحت کے لحاظ سے غیر معمولی شانیں رکھتی ہے۔ اور یہ کام آپ کے لیے مقدر تھا کچھ عرصہ بعد لوگ ایسے پڑھ کر سمجھیں گے کہ آپ اپنے زمانہ کے عربی کے بہترین ادیب تھے۔ خود مجھ سے مشکوٰۃ الصلوات کی اجازت و سند لی اور حرمین میں دوسروں کو بھی دلوائی اس کتاب کے دس نسخے خود لے کر سلطان ابن سعود کے پاس بھجوائے علاوہ ازیں حضرت شیخ الدلائل نے بھی مدینہ منورہ میں مجھ سے مشکوٰۃ الصلوات کی اجازت لی۔

**(۱۱) حکمت پر حکومت**

حیدرآباد کے حضرت پیر سید محمد جو [illegible] صاحب کے لقب سے مشہور تھے، ایک دن حضرت سے فرمانے لگے کہ مجھے تو کرامتیں اور بڑائیاں نصیب ہوئیں اگر کہا دو سوال حضور حیدرآباد کے کسی مرشد کو ملتا تو دس قطب عالم برابر ہو جاتا۔ میں بھی ان میں شامل ہوں۔ تاریخ اسلام میں اس کی نظیر نہیں کہ جب سلطان ابن سعود جیسے سخت جلال والے بادشاہ کے دربار میں وہابیت و نجدیت اور ان کی سیاسیات کے خلاف تیری حرکتہ الآراء تقریر ہوئی وہ بہت متاثر ملک سہمت ہو گیا۔ تاہم لوگوں کو اندیشہ رہا اور افواہ چلی کہ برقی پیر صاحب کے خلاف کچھ

ہماری اس طلب میں دراصل حضرت ہی کی نسبت کی عظمت، قوت واستحکام مضمر تھے۔ اسی نسبت پر فخر کے تحت ہمارا یہ عمل تھا۔ البتہ ایسے مقام ناز میں نفس کا شائبہ نہ آنے پائے، ورنہ نسبت باقی نہ رہے گا۔ جتنا اونچے جائیں گے اتنا ہی نیچے گریں گے۔ اللہ نفس سے بچائے (آمین)

**(۷) مجھ میں نفس**

مدینہ طیبہ میں حضرت کے ایک اہل دل دوست قمر الدین نواب باب جبریل پر متعین تھے۔ حیدرآباد کے فٹ بال کے مشہور کھلاڑی فقیر شاہ صاحب مدینہ طیبہ حاضر ہوئے۔ قمر الدین صاحب نے فقیر شاہ صاحب کو دیکھا تو لپٹ گئے اور فرمانے لگے۔ آپ میں تو برنی صاحب کی خوشبو آرہی ہے۔ اس پر وہ حیران ہوئے اور کہا۔ میں اُن کا غلام ہوں کالج میں پڑھا ہے۔

**(۸) حضرت کا مقام**

ایک دن میری اور نواب سعید جنگ بہادر کی گفتگو تھی حضرت قبلہ کمال اللہ شاہ صاحب، مولانا محمد حسین صاحب قبلہ اور حضرت برنی صاحب قبلہ کی تعلیم کے متعلق حضرت کے بالمواجہ ہوئی۔ ناچیز نے عرض کیا۔ بڑے حضرت قبلہ پر اللہ اللہ اتنا کھلا تھا کہ اسی کو ہر وقت بیان فرماتے۔ حضرت مولانا محمد حسین قبلہ پر لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کا ایسا غلبہ تھا کہ ہمیشہ اسی کو ہر رنگ میں بیان فرماتے اور حضرت برنی صاحب قبلہ پر محمد رسول اللہ کا اتنا زبردست الفتاح و انکشاف ہے کہ کل وقت اسی پر گفتگو رہتی ہے حق یہ ہے کہ رسول مِلا تو سب مِلا۔

**(۹) جملہ ما ایم**

ایک دن فرمایا۔ "ما ہیچ نیئم" تو ہمارا ہر وقت کا حال ہے۔ لیکن کبھی کبھی عالم ظاہر میں میرا حال "جملہ ما ایم" کا ہو جاتا ہے اور سب مجھے صاف طور پر پاتا بھی جاتا ہے۔

میں نے اُن سے کہا۔ آپ کو اس کمیٹی میں بحیثیت وزیر شریک ہونا چاہیئے۔ انھوں نے کہا۔ یہ کیسے ممکن ہے۔ کل جانا طے ہے۔ میں نے کہا۔ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اللہ کی شان! نہ سان نہ گمان۔ نہ کونسل نہ قرار داد۔ نہ وزیر اعظم کے فرشتوں کو خبر۔ اچانک شام میں حضور نظام نے اُن کی وزارت کا فرمان جاری کر دیا۔ سب حیران رہ گئے۔ اور نواب علی یاور جنگ بہت معتقد ہو گئے۔

ایک دن مشہور مشائخ حیدرآباد سید بادشاہ حسینی صاحب کے خلاف حضور نظام نے فرمان جاری کیا۔ وہ بہت پریشان آئے۔ میں نے کہا۔ پریشان نہ ہوں۔ اللہ چاہے تو آپ کے موافق ایسا فرمان آئے گا۔ واپس گھر گئے تو دوسرا فرمان ایسا کھڑا تھا جس میں وہی الفاظ تھے جو میں نے کہے تھے۔ بادشاہ میاں حیران رہ گئے۔

## (۱۴) گورنر اور وائسرائے کی ملاقاتیں

سنہ ۱۹۰۴ء میں سر جیمس لاتوش لفٹننٹ گورنر یو۔ پی ہمارے [illegible] آئے۔ ہمارے [illegible] کے معائنہ کا بھی پروگرام تھا۔ [illegible] ہفتہ میں [illegible] تھا۔ میں نے اپنے ماسٹروں سے کہا۔ لاٹ صاحب آج مجھ سے ملیں گے۔ سب ہنسے۔ جب وہ آئے تو میں بہت دور کھڑا تھا۔ انھوں نے میرا رُخ کیا اور آکر مجھ سے ہاتھ ملا کر دیر تک باتیں کیں۔ لوگ حیران رہ گئے۔ قریب تو افل کی بچپن میں تمنا تھی کہ ہم بھی کسی کے غلام نہیں۔ مسلمان کی شان ظاہر رہے۔

وائسرائے لارڈ ویول اور لیڈی ویول جب حیدرآباد آئے تو عثمانیہ یونیورسٹی دیکھنے آئے۔ ان کے مقررہ راستے سے میں علیحدہ کھڑا تھا۔ وائسرائے کی مجھ پر نظر پڑ گئی۔ وہ اپنا راستہ چھوڑ کر میرے پاس آئے۔ خود سلام کر کے مصافحہ کیا اور دیر تک باتیں کیں۔ پھر جا کر وائسرائن سے کچھ کہا۔ وہ بھی

حج بدل کے احکام جاری ہوں گے۔ اس پر تمام علماء، مشائخین نے کعبۃ اللہ میں جمع ہوکر حلف لیا کہ اگر برنی صاحب کا حج نہ ہو تو ہم سب حج نہیں کریں گے۔ انھوں نے اس وقت عالمِ اسلام کی طرف سے بطور فرضِ کفایہ نیابت و وکالت کی ہے۔ مولانا عبدالحی کتانی بھی ان میں شریک تھے۔ اس کا اندازہ گورنمنٹ کو ہوگیا۔ دوسرے دن اظہارِ خوشنودی کے لیے حکومت کی طرف سے تجھ کو خصوصی ڈنر دیا گیا۔ اس کے بعد سلطان نے تجھے اپنا مہمانِ خصوصی بنانا چاہا تو تو نے انکار کر دیا۔ امیر فیصل نے میرے داماد علوی کے ذریعے ملنا چاہا اور تجھے دینے چاہے لیکن تم نے قبول نہیں کیا۔ کس کی ہمت تھی کہ حرمین شریفین میں مشکوٰۃ الصلوات (درودوں کی کتاب) کے پانچ سو نسخے تقسیم کر سکے جہاں دلائل الخیرات کے نسخے جلائے جاتے ہیں۔ جہاں یا رسول اللہ کہنا شرک اور فاتحہ بدعت ہے وہاں تو نے محرم کے مہینے میں مسجدِ نبوی کے سامنے نیاز دے کر شربت کی سبیل لگا دی، حالانکہ وہاں اس جرم میں کوڑے لگائے جاتے ہیں۔ گذشتہ سال ایک مصری عالم نے سلطان کے سیاسی مسلک کے متعلق ذرا سا اشارہ کیا تھا تو [illegible] سے روک دیا گیا۔ تو نے تو ان کے مسلک و سیاست کے پرخچے اڑا دیے۔ اور رواداری فاروقی نسبت کی۔ ذرا نہیں ڈرا۔ تو نہ اپنی تعریف سنتا اور نہ ذکر کرتا۔ ہر چیز کو ان سنی کر دیتا ہے۔ مولانا احسان اللہ صاحب مشہور برٹش کونسل مقیم جدہ نے کہا کہ پچیس تیس برس سے کوئی حاجی اس قوت و شان کا یہاں نہیں آیا جس کی حکومت پر حکومت معلوم ہوتی ہے۔ حکومت نے ہر جگہ احکام دے رکھے تھے کہ برنی صاحب کے معاملے میں کوئی تعارض نہ کرے۔

**(۱۴) شدیدِ اتقا کی مثالیں** فرمایا۔ نواب علی یاور جنگ (وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی اور شہرتِ [illegible] تھے [illegible] وزیرِ اعظم [illegible] حضرت کے شخصی دوست بھی تھے) ان کو ایک کھچڑی میں دہلی لے جانا [illegible]

میں نے دوسطری نوٹ لکھا۔ اوّل تو مجھ کو پرنسپل صاحب سے کوئی ذاتی شکایت نہیں۔ اگر بالفرض ہو بھی تو جب تک یہ سوال بندا صولاً پرنسپل صاحب کے توسط سے نہ آئے جواب لکھنا اصول و قواعد کے خلاف سمجھتا ہوں۔ اس پر سکریٹری صاحب نے کارروائی ختم کر دی اور ایک ایٹ ہوم دیا۔ اس میں پرنسپل صاحب سے کہا کہ جب تک آپ کے کالج میں ایک دو ایسے قابل حضرات موجود ہیں کالج ناز کر سکتی ہے۔

**(۱۶) اپنی طبیعت** فرمایا۔ بچپن سے یہ میری طبیعت کا جزو ہے کہ میں نے ہمیشہ اپنے کو بے سمجھ اور جاہل دیکھا۔ عقل و علم کا کبھی دعویٰ نہیں۔ حالانکہ بہت سے مجھے بڑا عقل مند اور عالم سمجھتے ہیں۔ البتہ میری زندگی نصرت و حفاظتِ الٰہی میں بسر ہو رہی ہے جس میں عقل کو دخل نہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مذہب کا نقطۂ نظر کتنا صحیح ہے۔ بندہ کو اپنے عدم و جہل و اضطرار میں رہنا چاہیئے۔ لا دعویٰ رہے اور ایک لمحہ عقل پر توکل نہ کرے جس کے بعد کھل جائے گا کہ ہماری زندگی میں سوائے فضل و رحمت و حفاظتِ الٰہی کے کچھ نہیں اس ربط کے بعد حکمت کے گوناگوں نکات کھلتے ہیں، اس میں اپنی ارادت و کسب کو دخل نہیں۔ اسباب و علل کی حد تک عقل کی رسائی ہے۔ اس سے اوپر رحیمیت و مشیت تک صرف قلب (ایمان) کی رسائی ہے، جو عقل ہے۔

یہی حال میرے دل کا بھی ہے۔ کسی سے قلب میں کینہ، عداوت، غصہ نہیں رکھتا۔ اگر قلب میں کسی سے کدورت آ بھی جائے تو کسی نہ کسی اعتبار کو قائم کر کے کدورت جلد دُور کر دیتا ہوں۔ دعا، استغفار یا صحتِ علم کے ذریعے۔ پھر قلب کورا رہتا ہے۔

ایک بات یاد رکھو ہر شئے کام آئے گی۔ کھلے تو زندگی بن جائے گی۔ دل بنا

ملنے کے لیے آئیں اور دیر تک گفتگو کرتی رہیں۔ یہ دیکھ کر ریذیڈنٹ بھی آیا اور سلام کرکے واپس چلا گیا۔

ربوبیت کی معمولی تجلی ہو تب تو سب جھک جاتے ہیں۔ فیض ربوبیت کے ان تماشوں کے باوجود لوگ نعمتوں سے انکار کرتے ہیں۔ حیرت کی بات ہے

**(۱۴) استغنیٰ اور اصول پسندی**

فرمایا۔ علی گڑھ کالج میں بی۔ اے میں سب سے اول آنے پر تعدد کے لحاظ سے گورنمنٹ سے ڈپٹی کلکٹری کا عہدہ پیش آیا۔ میں نے علمی مشاغل کے مقابل اسے قبول نہیں کیا اور ایم۔ اے میں شرکت کی۔ ایم۔ اے پاس کرنے کے بعد مسٹر گلانسی وزیر فینانس ریاست حیدرآباد نے مجھے تاریخ کے لیے یورپین اسکالرشپ دینا چاہا۔ وجہ یہ کہ معاشیات کے لیے ایک دوسرے صاحب کے نام وظیفہ منظور ہو چکا تھا۔ میں نے اصولاً انکار لکھ دیا کہ تاریخ میرا مضمون نہیں۔ اس پر انھوں نے میرے مضمون معاشیات کا لحاظ کرکے خصوصیت سے دوسرا وظیفہ منظور کیا۔ اس سے بھی میں نے بربنائے علالت والدۂ محترمہ استفادہ نہیں کیا۔ یہ وظیفہ میرے لیے دس برس تک محفوظ رہا لیکن میں نے اپنے خاص اصول کی بنا پر استفادہ نہیں کیا۔

**(۱۵) بے لوثی کی مثال**

فرمایا۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی عثمانیہ یونیورسٹی کالج کے پرنسپل تھے اور میں پروفیسر معاشیات۔ ڈاکٹر صاحب کو میرے متعلق کچھ غلط فہمیاں ہو گئیں اور وہ مجھے اپنا مخالف سمجھنے لگے۔ میں نے حسب عادت صفائی کی کوشش نہ کی۔ نواب ذوالقدر جنگ مرحوم سکریٹری تعلیمات تھے۔ وہ کسی وجہ سے ڈاکٹر صاحب کے خلاف ہو گئے اور ایک سوال نامہ کے ذریعے کالج اسٹاف سے پرنسپل صاحب کے خلاف مواد مانگا۔ بہت سوں نے شکایتیں لکھیں۔ ستار صاحب کو مجھ سے بہت اندیشہ تھا لیکن

کا جوش وقتی اُبال ہوتا ہے جو جلد ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر تنازعہ ختم ہو گئی۔ سب ممنون ہوئے۔

ایک اور موقع پر فرمایا۔ مجھے لڑکپن میں قلوب کو مسخر کرنے اور دلوں میں قبولیت حاصل کر لینے کے عمل کا شوق تھا۔ بعد کو معلوم ہوا کہ یہ بڑی ابتلا ہے۔ آدمی تعیشات میں گھر کر رہ جاتا ہے۔ اب مجھے کسی کی تعریف سے بڑھ کر اس کی بے رخی میں لطف آتا ہے۔ اس کیفیت پر مجھے بعض وقت کفرانِ نعمت کا دھوکا ہوا کہ لوگوں کی قدر دانی کی کہیں ناقدری نہ ہو۔ لیکن قلائد الجواہر میں حضرت غوث اعظمؓ کا فرمودہ دیکھ کر اطمینان ہوا۔ حضرت کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ جامع مسجد میں جانے پر بہت ہل چل ہوتی۔ ایک دفعہ جمعہ کے دن روانگی میں دیر ہوئی تو بعضوں نے کہا۔ آج بڑی ہل چل ہوگی۔ فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے محبت و نفرت کو میرے قبضہ میں کر دیا ہے۔ دیکھو آج کوئی مجھے سلام نہیں کرے گا اور نہ اُٹھے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ یہ ارادہ بھی تحتِ امر تھا۔ اگر ارادہ میں نفس شامل ہو جائے تو اللہ کی سخت ناراضی کا باعث ہوتا ہے۔ حضرت کے صدقے میں میرا بھی جی چاہتا ہے کہ کوئی عقیدت مندی دکھائے تو محبت کا دروازہ بند کر دوں اور بعض وقت جاری رہنے دوں۔

اصل راز یہ ہے کہ غلامی پکی رہے۔ بڑائی مطلوب نہ رہے۔ چھوٹے ہیں یا بڑے آپ کے ہیں تو کافی ہے۔ اس کے بعد جتنا چاہیں دیجئے۔ ہم تو دو کوڑی کے بھی نہیں۔ نسبتِ غلامی محض فضل ہے۔ اس میں حفاظت ہے۔

**(۱۸) بغیر آپریشن مایوس شہزادے کی صحت** شہزادی دُرِ شہوار کے عزیز ترکی شہزادے آفندی صاحب حیدرآباد میں گئے تو جانس خاں صاحب کے پاس مہمان ہوئے۔ ایک دن مغرب کو ان پر اپنڈی سائٹس کا

نے بھی عمل پڑھا۔ اطلاع پر حضرت بھی مریض کو دیکھنے تشریف لے گئے۔ ان کے والد صاحب نے کہا۔ لڑکا ہر ایک کو مارنے دوڑتا ہے۔ مناسب ہے کہ آپ نہ ملیں۔ لیکن حضرت تشریف لے گئے۔ مریض نے دیکھتے ہی سلام کیا۔ آپ نے دو آنے کا ایک نسخہ لکھ کر دیا۔ مریض کو استعمال کرایا گیا۔ بالکل آرام ہوگیا۔ ڈاکٹر حیران ہوگئے۔

ایسے واقعات بکثرت ہیں۔ مختصر یہ کہ حضرت کو طب سے طبعی مناسبت تھی۔ طبِ اکبری اپنے والد صاحب سے پڑھی تھی۔ بعض دفعہ یونانی، انگریزی دوائیں تجویز فرماتے اور مریضوں کو جلد فائدہ ہو جاتا۔ بعض وقت دواؤں کے ساتھ دعائیں شریک رہتیں۔ یا کوئی ورد پڑھنے کو تلقین فرماتے اور حیرت انگیز طور پر فائدہ ہو جاتا۔ بعض دفعہ صرف دعائیں ہوتیں اور مایوس العلاج مریض صحت مند ہو جاتے۔ یہی حال جن بھوت کے مایوس العلاج مریضوں کا تھا کہ جلد شفا پا جاتے۔

حضرت نے موتی منجن اور اکسیر اسپیل بنایا تھا جو بہت چلا۔ علاوہ ازیں اخیر زمانے میں سرطان، جذام، برص اور دِق جیسے مایوس العلاج امراض کے لیے خاص دوائیں تیار فرمائی تھیں اور معالجے جاری تھے۔ لیکن خلقِ خدا کو زیادہ مستفید ہونے کا موقع نہ مل سکا کہ وصال ہوگیا۔ علاوہ ازیں حضرت کا عام میلان روپیہ بنانے کی طرف نہ تھا۔ ورنہ طبابت یا وکالت کے ذریعے لاکھوں کما سکتے۔ صرف اہم ترین علمی یا دینی مشاغل نصب العین تھے۔

## (۲۰) اِل۔اِل۔بی کا ہتھیار

حضرت ام۔اے، ال۔ال۔بی کامیاب تھے۔ اُس زمانے میں لیڈری اور پلیڈری میں چولی دامن کا ساتھ تھا۔ بڑی حد تک اب بھی یہی کیفیت ہے۔ نام کا نام اور دام کے دام۔ عرصے تک حضرت عثمانیہ یونیورسٹی کالج کے فٹ بال اسوسیشن کے صدر تھے۔ آپ کی زیرِ نگرانی حیدرآباد کے فٹ بال کا معیار ہندوستان میں بہت بلند ہوگیا تھا۔ فٹ بال کے سلسلے میں

اچانک دورہ پڑا۔ مشہور پارسی سرجن کو رنے والا بلایا گیا۔ اس نے کہا۔ حالت مایوس کن ہے۔ فوری آپریشن کی ضرورت ہے لیکن میں صبح آپریشن کروں گا۔ جانس خاں صاحب حضرت کے پاس دوڑے آئے۔ آپ نے جاکر دیکھا۔ زندگی کی امید نہ تھی۔ حضرت نے جناب باری میں دعا فرمائی۔ ہمارے محلہ سے یہ مہمان تختے پر نہ جائے گھوڑے پر جائے۔ حضرت نے ڈاکٹر حسن علی خاں کو بلوایا لیکن وہ ایک تیمارداری میں جا چکے تھے۔ آپ محلہ کے حضرت صدیق شہیدؒ کے مزار پر حاضر ہوئے اور عرض کیا۔ ہمارے مہمان کا آپریشن نہ ہو۔ صحت ہو جائے۔ اس کے بعد گھر پہنچے اور دیکھا۔ آفندی صاحب بالکل اچھے ہو چکے ہیں اور کھانے کے خواہش مند ہیں۔ حضرت نے فرمایا۔ بلا تکلف کھلاؤ۔ صبح ڈاکٹر کو رنے والا اور ڈاکٹر حسن علی خاں دونوں آئے، اور آفندی صاحب کو بھلا چنگا دیکھ کر ۔ ۔ ۔ دنگ ہو گئے۔ حضرت نے فرمایا۔ قرآن کے لحاظ سے جب بندہ مردوں کو زندہ کر سکتا ہے تو کیا اللہ بیماروں کو اچھا نہیں کر سکتا۔ جب جسم و جان دونوں موجود ہیں۔ حالانکہ وہ عدم سے وجود میں لاتا ہے۔ وہ دعا کے لیے کہتا ہے تو یقین نہیں آتا۔ اولیاء اللہ اللہ کی قوت سے کیا کچھ نہیں کرتے۔ ایمان شرط ہے۔

ڈاکٹر بنکٹ چندر حیدرآباد کے مشہور فزیشن نے مجھ (مؤلف) سے ایک دفعہ نواب محمود یار جنگ کے پاس ایک علالت کے سلسلے میں فرمایا۔ بنی صاحب کی قوت ارادی بڑی زبردست ہے۔ وہ علاج کیا کرتے ہیں کرامتیں دکھاتے ہیں۔ اسی قسم کی رائے حیدرآباد کے دوسرے مشہور فزیشن ڈاکٹر شاہ نواز نے بھی ظاہر فرمائی۔

**(۱۹) دیوانے کا نسخہ**

ڈاکٹر عثمان خاں کے فرزند ڈاکٹر معمر خاں پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی ایک دفعہ ٹائیفائیڈ کے مرض میں مبتلا ہوئے۔ بحرانی کیفیت طاری ہوئی۔ ہر ایک کو مارتے۔ گالیاں دیتے۔ بعضوں نے جن بھوت کا اثر بتایا۔ ان کے علاج میں تین ڈاکٹر شریک تھے جن میں ڈاکٹر بنکٹ چندر بھی تھے۔ ایک عامل صاحب

حضرت کے کمالاتِ فن دیکھنے کے لیے سرکاری مہمان کی حیثیت سے آنے کی دعوت دی، لیکن مصروفیتوں کی وجہ سے حضرت نے عذر فرمایا۔

**(۲۲) نسبتوں کی لڑائی** اس ناچیز نے حضرت کی نظامت دارالترجمہ کے زمانے کا ذکر چھیڑا تو فرمایا۔ میری نظامت کے زمانے میں بعض بڑے مفسد جمع تھے۔ جنھوں نے عہدہ داران بالا بلکہ حضورِ نظام تک میرے خلاف ریشہ دوانیاں کیں۔ لیکن میں نے جواباً سکوت اختیار کیا اور ضابطہ کی حد تک کارروائی کی۔ سب یہ ظاہری و باطنی ماریں پڑیں۔ دفتر میں ایک صاحب قطبِ وقت سمجھے جاتے تھے۔ ہمیشہ انگلی گھمایا کرتے تھے۔ اُن کو اپنی ظاہری و باطنی نسبتوں پر ناز تھا۔ باطنی نسبتیں قوی تھیں۔ انھوں نے اپنے کو ناگزیر سمجھ کر استعفیٰ پیش کیا۔ میں نے منظور کر دیا۔ سبھوں نے کہا۔ اس پر ہاتھ ڈالنا مناسب نہیں۔ بڑا صاحبِ باطن ہے۔ لیکن خیال ہوا کہ ہم کو بھی تو اپنی نسبت غوثیہ کی لاج رکھنی ہے۔ اگر ہر ایک سے دب جائیں تو نسبت کا لحاظ، قوت اور ناز کہاں رہے گا۔ کہیں ہماری گوشمالی نہ ہو۔ اس لیے میں نے کہا۔ ڈبل قوت مان کر بھی میں استعفیٰ منظور کر رہا ہوں۔ جس نسبت پر انھوں نے قوت لی ہے، میں نے اُسی قوت کا مزید پاس لحاظ کیا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خوشامد پر اُتر آئے اور درخواست واپس لینی چاہی۔ لیکن میں نے انکار کر دیا۔

**(۲۳) ہندو دھرم کا مطالعہ** ہندو مذہب کے متعلق بھی حضرت کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ چنانچہ رگ وید کا اُردو میں ترجمہ بھی کر دیا اور اُس کا مقدمہ لکھنے کے لیے مواد بھی مرتب فرمایا۔ ارادہ تھا کہ ترجمے کے ساتھ اس کی اشاعت ہو لیکن موقع نہ مل سکا۔ ہندو مذہب کے متعلق بعض ایسی باریک چیزیں بیان فرماتے کہ اچھے اچھے پنڈت سن کر قائل ہو جاتے۔

طلبہ کے نزدیک بڑے مشہور معرکے رہے۔ ایک مشہور کیس ہائی کورٹ میں چلا اور دوسرا
بیادر گھاٹ ہائی اسکول سے ڈپارٹمنٹ میں۔ ہائی کورٹ کے مقدمہ میں مشہور بیرسٹر
کی غیر معمولی جرح حضرت پر ہوئی جسے دیکھنے کے لیے بڑا ہجوم ہوا۔ اس میں آپ کی
قانونی قابلیت کا اندازہ کر کے بڑے بڑے بیرسٹر دنگ رہ گئے۔ نواب عسکر یار جنگ
جیسے مشہور جج نے کہا۔ آپ جیسا غیر معمولی قانونی دماغ حیدرآباد میں ہے اور بچوں
کی تعلیم و تعلم میں مصروف! اگر آپ آج وکالت شروع کریں تو لاکھوں کمائیں۔
جواباً فرمایا۔ ال۔ ال۔ بی کی سند ایک ہتھیار ہے جس کا لائسنس ہم نے حفاظت کی
غرض سے لیا ہے۔ شکار کی غرض سے نہیں۔

**(۲۱) پہلوانوں سے مقابلے** حضرت کو بچپن سے ورزشوں سے بے حد دلچسپی
رہی۔ عثمانیہ یونیورسٹی کی ملازمت کے زمانے ہی
میں اپنے دولت خانے پر ایک کمرے میں دنگل بنایا تھا جس میں زور آزمائیاں
ہوتیں۔ بڑے بڑے پہلوان آتے قوت اور فن کے کمالات دکھاتے شہزادگان
دلی کے اُستاد پہلوان نبی بخش بھی آکر کشتی کا فن سکھاتے تھے۔ شاہی منصب دار
پہلوان نصیر الدین کشمیری سے بھی ایک عرصہ تک زور آزمائی کا سلسلہ رہا۔ ان
میں سے اکثر کہتے۔ دیکھنے میں آپ کا بدن ورزشی نہیں لیکن قوت اور زور آزمائی
بلا کی ہے۔ اس زمانے میں جنبیہ، تلوار، بانک، بنوٹ، کشتی، مکا بازی، ورزش،
گھوڑا سواری، پیراکی، موٹر رانی وغیرہ کی خوب مشقیں رہتی تھیں۔ ہر فن ہو جانے
حضرت تجربات کے بعد علم و عمل میں اصولی ربط معلوم کرتے تاکہ فن میں جان پڑ جائے
اور کتاب لکھی جاسکے۔ بنوٹ کے مشہور اُستاد محبوب علی صاحب بھی بنوٹ سکھانے
کے لیے آتے تھے۔

مہاراجہ بڑودہ کو سپاہیانہ کمالات اور مردانہ ورزشوں سے خاص دلچسپی تھی۔

کے خلاف اچانک حضرت کی تقریر آتما ودّیا کے موضوع پر اسی کانفرنس میں رکھائی
آپ نے آتما ودیا کے متعلق ہندو مذہب ہی کا نقطۂ نظر بیان فرمایا۔ اس تقریر
سے لوگ اتنے متاثر ہوئے کہ بعض اٹھ کر حضرت کے قدموں پر گر پڑے۔ اور
صدرِ جلسہ نے اپنی تقریر میں کہا۔ برنی صاحب نے تو آج ہم سب کو اپنا چیلا
بنا لیا۔ جے پور کالج کے پرنسپل ایک بڑے مہاشے بھی اس جلسہ میں شریک تھے۔
انھوں نے اپنی تقریر میں کہا ہمارا بڑے سے بڑا پنڈت بھی آتما ودیا اور ہندو
دھرم کے متعلق برنی صاحب سے زیادہ معلومات نہیں دے سکتا۔

ایک اور موقع پر انگریزی کے ایک ہندو پروفیسر نے تعجب سے پوچھا کہ جب
آپ ہندو دھرم کے متعلق اتنا وسیع علم رکھتے ہیں تو آپ مسلمان کیسے ہیں۔ فرمایا
محمدی (مسلمان) بہت بڑی حقیقت ہے۔ اس کا علم بہت اعلیٰ و ارفع ہے عبدیت
اسلام کی خصوصی تعلیم ہے جس میں انتہائی رفعت ہے، وسعت ہے۔ اس کی
تعلیم یہ ہے کہ مطلق میں غرق ہوں اور لاتعیّن کی عبادت کریں، نہ کہ تعیّن کی،
تقیّد کی۔

## (۲۴) جھوٹی نبوّت

فرمایا۔ معاملہ محض فضل پر ہے کہ ہم محفوظ ہیں۔
غلام احمد قادیانی صاحب نے تو شکوک، غیر یقینی خوابوں
پر اپنی نبوّت کی بنیاد رکھی۔ یہ قادیانی اور وہابی اپنی حمایت میں جو دلائل لاتے
ہیں، اُن سے کہیں زیادہ قوی دلائل کی آیتیں، اُن کے نقطۂ نظر کے لحاظ سے،
یُضِلُّ بِہٖ کَثِیْرًا کے تحت رسول اللہ صلعم اور اولیاء اللہ کے خلاف ہم کو ملتی ہیں،
جن کو اگر ہم پیش کریں تو یقیناً وہ ہمارے ممنون بلکہ متبع ہو جائیں گے۔ لیکن
معاملہ فضل پر ختم ہوتا ہے اور ہم پر یَھْدِیْ بِہٖ کَثِیْرًا (ط) کی شانیں کھلتی ہیں۔
حیدرآباد میں دو حضرات بہت ذہین، ذی علم، ماہر تقریر و تحریر ہیں۔

بعض دفعہ بعض مرتاض بوڑھے جوگی تو پہلی ہی ملاقات میں گرویدہ ہو گئے۔ چند نوجوان پر تو بعض سادھو محض صورت دیکھ کر فریفتہ ہو گئے۔ مشتے نمونہ از خروارے یہ کہ:

ایک دفعہ پروفیسر نصیر احمد صاحب کے ساتھ منا ٹھ کے سامنے کے پہاڑی قلعہ آنکا کو دیکھنے کے لیے گئے۔ جہاں دو بزرگوں کے مزار ہیں۔ جن میں ایک جمال سمجھے جاتے ہیں تو دوسرے جلال۔ مرہٹے عقیدت سے عرس مناتے ہیں۔ اس پہاڑ پر ایک بوڑھا جوگی رہتا تھا۔ اس نے آپ کو دیکھتے ہی کہا۔ آپ دو ہفتے میرے مہمان رہنا قبول فرمائیں۔ میں آپ کی سیوا کرنا چاہتا ہوں۔ یہ پہاڑ پورا سونا ہے۔ مجھے ایسی بوٹیوں کا علم ہے جن سے نہ صرف اعلیٰ دوائیں بلکہ سونا بن سکتا ہے۔ حضرت نے فرمایا۔ میرا اور رنگ اور تمھارا اور رنگ۔ اس پر اس نے کہا۔ ایسا نہیں ہے۔ میں تو دراصل آپ میں سری کرشن جی اور بہت سے دیوتاؤں کا جلوہ دیکھ رہا ہوں۔ اس دعوت میں میری غرض مضمر ہے۔

ایک اور واقعہ یہ کہ ایک بڑے مہاتشے شمالی ہند سے جنوبی ہند کے مندروں کی زیارت کے سلسلے میں حیدرآباد آئے جن کو سر اکبر حیدری وزیر اعظم نے اعزاز کے ساتھ گورنمنٹ گسٹ ہاؤس میں ٹھیرایا۔ ڈاکٹر عثمان خاں کے سامنے وہ مجھ سے دارالترجمہ میں ملے۔ ہندو دھرم پر گفتگو چلی۔ کچھ ہی دیر بعد انھوں نے کہا میں آپ میں وشنو اور شیو دونوں کے درشن کر رہا ہوں حالانکہ یہ دونوں کسی ایک جگہ نہیں ملا کرتے (یعنی جمال و جلال دونوں کا مظہر ہوں)

ایک اور واقعہ یہ کہ بیگم بازار حیدرآباد کے سناتنی مٹھ میں آل انڈیا سناتن دھرم کانفرنس ہوئی باہر کے چند پنڈت اور پروفیسر گھر پر حضرت سے ملنے آئے حضرت کی گفتگو سن کر بے حد معتقد ہو گئے اور آپس میں کہا۔ اگر کرشن بھگوان سے ملنا چاہتے ہو تو ان سے ملا کرو۔ اس درجے متاثر ہوئے کہ اصرار کر کے پروگرام

دگویا روپیہ زیادہ، قدر کم، کے معاشی اصول پر عمل تھا۔ غریبوں سے خوب گھل مل کر ملتیں۔ لیکن امیروں سے آن سے ملتیں۔ ملاقات میں سادگی اور مساوات شرط تھی۔ نمائش اور تکلف سے بہت بچتی تھیں۔ اور جہاں غرور و تکبر نظر آتا اس کی سرکوبی فرض کفایہ سمجھتی تھیں۔ ہر فرعونے را موسیٰ پر سختی سے عمل تھا اور یہ جاہ وشا رگ معلوم ہوتی تھی۔

کبھی ذکر آتا کہ فلاں عورت سے آپ نے اتنا حسن سلوک کیا پھر بھی وہ آپ کی برائیاں کرتی ہے، تو فرماتیں۔ اس کو مجھ سے زیادہ حسن سلوک کی توقع ہوگی۔ میں اس کے حسن ظن کے مطابق سلوک نہ کر سکی۔ اگر زیادہ سلوک کرتی تو شاید وہ ایسا نہ کہتی کسی بیمار کو دیکھنے جاتیں تو ایک دو منٹ سے زیادہ نہ ٹھہرتیں، دعا دیتیں۔ غریب بیمار ہو تو رقمی امداد فرما دیتیں اور چلی آتیں۔ فرماتیں۔ ڈاکٹر یا تیماردار کے سوا دوسرے لوگوں کا مریض کے پاس ہجوم کرنا تیمارداری کے آداب کے خلاف ہے۔ کسی کا بچہ بیمار ہوتا یا کوئی بی بی حاملہ ہوتیں تو شادی بیاہ یا کسی تقریب میں دعوت دینا پسند نہ فرماتیں۔ کبھی کوئی بی بی بیمار بچوں کو لے کر آجاتیں تو اُن کو واپس جانے کا مشورہ دیتیں۔ تاکہ دوسرے بچے متاثر نہ ہوں۔ تعلقات کی ناگواری میں بات بڑھانا پسند نہ فرماتیں اور حسن و خوبی سے علیحدہ ہو جاتیں تاکہ بدنمائی کی نوبت نہ آئے۔ بچوں کے امتحانات ہوتے تو اُن کو چھوڑ کر کسی تقریب میں نہ جاتیں کہ بچوں کے امتحان کے زمانے میں ان کے اوقات کی نگہداشت ضروری ہے۔

دستر خوان پر کھانے میں نمک مرچ کی کمی بیشی پر کوئی اعتراض کرتا تو پسند نہ فرماتیں۔ اور فرماتیں یہ بھی بڑی نعمت ہے جو نصیب ہو گئی۔ اچھا کھاؤ لیکن موٹا جھوٹا بھی دسترخوان پر آئے تو منہ نہ بناؤ۔ صاف ستھرا پہنو اور گھر کو صاف رکھو۔ لیکن اگر کبھی میلے کچیلے ماحول میں بھی گزر کرنا پڑے تو اس کو کسر شان

وہ مجھ سے کہتے ہیں۔ اگر قرآن میں ختمِ نبوت کا مسئلہ اس قدر واضح نہ ہوتا تو ہم آپ کو ضرور نبی سمجھتے۔ لیکن آپ کے توازن کا یہ عالم ہے کہ غلام غلامانِ آلِ محمد سے آگے نہیں بڑھتے۔ ماشاء اللہ۔

**(۲۵) والدۂ محترمہ**

حضرت کے والدین عملی عرفان کا بہترین نمونہ تھے حضرت کے والد بزرگوار حافظ محمد ابراہیم برنی صاحب قبلہ کا قیام بسلسلۂ وکالت زیادہ تر حیدرآباد میں رہتا تھا۔ وکالت میں ولایت کی شانیں دکھائیں۔ قابلیت کا یہ عالم کہ ایک دفعہ مشہور چیف جسٹس فضل حسین صاحب نے مثل پر لکھ دیا۔ ان کا احسان ہے کہ ہماری ہائی کورٹ میں وکالت کرتے ہیں آپ کے تربیتی خطوط کا مجموعہ اور حضرت پیر و مرشد مولانا محمد حسین صاحب قبلہ کے مکاتیب المعارف طباعت سے رہ گئے۔

حضرت پر آپ کی والدۂ محترمہ کی تربیت کا خاص اثر تھا۔ آپ کی والدۂ محترمہ اسلامی کیریکٹر کا ایک اعلیٰ نمونہ تھیں۔ جو چیزیں باکمال بزرگوں کے پاس کمالِ عرفان سمجھی جاتی ہیں، وہ ان کی روزمرہ کی زندگی تھی۔ بہت دولت مند تھیں۔ ضرورت مندوں کی خوب دل کھول کر مدد کرتیں۔ خوب خیر خیرات کرتیں۔ وصال کے بعد نقدی کے صندوق سے ڈھائی آنے نکلے۔ برادری کی کسی تقریب میں جاتیں تو سادہ لباس پہن کر جاتیں کہ غریبوں کو احساسِ کمتری نہ ہو۔ مخالفین کی مخالفت و مذمت سے متاثر نہ ہوتیں اور جب موقع ملتا ان سے ہمدردی فرماتیں۔ کبھی کوئی چیز چوری گئی اور چور کا پتہ بھی چل گیا تو چور کو پولیس میں دینا گوارا نہ کرتیں اور چور کے سامنے اس کا ذکر تک پسند نہ فرماتیں کہ وہ خود ہی شرمندہ ہے۔ کبھی فرماتیں کہ اگر ہم اس کی ضرورت کا خیال رکھتے تو شاید اسے چوری کی نوبت نہ آتی۔ کوئی چیز خریدتیں تو مول سے زیادہ دام دے دیتیں۔

خدمتِ دین کے کاموں اور تصنیف و تالیف میں مشغولیت رہی۔ لیکن آخر زمانے میں دین کے جو کام ہاتھ پر تھے اُن کی عجلت سے تکمیل کی طرف خاص توجہ معلوم ہوتی تھی۔

**گڈ ول مشن:۔** حضرت کی انگریزی کتاب "اسلام" یورپ، امریکہ، آفریقہ میں مفت تقسیم ہوئی۔ بڑے بڑے اہلِ علم اس سے متاثر ہوئے۔ ملاقات کا اشتیاق بڑھا تو حضرت نے اسلام کا خیر سگالی وفد (گڈ وِل مشن) لے جانا طے فرمایا۔ اس عالمی سفر میں ڈاکٹر سید عبد اللطیف پروفیسر انگریزی (حال صدر مسلم وقف بورڈ آندھرا) اور اس خادم کو ساتھ لے جانے کا خیال ظاہر فرمایا۔ افسوس کہ بہت جلد وصال ہو گیا اور یہ منصوبہ عملی شکل اختیار نہ کر سکا۔

تقریباً چوتھائی صدی سے زیادہ عرصے سے حضرت کی خدمت میں بہت سے خاص خاص عقیدت مندوں کی مسلسل حاضریاں رہیں۔ بہتوں کا تقاضا بلکہ اصرار رہا کہ حضرت بیعت میں داخل فرمائیں۔ لیکن حضرت کا رجحان یہ تھا کہ افادہ، تعلیم، تلقین میں عمومیت کا پہلو رہے اور تصنیف و تالیف کے ذریعے سے تعلیم عام رہے۔ لیکن وفات سے دو سال قبل حضرت نے فرمایا۔ اب قلب آمادہ معلوم ہوتا ہے کہ بیعت لے لی جائے۔ چنانچہ مولوی مرزا محمود علی بیگ صاحب، مولوی عبد الخالق خاں صاحب، مولوی غلام دستگیر رشید صاحب، مولوی احمد حسین خاں صاحب اور اس ناچیز کو بفضلہ بیعت و خلافت سے سرفراز فرمایا۔ الحمد للہ۔

ڈسمبر کے آخری ہفتہ میں حضرت کو بلند شہر سے اپنی چھوٹی ہمشیرہ صاحبہ کی علالت کا تار ملا۔ ہمشیرہ صاحبہ کو دیکھنے کے لیے آپ ۳۱ر ڈسمبر ۱۹۵۸ء کو شام کی گاڑی سے بعزم بلند شہر حیدرآباد سے روانہ ہوئے۔ بڑی صاحبزادی سفر میں ساتھ تھیں۔ بلند شہر سے چند روز کے لیے اپنے ننہالی وطن خورجہ تشریف لے گئے۔ وہاں طبیعت کچھ ناساز ہو گئی لیکن بلند شہر واپسی پر مزاج رو بہ صحت ہو گیا۔ اور حیدرآباد واپسی کی تیاری تھی۔ ۲۵ر جنوری کو دن میں حضرت نے اصلاح بنوائی، غسل فرمایا۔ نئے کپڑے زیب تن فرمائے۔ اور شام میں خاندان کے بچوں، نوجوانوں، بزرگوں کے ساتھ ہنستے بولتے رہے۔ اس کے

مت سمجھو۔ سنت کی تعمیل میں کبھی بچوں کو پیوند لگے کپڑے پہناتیں اور موٹا کھلاتیں۔ کبھی ہاتھ سے کام کرنے کو فرماتیں۔ ایک بی بی نے کہا۔ ہم شادیوں میں جاتے ہیں تو چاندی کا جوتا مار کر ملتے ہیں۔ یعنی تحفے تحائف دے کر ممنون کرتے ہیں۔ فرمایا ایسا احسان بھرنا دو بھر ہے۔ عزیزوں کا احسان ہے کہ ہمارا تحفہ قبول کریں۔ ہمارے گھر میں ایک بڑی بی ملازم تھیں۔ انھوں نے ہم سب بچوں کی بہت خدمت کی تھی۔ آخر عمر میں بیمار پڑیں۔ فرمایا۔ اس نے میرے بچوں کی بہت خدمت کی ہے۔ اس کے احسان کا کچھ بدل یہی ہو سکتا ہے کہ میں خود اپنے ہاتھ سے اس کی تیمار داری کروں۔ غلاظت دھوؤں۔ چنانچہ مرتے دم تک خدمت کی اور کسی کو اس میں شریک نہ کیا۔

ہر وقت حضرت عائشہ صدیقہؓ کے عشق میں مگن رہتیں۔ جب لہر آتی چکی پیستیں، جو کی روٹی بناتیں۔ اور کڑوں بیٹھ کر مرچ کے ساتھ کھاتیں۔ حضرت امام حسینؓ کی جناب میں عجیب والہانہ محبت و عقیدت تھی۔ محرم شریف کی فاتحہ بہت ہی اہتمام سے کرتیں۔ ایک مرتبہ فرمایا۔ ہم تو لونڈی غلام ہیں۔ آقا کو ہمارا یاد کرنا فطر ہے۔ لیکن آقا یاد فرمالیں تو ہماری سرفرازی ہے۔ چنانچہ عالم شہادت میں زیارت سے سرفراز ہوئیں۔ ماشاء اللہ۔

## ۲۶۹ حضرت کا وصال

حضرت نے شب دوشنبہ ۱۶ رجب ۱۳۷۸ھ مطابق ۲۶ جنوری ۱۹۵۹ء بمقام بلند شہر (یو۔ پی) اس عالم سے رحلت فرمائی۔ معلوم ہوتا ہے کہ کچھ عرصہ قبل ہی حضرت کو اس عالم سے جانے کے متعلق کچھ اشارے مل چکے تھے۔ چنانچہ کبھی باتوں باتوں میں کچھ فرما دیتے جس میں اس کا ادراک ہو جاتا۔ لیکن صحت و قوت ماشاء اللہ ایسی تھی کہ بظاہر یہ اندازہ ہوتا تھا کہ عنقریب تک تو با آسانی عمر پائیں گے۔ یوں تو عمر بھر حضرت کو

# برنی اکیڈمی

## پروفیسر الیاس برنیؒ کے تصنیفات تالیفات وتراجم

### (الف) شعبۂ اسلامیات (سلسلۂ دعوتِ صدق)

(۱) **اسرارِ حق** ۔ بزبان اردو، فارسی عربی ۔ صدق (تصوف) پر ایک لحاظ سے اپنے طرز کی پہلی کتاب ۔ تقریباً چار سو صفحات ۔ طبع اول نایاب ۔

(۲) **تسہیلُ الترتیل** ۔ بزبان اردو و عربی ۔ فن قراءت پر تفہیم جدید ۔ ۲۲۸ صفحات طبع سوم، قیمت دو روپیہ ۸ ء ملنے کا پتہ ۔ دارالعرفان ۔ لال ٹیکری ۔ حیدرآباد

(۳) **حزبُ اللہ** ۔ بزبان عربی، اردو ۔ خالص مجموعۂ اوراد قرآنی ۔ برائے مدافعت و خاتمۂ فساد و فتح حق ۔ ۸۰ صفحات ۔ طبع اول نایاب ۔

(۴) **مالکُ الملک** ۔ بزبان اردو و عربی ۔ حکومت ربانی کا خاکہ ۔ طبع نہ ہوسکا

(۵) **مشکوٰۃُ الصلوٰت** ۔ بزبان عربی ۔ مجموعۂ صلوٰۃ وسلام ۔ جامع و سیع تالیف بطرز خاص جدید ۔ جملہ سات حزب ۔ تین حزب ۔ خالص قرآنی ۔ باقی چار میں حضورؐ کی شان میں جو صلوٰۃ وسلام احادیث میں محفوظ ہیں یا اولیائے کرام نے عرض کئے ہیں ۔ طبع پنجم ۱۹۵۸ء میں ۔ ۱۵۰ صفحات ۔ ایڈیشن ششم طباعت طلب ۔

(۶) **فتوحُ الحِکَم** ۔ بزبان عربی ۔ ارشادات حضرت غوث اعظمؓ طباعت طلب

(۷) **سلطانٌ مبین** ۔ حالات حضرت غوث اعظمؓ طبع نہ ہوسکی ۔

(۸) **مکاتیبُ المعارف** ۔ حضرت کے مرشد مولانا محمد حسین قبلہؒ کے خطوط طباعت طلب ۔

(۹) **تربیتی خطوط کا مجموعہ** ۔ حضرت کے والد ماجدؒ کے خطوط ۔ طباعت طلب

بعد آرام فرمایا۔ دو بج کر تیس منٹ پر بیدار ہوئے جو عموماً تہجد کا وقت تھا بڑی صاحبزادی
بیدار تھیں۔ وقت دریافت فرمایا۔ اس کے بعد انگلیوں پر کچھ پڑھتے رہے کہ نظریں ایک
طرف لگ گئیں گویا کسی کی دید ہے۔ دو تین ہلکی ہلکی ہچکیاں لیں اور اللہ و رسول کی جناب
میں پہنچ گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔ تجہیز و تکفین کے بعد جب مزار مبارک میں
اُتارا گیا اور رونمائی کے لئے چادر ہٹائی گئی تو ایک صاحب نے دیکھا کہ کفن پر جو عطر پاشی
کی گئی تھی اس سے سینۂ مبارک کے مقام پر "اللہ محمد" کے کلمات نمایاں ہو گیا۔ انہوں
نے ایک دوسرے صاحب کو اشارہ کیا۔ یہاں تک کہ سب حاضرین نے اس کا مشاہدہ کیا۔ زیارت
کی۔ ناچیز نے جب بشارت سے سرفرازی پائی۔ دفعتاً بے اختیار زبان پر حضرت کا یہ شعر جاری ہو گیا

اللہ و رسول اللہ سے ملنے کی ہے کیا صورت ∴ برقی تجھے دیوانہ دیوانے کو کیا کہئے

سَلَامٌ عَلٰٓی اِلْ یَاسِیْنَ (۲۳ / ۸) الیاس پر سلام ہے۔

## (۲۷) سلسلۂ الیاسینؒ

برقی نامہ نمبر ۱ اول میں حضرت پیر و مرشد مولانا محمد حسین قبلہؒ کے مکتوب کا اقتباس مورخہ ۱۶ جمادی الآخر ۱۳۴۳ھ ملاحظہ ہو۔

"میری دعا ہے کہ آپ کے فیضِ ولایت سے سارا عالم فیضیاب ہو۔ یہ قیام خانوادۂ
الیاسیہ، علومِ الٰہیہ کی تبلیغ مقتضائے وقت کے مطابق ہے۔ الحمد للہ کہ اس کے آثار مختلف
اعتبارات سے نمایاں ہو رہے ہیں۔"

ایک صاحب نے خواب دیکھا اور حضرت برقی صاحب قبلہ سے بیان کیا۔ اکابر اولیاء اللہ کا ایک
مجمع ہے۔ ایک بزرگ نے فرمایا برقی صاحب کو خاص خاص آیاتِ قرآنی اور اورادِ قرآنی عطا ہو
چکے ہیں اپنی صوابدید سے تقسیم کر دیں گے۔
کسی نے سوال کیا برقی صاحب کے سلسلے کا کیا نام ہو گا۔ جواب ملا۔ یوں تو یہ سلسلہ قادریہ
چشتی رہے گا۔ لیکن سلسلۂ الیاسین شمار ہو گا۔ جماعت کے مقتضا کا طریق۔ سَلَامٌ
عَلٰٓی اِلْ یَاسِیْنَ کا وظیفہ ہو گا (یعنی الیاسین پر سلام ہو)۔ والسلام۔